A sum of 5 Paise on general books and 25 P. on text-books per day, shall be charged for books not returned on the date last stamped.

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ مطابق جنوری ۱۹۴۱ء نمبر ۱

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

انگریزی عہد سے پہلے ہندوستان کا تعلیمی نظام دین و دنیا کی تفریق سے ناآشنا تھا حکومت و ریاست کی کرسیاں ہوں خواہ علم و ارشاد کی مسندیں سب ایک ہی قسم کی درسگاہوں کے فضلاء سے معمور تھیں لیکن مغربی نظام نے زندگی کے تمام شعبوں کی طرح تعلیم کے سانچے بھی بدل دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی طرح یہاں بھی دین و دنیا کی تفریق شروع ہوگئی دینی تعلیم کے الگ مدرسے بنے اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکولوں اور کالجوں کا نیا سلسلہ قائم ہوا اس صورت حال نے مسلمانوں کی جمعیت کو سخت نقصان پہونچایا ان کی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا اور سارا نظام حیات درہم برہم ہوکر رہ گیا۔

تعلیم کی تبدیلی نے دلوں کے نقشے بدل دیئے، سید مرحوم کا قول کہ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے اب مستقبل کا نہیں بلکہ حال کا واقعہ بن کر رہا دماغوں میں خیالات کے طوفان اٹھے ذہنوں میں کجی آئی دلوں نے الحاد کی خو اختیار کی اور دیکھتے دیکھتے زمین سے آسمان تک ساری فضا نئے رنگ میں رنگ گئی اب نہ کہیں اللہ کا نام تھا نہ رسول کا ذکر نہ دین کا تذکرہ اب خود مسلمانوں کے گھروں سے کفر و الحاد کی وہ موجیں نکل رہی تھیں کہ اہل ایمان کے سینے ان کے تیروں سے چھلنی اور دین کے قلعے ان کے حملوں سے پاش پاش تھے۔

حالات کی اس رفتار نے دردمند دلوں کو بےچین کر دیا جلسے ہوئے غور و فکر کی مجلسیں بیٹھیں حفظ و دفاع کے نئے نئے نقشے تیار ہوئے لیکن ہنوز صحیح راہِ عمل معدوم اور نشانِ منزل گم تھا کہ دفعۃً ایک طرف سے آواز آئی۔

اے کہ پرسی کہ دریں کارچہ تدبیر شود　　　دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود

نگاہیں اٹھ گئیں بات دلوں میں اتر گئی اور خدمت دین و ملت کا ایک نیا میدان تیار ہوگیا۔

ندوہ کے کارکنوں نے دین و دنیا کی باہم آمیزش کا جو خواب دیکھا تھا زمانہ کے حالات نے جلد ہی اس کی صداقت روز روشن کی طرح عیاں کردی اور وہ آواز جس کے متعلق خیال تھا کہ کہیں صدا بصحرا ثابت ہو کر رفتہ رفتہ دنوں میں گم کر دی گئی، وہ چند برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ اس کی صدائے بازگشت سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا خود ہندوستان میں اب یہ خیالات عام ہو گئے ہیں کہ تعلیمی نظام میں انقلاب کی ایک غیر معمولی حاجت مانی جا رہی ہے ضرورت ہے کہ اس موقع پر پورے غور و فکر سے کام لیا جائے اور خوب سوچ سمجھ کر آئندہ قدم اٹھایا جائے تاکہ ماضی کی طرح مستقبل میں پھر پشیمانیوں سے دوچار نہ ہونا پڑے اس بارہ میں وقتاً فوقتاً ہم اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں الندوہ کی گذشتہ اشاعتوں میں "اسلام کے نظم" اور "عربی مدارس" کے عنوان سے ایک طویل سلسلہ مضامین بھی شائع ہو چکا ہے اس بارہ میں ہم ملک کے دوسرے مفکرین کو بھی اظہار خیال کی دعوت دے رہے ہیں تاکہ مسئلہ کے تمام پہلو واضح ہو جائیں اور رائج شدہ نظام تعلیم کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہ رہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ملک کے اسلامی حلقے ان کے اصلاحی کارناموں سے بخوبی واقف ہیں پچھلے کئی برسوں سے غیر اسلامی خیالات کی تردید اور فکر اسلامی کی اشاعت و ترویج میں وہ بڑے جوش و انہماک سے مشغول ہیں ہمیں مسرت ہے کہ اب انھوں نے تعلیمی اصلاح کی جانب بھی توجہ فرمائی ہے ۵ رجنوری کو صاحب موصوف نے ہماری درخواست پر "نیا نظام تعلیم" کے عنوان سے دارالعلوم ندوہ کی عمارت میں ایک پرمغز اور پراثر مقالہ پڑھا

قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے

از ابوالحسن علی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے دوسرے سال سے چھٹے سال تک متن قرآن کی تشریح و تفسیر نصاب میں داخل ہے اس سال درجہ ششم میں مضامین و مقاصد قرآن مجید پر خطبات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسوقت تک تین مضامین "قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے" "قرآن سے استفادہ کے شرائط اور موانع" "قرآن کا مرکزی مضمون" ہو چکے ہیں اور چوتھا مضمون "اعجاز القرآن" جاری ہے۔ ان مضامین میں کوشش کی جاتی ہے کہ وہ کلیات و مہمات مرتب طریقہ پر طلبہ کی نظر کے سامنے آجائیں جو تعلیمات و مقاصد قرآن کے فہم کے لئے ایک تمہید و مقدمہ کا کام دیسکتے ہیں اور وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہوں ان میں سے بعض مضامین وقتاً فوقتاً "الندوہ" میں بھی شائع ہوتے رہیں گے۔ اس اشاعت میں اس سلسلہ کا پہلا مضمون پیش کیا جاتا ہے

قرآن نے اپنے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے قرآن کی مختلف خصوصیات اور حیثیتوں پر بڑی روشنی پڑتی ہے اور اس کے عظمت و اعجاز کے بہت سے گوشے جو عموماً نظر کے سامنے نہیں ہوتے نظر کے سامنے آجاتے ہیں، ان مختلف اور منتشر آیتوں کو جمع کرنے اور ان پر غور کرنے سے جنیں قرآن نے خود اپنا تعارف کرایا ہے قرآن کی معرفت کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔ اس موضوع پر ذیل میں مختلف آیتیں ضروری تشریح کے ساتھ ذکر کیجاتی ہیں۔

۱۔ قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے۔

قرآن کی سب سے بڑی اور معجزانہ اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (البقرہ ع ۱) اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔

وتفصيل الكتاب لا ريب فيه من رب العالمين (یونس ع ۴) اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو جو تم پر لکھی گئیں جسمیں کوئی شبہ نہیں پروردگار عالم کی طرف سے۔

وانہ لکتٰب عزیز لایاتیہ الباطل من بین یدیہ اور وہ کتاب ہے نادر اس میں جھوٹ کا دخل نہیں آگے سے

ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (حم ا عدد ۶) اور نہ پیچھے سے اتاری ہوئی ہے حکمت والے سزاوار حمد کیطرف سے

قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی الہامی کتاب قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتی ہے، اس لئے کہ قرآن کا سرچشمہ اور ماخذ "علم الٰہی" ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ "وحی الٰہی" ہے۔ یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان، شک و اشتباہ ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی اور قطعی ہے، مشاہد اور مرئی ہے یکساں اور آخری ہے، اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے اس کا علم اسکی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے۔

هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر

شيئ عليم (الحديد ع ۱) اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

اس کا علم پورے طور پر حاوی اور محیط ہے۔

انما الٰهكم الله الذي لا اله الا هو وسع تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں

كل شيئ علماه (طہ ع ۵) سب چیز سما گئی اس کے علم میں۔

واحاط بما لديهم واحصى كل شيئ عددا اور قابو میں رکھا ہے جو اس کے پاس ہے اور گن لی ہے

(الجن ع ۲) ہر چیز کی گنتی۔

اس کے یہاں غلطی اور نسیان کا گزر نہیں۔

قال علمها عند ربي في كتاب لا يضل ربي کہا انکی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہوئی ہے نہ بہکتا

ولا ينسى (طہ ع ۲) ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

اسکو غیر محسوس اور غیر مادی چیزوں کا بھی علم ہے اور اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں۔

عالم الغيب لا يعزب عنه مثقال ذرة اس رب کی قسم جو چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے اس سے

فی السموات ولا فی الارض ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین ۰ (سبا ع ۱)

غائب نہیں ہوسکتا کچھ ذرہ بھر آسمانوں میں نہ زمین میں اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور۔ اس سے بڑی جو نہیں ہے کھلی کتاب میں۔

خدا کی کتاب خدا کے علم سے ماخوذ ہے اس لئے وہ اسکی خصوصیات کی حامل اور اس کا مظہر ہے۔

فان لم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الٰہ الا ھو فھل انتم مسلمون ۰ (ہود ع ۲)

پھر اگر وہ تمہارا کہنا نہ مانیں تو جان لو کہ قرآن تو اترا ہے اللہ کے علم سے اور یہ کہ کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا پھر کیا تم اب حکم مانتے ہو۔

ولقد جئنٰھم بکتاب فصلنٰہ علی علم ھدی ورحمۃ لقوم یومنون ۰ (اعراف ع ۶)

ہم نے انلوگوں کے پاس پہونچا دی ہے کتاب جسکو ہم نے مفصل بیان کیا ہے علم کے ساتھ راہ دکھانے والی اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔

اس لئے اس کتاب میں (چونکہ وہ اللہ کے علم سے ماخوذ ہے) تعارض و اختلاف نہیں ہے کیونکہ تعارض و اختلاف جہل و نا واقفیت یا علم کی کمی بیشی، یا اسکی تدریجی ترقی، یا ظن و قیاس۔ یا نسیان و غفلت یا کذب و افترا کی وجہ سے ہوتا ہے اور وہ ان تمام نقائص سے پاک ہے اس لئے اس کا کلام بھی ہر قسم کے تعارض و اختلاف سے محفوظ ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (النساء ع ۱۱)

کیا قرآن میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اگر خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں انکو بہت اختلاف ملتا

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی علم و اطلاع کا منبع اصلی تو پورے طور پر صاف اور محفوظ ہو، لیکن کسی شخص کے لئے اس کا ذریعہ اطلاع پورے طور پر قابل وثوق نہو اسنے اصلی سرچشمہ سے کوئی چیز صحیح اور محفوظ روانہ ہوئی ہو

لیکن اپنے منتہا تک پہونچتے پہونچتے وہ محفوظ نہ رہ سکتی ہو۔ قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ آنحضرتؐ کے لئے اس کا ذریعہ علم صرف وحی ہے اور وہ پورے طور پر محفوظ اور مامون ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی مداخلت کا امکان نہیں

وانہ لتنزیل رب العالمین ٥ نزل بہ الروح	اور یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا، اسکو لیکر اترا ہے
الامین علی قلبک لتکون من المنذرین ٥	فرشتہ معتبر تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا عربی
بلسان عربی مبین ٥ (شعرا ع ۱۱)	زبان میں

بلسان عربی مبین کی صفت بتاتی ہے کہ اس پیغام کے الفاظ بھی اتارنے ہی والے کے ہیں اس لئے کہ زبان کا تصور الفاظ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔[1] از افادات مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ (معارف نومبر ۱۹۴۰ء)

وما ینطق عن الھوی ٥ ان ھو الا وحی	اور وہ نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے وہ محض وحی
یوحی ٥ (النجم ع ۱)	ہے جو بھیجی جاتی ہے۔
قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق	تو کہہ اسکو اتارا ہے پاک فرشتہ نے تیرے رب کی طرف
لیثبت الذین امنوا وھدی وبشری	سے بلاشبہ تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت
للمسلمین ٥ (النحل ع ۱۴)	اور خوشخبری مسلمانوں کے لئے،
انہ لقول رسول کریم ٥ ذی قوۃ عند	یقیناً یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا قوت والا
ذی العرش مکین ٥ مطاع ثم امین ٥	عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا سب کا مانا ہوا
(التکویر ع ۱)	وہاں کا معتبر ہے۔[1]

اب اس کے مقابلہ میں انسانی علم کو لیجئے، اس کا سرچشمہ یقینی طور پر محفوظ اور بے عیب نہیں۔ اس کا ماخذ اور اسکی بنیاد اکثر ظن و قیاس ہے۔ اس کے ذرایع علم بھی نہایت محدود ہونے کے باوجود کبھی اتنے قوی نہیں جتنے پیغمبر کے ذرایع علم۔ اس کے پاس علم کے لئے سب سے بہتر ذرایع اس کے حواس خمسہ ہیں۔ جو علم ان کے ذریعہ سے

---

[1] صحیح تفسیر کے مطابق اس سے حضرت جبرئیل مراد ہیں۔

حاصل ہوتا ہے۔ وہ بدیہی ہے۔ عقلیات میں بھی اسکے علم کی بنیاد در اصل محسوسات ہی ہیں۔ انھیں علوم و ادراکات کو انسان مقدمہ بنا کر ایسا نتیجہ نکالتا ہے جو اسکو حواس کے ذریعہ پہلے سے معلوم نہیں تھا لیکن حواس کا بھی یہ حال ہے کہ وہ کبھی ناقص ہوتے ہیں کبھی خطا کرتے ہیں عقل کا یہ حال ہے کہ اس کے مدارج میں بے انتہا تفاوت ہے۔ پھر اس سب کے بعد بھی انسان کا علم اپنے محدود دائرہ میں بھی پورے طور پر حاوی اور کامل نہیں۔ اور محسوسات کو بھی ایک وقت میں محیط نہیں۔ عالم مادیات کے کتنے مسائل ہیں جو ابھی تک حل نہیں ہوئے اور اختلاف رائے کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ پھر اس کے علم میں تدریج اور اس کے معلومات میں ترقی ہے اور اس ترقی کی حد کبھی بھی متعین نہیں حد کا تعین اس کے نقصان علم کا اعلان اور حد کا عدم تعین اس کے علم کے مشتبہ اور غیر مکمل ہونے کی دلیل ہے۔ اور دونوں نقص اور شبہ سے خالی نہیں۔

یہ بھی سب عالم مادیات کا حال تھا جس کے ذرائع علم تھوڑے بہت انسان کو حاصل ہیں۔ مابعد الطبیعیات کی ایک پوری دنیا ہے جو مادیات کی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع ہے یہ پوری دنیا علم انسانی کے حدود سے باہر ہے[1] انسان کو خود اپنی حقیقت کا علم نہیں۔ اسکی ابتدا اور انتہا اس کے لئے نامعلوم ہے۔ اس عالم کا آغاز اور انجام اس کے لئے ایک راز ہے اور "عقل کو خود اپنی گرہ کی عقل نہیں"[2]

پھر خدا کی خوشی اور ناخوشی کا تفصیلی اور یقینی علم اور اس کے اوامر و احکام کی اطلاع اسکے بتائے بغیر محض ظن و قیاس اور سلامت فطرت سے نہیں ہو سکتی۔ خود ایک انسان دوسرے انسان کا دلی منشا اور اس کے احکام ہمیشہ کسی قیاس فراست یا سلامت فہم سے معلوم نہیں کر سکتا۔

اسی طرح قانون سازی، اور سیاسی اور اخلاقی نظام کی تشکیل میں وہ ہزاروں غلطیاں کریگا۔ ایک ماخذ نہونے کی وجہ سے مختلف نظاموں اور قوانین کا تصادم ہوگا۔ قانون قانون سے ٹکرائے گا۔ اور قومیں انکی خاطر قوموں سے برسر آزما ہونگی، مختلف خواہشات اور مصلحتیں ایک دوسرے سے متصادم ہونگی، علم کے قطعی اور آخری نہونے کی وجہ سے

---

[1] تفصیل ایمان بالغیب کی تشریح کے ضمن میں دوسرے مضمون میں آئیگی۔
[2] یہ جملہ "مذہب و عقلیات" سے ماخوذ ہے۔

یہ انسانی دستور و نظام تجربہ اور آزمائش کے ہزاروں مرحلوں سے گذریں گے اور دو ترجیح اور تقابل کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ انقلاب و اصلاح کی ہزاروں تحریکیں اٹھیں گی اور انسان کو کبھی اطمینان و سکون حاصل ہو گا۔

ان تمام خرابیوں کا سرچشمہ انسان کا علم ہے جو ناقص اور ظنی ہے اور پھر اس کا اعتماد ہے جو اس کا ظلم و طغیان ہے

وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً (بنی اسرائیل ع ۱۰)	تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا
وما یتبع اکثرھم الا ظناً ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ان اللہ علیم بما یفعلون (یونس ع ۴)	اور وہ اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر سو اٹکل کام نہیں دیتی حق بات میں کچھ بھی۔ اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں
و یتبعون الا الظن و ان الظن لا یغنی من الحق شیئا (النجم ع ۲)	وہ محض اٹکل پر چلتے ہیں اور اٹکل کچھ کام نہیں آتی ٹھیک بات میں۔

۲۔ قرآن محکم اور مفصل ہے۔

یعنی دین کے اصول و کلیات میں اور اس علم میں جو انسان کی نجات اخروی و فلاح دنیوی کے لئے ضروری ہے وہ نہایت واضح و متعین اور غیر محتمل و مفصل ہے[۱]

افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا (انعام ع ۱۴)	کیا خدا کے سوا میں کوئی حکم تلاش کروں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کی۔

---

[۱] دین کے علاوہ اور دوسرے علوم و صناعات قرآن کے موضوع سے خارج ہیں ضمناً ان میں سے کوئی چیز آ سکتی ہے لیکن انکی معلومات و تفصیلات کا ذکر قرآن کا مقصد نہیں۔

ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین اور اس کے ہم معنی آیتوں سے لوح محفوظ اور علم الٰہی مراد ہے۔

اصول و کلیات کے علاوہ دین کی جزئیات کا احاطہ بھی قرآن نے نہیں کیا۔ اس کے منصوص فرائض و احکام کی عملی تشریح اور تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کی گئی ہے جو وحی کے صرف نامہ بر نہ تھے۔ بلکہ شارح بھی تھے وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ہم نے تیری (اے پیغمبر) قرآن نازل کیا تاکہ تم تشریح کر دو لوگوں کے لئے اسکی جو انکی طرف بھیجا گیا ہے۔

ولقد جئنٰھم بکتاب فصلناہ علیٰ علم
ھدی ورحمۃ لقوم یومنون۔
(اعراف ع ۶)

ہم نے انلوگوں کے پاس پہونچادی ہے کتاب جسکو ہم نے
مفصل بیان کیاہے علم کے ساتھ. راہ دکھانے والی اور
رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔

الر کتاب احکمت ایتہٗ ثم فصلت من لدن
حکیم خبیر۔ (ہود ع ۱)

یہ کتاب ہے جس کی باتیں پختہ ہیں اور مفصل ہیں ایک
حکمت والے خبردار کے پاس سے۔

وماکان ھذا القرآن ان یفتریٰ من دون اللہ
ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب
لاریب فیہ من رب العالمین ہ (یونس ع ۴)

اور وہ نہیں یہ قرآن کہ کوئی بنالے اللہ کے سوا لیکن تصدیق
کرتا ہے اگلے کلام کی اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو جو تمہیر
لکھی گئیں جسمیں کوئی شبہ نہیں پروردگار عالم کی طرف سے

لیکن اسلام میں دین کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو بہت سے اہل مذاہب نے اپنے مذہب کا قائم کرلیا ہے. یہاں انسان کے متعلق اصولی تخیل یہ ہے کہ وہ "عبد" (خدا کا بندہ ہے) اور وہ اپنی زندگی کے کسی شعبہ اور گوشہ میں بھی اس دائمی غلامی سے آزاد نہیں ہے ۔اس کا ہر کام یہانتک کہ اسکی بادشاہی (جو بظاہر غلامی کے منافی معلوم ہوتی ہے) اسکی عبدیت ہی کا ایک مظہر ہے ۔ اس تخیل کے مطابق مذہب وسیاست کی تفریق کی بحث یہاں پیدا ہی نہیں ہوتی ہے اس "عبد" کو اس کے "مولیٰ" کی طرف سے قرآن کی صورت میں ۔ ایک کلی اور اصولی مکمل دستورالعمل دیدیا گیا ہے اس دستورالعمل کی ہدایت میں "عبدیت" کی پوری زندگی کامیابی کے ساتھ گذاری جاسکتی ہے اور اس کتاب کو کسی سیاسی ضمیمہ کی ضرورت نہیں۔

۳۔ قرآن "فرقان" (فارق اور ممیز) ہے اور یہ اسکی ایسی امتیازی صفت ہے جو اس کے نام کے قائم مقام ہوگئی ہے

تبارک الذی نزّل الفرقان علیٰ عبدہ
لیکون للعالمین نذیرا (الفرقان ع ۱)

بڑی برکت والی ذات ہے وہ جس نے اتاری فیصلہ کی
کتاب اپنے بندہ پر تاکہ رہے جہان والوں کیلئے ڈرانے والا۔

قرآن مجید نے ہدایت وگمراہی میں ۔ ایمان وکفر میں خدا کی رضا وعدم رضا میں یقین وظن میں حلال وحرام میں

قیامت تک کے لئے جو فصل و امتیاز پیدا کر دیا ہے اسکی نظیر سے مذہبی تعلیمات اور آسمانی صحیفوں کی تاریخ خالی ہے مثال کے طور پر توحید و شرک میں اس نے جو عظیم الشان تفریق پیدا کر دی ہے اور اس بارہ میں ادنیٰ احتمال اور ضعیف سے ضعیف اشتباہ کو اس نے جس طرح دور کیا وہ اس کا اعجاز ہے[1]

قد تبین الرشد من الغی (البقرہ ع ۳۴)	بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔
لیمیز اللہ الخبیث من الطیب (انفال ع ۴)	تاکہ اللہ پاک و ناپاک کو علیحدہ علیحدہ کر دے۔
لیھلک من ھلک عن بینۃ و یحیی من حی عن بینۃ۔ (انفال ع ۵)	تاکہ مرے جس کو مرنا ہو حجت تمام ہو جانے کے بعد اور جئے جس کو جینا ہو حجت قائم ہو جانے کے بعد۔

۴ قرآن کتب سابقہ کا مصدق اور مھیمن (نگران) ہے۔

اس موقع پر تین باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔

(۱) دین کے اصول و کلیات تمام کتب سماوی اور آسمانی تعلیمات میں مشترک اور متفق علیہ ہیں جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

(۲) قرآن سے پہلے تمام آسمانی صحیفے اپنے اپنے وقت کے لئے آئے تھے اور ایک خاص وقت تک محفوظ رہے انمیں سے دائمی صحیفہ کوئی نہ تھا۔

(۳) قرآن آخری اور دائمی صحیفہ ہے تمام اصول دین پر حاوی ہے قیامت تک محفوظ رہے گا۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (الحجر ع ۱)	بیشک ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم اسکی حفاظت کرنیوالے ہیں

ان چیزوں کے تسلیم کرنے کے بعد یہ دعویٰ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور انکی اصلی تعلیمات کا محافظ و نگراں ہے اور ان تعلیمات کی صحت و ثبوت کے لئے اسکی حیثیت سند اور معیار کی ہے ان کتابوں کا جو حصہ قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح اور محفوظ ہے اور جو اصولاً اس سے مختلف یا متعارض ہے وہ محرف اور غیر محفوظ ہے

---

[1] اسکی تفصیل عقائد القرآن کے باب میں توحید کے ضمن میں آئیگی۔

ایسی آیات جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ صحف سابقہ کا مصدق ہے قرآن میں بہت ہیں۔ ذیل کی آیت میں اسکا مصدق اور مہیمن ہونا دونوں ذکر کیا گیا ہے۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب ومہیمنا علیہ (المائدہ ع ۷) — اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی اور انکے مضامین پر نگہبان۔

۵۔ قرآن سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور تاریکیوں سے روشنی کیطرف لاتا ہے۔

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یہدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجہم من الظلمات الی النور باذنہ ویہدیہم الی صراط مستقیم (المائدہ ع ۳) — بیشک تمھارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی جس سے اللہ دکھاتا ہے اسکو جو تابع ہوا اسکی رضا کا سلامتی کی راہیں اور انکو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی میں اپنے حکم سے اور انکو چلاتا ہے سیدھی راہ۔

الر کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربہم الی صراط العزیز الحمید ۝ اللہ الذی لہ ما فی السموات والارض — آلر یہ کتاب ہے جسکو ہم نے تیرے طرف اتارا تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ، انکے رب کے حکم سے راستہ پر اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے جس کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں۔

ھو الذی ینزل علی عبدہ ایات بینات لیخرجکم من الظلمات الی النور وان اللہ بکم لرءوف رحیم (الحدید ع ۱) — وہ ہی ہے جو اتارتا ہے اپنے بندے پر آیتیں صاف کہ نکال لائے تم کو اندھیروں سے اجالوں میں اور اللہ تم پر نرمی کرنے والا ہے مہربان۔

قرآن مجید زندگی اور اس کے تمام شعبوں میں۔ جو ہموار و مستقیم اور تمام بے اعتدالیوں سے پاک و بے خطر راہیں کھولتا ہے انکے لئے "سبل السلام" (سلامتی کے راستے) سے بہتر تعبیر ہو ہی نہیں سکتی اور یہ انھیں جملوں میں ہے جنکی تشریح انکے الفاظ سے زیادہ ممکن نہیں یہ سب (سبل) درحقیقت ایک ہی شاہراہ کی (صراط) گلیاں ہیں جنکی طرف پیغمبر اشارہ کرکے کہتا ہے۔

وان هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله (انعام ع ۱۹) — اور یہ کہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے، اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر (نہ چلو) وہ تم کو جدا کر دیں گے اس کے راستے سے۔

اس موقع پر قرآن کی بلاغت کا یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ راستے تاریکی کے لئے واحد کے بجائے جمع کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے کہ حقیقت میں اگر وحی کی روشنی نہ ہو تو پھر زندگی کی ظلمتوں کا کوئی حد و حساب نہیں ہے اور انسانی زندگی کے راستے کی ہر گلی اور ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ صحیح مذہب کی روشنی کو علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو اس دنیا میں "ظلمت" کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ اور یہ ایک ظلمت نہیں بلکہ بے شمار ظلمتیں ہیں۔ زندگی کا جائزہ لیجئے۔ خدا رسی کی تمام راہیں گم۔ مذہب تمام تر رسم پرستی اور تقلید، اعتقادات تمامتر ضلالت و جہالت، خیالات تمامتر اوہام اور مفروضات، علوم تمامتر قیاس و ظن، معاشرت و معاملات تمامتر بے اعتدالی و ناانصافی، قانون و سیاست تمامتر آزمائش و تجربہ، حکومت تمامتر جبر و تعدی

ظلمات بعضها فوق بعض اذا اخرج يده لم يكد يراها (النور ع ۵) — اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو اس کو خود نہ سوجھے۔

زندگی کے اس "بحر ظلمات" میں روشنی کا مینار صرف خدا کا نور ہے جس سے زمین و آسمان روشن ہیں۔

الله نور السموات والارض (نور ع ۵) — اللہ روشنی ہے آسمان و زمین کی۔

اسی لئے "ظلمات" کے مقابلہ میں اس کو واحد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جب اس سرچشمہ سے نور کا افاضہ ہی نہ ہو تو روشنی کہاں سے آئے۔

ومن لم يجعل الله له نورا فما له من نور (نور ع ۵) — اور جسکو اللہ نے روشنی نہیں دی اسکے واسطے کہیں روشنی نہیں

جو لوگ قرآن اور پیغمبر کی مشعل افروزی سے تاریکیوں کی اس دنیا اور گمراہیوں کی اس بھول بھلیاں سے نکل کر دنیا کی روشنی میں آجاتے ہیں۔ انکو از سر نو زندگی ملتی ہے نابینا کو زندگی کا کیا لطف؟ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انکو آنکھیں مل گئیں اس زندگی اور اس زندگی کے بعد کی تمام راہیں انکے لئے روشن ہو جاتی ہیں اور راہ کو سبل السلام اور صراط مستقیم کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ زندگی کے سفر میں ان کا ہر قدم خدا کی روشنی میں اٹھتا ہے اور جب تک وہ خدا کی اس رہنمائی میں رہتے ہیں اُن سے

کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔

ان دونوں حالتوں، اور دونوں زمانوں میں جو عظیم الشان فرق ہے۔ اس کو اس سے بہتر طریقہ پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔

او من کان میتا فاحیینٰہ وجعلنا لہ نورا	بھلا ایسا شخص جو کہ مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور
یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمت	ہم نے دی اس کو روشنی کہ لئے پھرتا ہے اس کو لوگوں میں برابر
لیس بخارج منھا۔	ہوسکتا ہے اسکے کہ جس کا حال یہ ہو کہ پڑا ہے اندھیروں میں
(انعام ع ۱۰)	واں سے نکل نہیں سکتا۔

قرآن کے اتباع پر خدا ایسی ہی روشنی کا وعدہ فرماتا ہے۔

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وامنوا	اے ایمان والو، تم ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول
برسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ ویجعل	پر دیگا تم کو دو حصے اپنی رحمت سے اور رکھدیگا تم میں روشنی
لکم نورا تمشون بہ ویغفر لکم (حدید ع ۴)	جس کو لئے پھرو اور تم کو معاف کر دے گا۔

"یمشی بہ فی الناس" اور "تمشون بہ" کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کہ یہ روشنی آخرت سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی زندگی اور اس کے تمام معاملات میں انکو ایک خاص نور بصیرت حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات وحی الٰہی کی روشنی اور پیغمبر کی رہنمائی میں طے کرتے ہیں انکا پورا نظام زندگی دوسری غیر مومن قوموں کے نظام سے ممتاز ہوتا ہے اور انکا یہی وہ امتیاز ہے جسکی طرف اللہ نے دوسری آیت میں اشارہ کیا ہے۔

یاایھا الذین امنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم	ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو اللہ سے تو اللہ تم کو ایک خاص
فرقانا۔ (انفال ع ۴)	امتیاز بخشیگا۔

اسی بنا پر قرآن کو اللہ نے "نور" "بصائر" "ہدیٰ" "بینہ" "موعظہ" "شفاء" اور "ذکر مبارک" کہا ہے۔

۶۔ قرآن مجید وہ آئینہ ہے جس میں مختلف عقائد و خیالات اور اخلاق و اعمال کے لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اسمیں

سراحۃ کہیں اشارۃ کہیں پچھلی قوموں اور اشخاص کے ذکر میں اور کہیں براہِ راست انکا تذکرہ موجود ہے۔

انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم افلا	ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی جس میں تمہارا
لون ہ (انبیاء ع ۱)	تذکرہ ہے کیا تم نہیں سمجھتے ہو۔
انزلنا الیکم آیت بینات و مثلا	اور ہم نے اتاریں تمہاری طرف آیتیں کھلی ہوئی اور کچھ
الذین خلوا من قبلکم وموعظۃ	حال ان کا جو ہو چکے تم سے پہلے اور نصیحت ڈرنے والوں کو
قین (نور ع ۴)	
ضربنا للناس فی ھذا القرآن من	اور ہم نے بیان کی لوگوں کے واسطے اس قرآن میں سب چیز
ثل لعلہم یتذکرون (زمر ع ۳)	کی مثل تاکہ وہ دھیان کریں۔
کان فی قصصہم عبرۃ لاولی ا	البتہ انکے احوال سے اپنا حال قیاس کرتا ہے
باب (یوسف ع ۱۲)	عقل والوں کو۔

قرآن مجید کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے انھیں قوموں اور اشخاص کو ذکر کے لئے منتخب کیا ہے جو اپنے
ص اعمال و اخلاق کی وجہ سے غیر فانی ہیں جرائم میں بھی ان نادر الوقوع جرائم کا تذکرہ نہیں کیا گیا جو صدیوں میں
پنی کاوت اور مجرمانہ ہنرمندی سے ایجاد کرتا ہے اس نے انھیں افعال و جرائم کا ذکر کیا ہے جو کثیر الوقوع
عامۃ الوقوع ہیں۔

قرآن مجید ایک زندہ جاوید کتاب ہے جس میں حال و ماضی قدیم و جدید کی کوئی تقسیم نہیں، اس کا خطاب
ن اور ہر دور کے لئے یکساں ہے، اور اسکی دعوت ہر دم تازہ اور حسب حال ہے۔ وہ انسانوں کا ایک مکمل
اور انسانی فطرت کا ایک آئینہ مصفا ہے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبدالباری صاحب ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

ہم نے اس سلسلہ میں اپنے مخدوم محترم مولانا عبدالباری صاحب ندوی کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی مولانا نے ہمارے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ ان کے عنایت نامہ سے نقل کیا جاتا ہے

"مدیر"

کچھ طبیعت کی افتاد اور کچھ قلت استعداد سے اولاً تو کتابیں کم کیا اتنی کم پڑھی ہیں۔ کہ آپ یقین فرمائیں تو نہ پڑھنے کے برابر ہیں۔ ان میں بھی کسی "مردہ کتاب" کا کم از کم شعور کے کسی گوشہ میں اتنا ابھار کوئی نقش نہیں نظر آتا جو لائق ذکر ہو۔ البتہ ذہنی زندگی کے قریب قریب ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی زندہ انسان ضرور کھڑا نظر آیا۔

حافظہ کی زیادہ تلاشی لینے سے صرف ایک چھوٹی سی کتاب یاد آئی۔ جو کوئی چوتھائی صدی قبل پڑھی تھی برکلے کی "پرنسپلس آف ہیومن نالج" جس کا نام لینا بھی غالباً آپ پسند نہ فرمائیں۔ اسی زمانہ میں مبادی علم انسانی کے نام سے اس کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کا اولیں اثر تو میری لاادریت کی توثیق تھی۔ مگر پھر اسی نے حقیقت علم کے سوال کی طرف متوجہ کرکے حقیقی علم ویقین (ایمان) کا راستہ صاف کیا، بلکہ اور آگے چل کر اسی کتاب کے نظریات ودلائل نے علم ویقین کے اصل سرچشمہ (قرآن) کے بعض اہم حقائق دغوامض کی فہم ویافت میں مدد دی۔ بعد میں الحمدللہ کہ انکی خود اپنے بہت سے اکابر کے ہاں تصدیق پاکر مزید اطمینان قلب اور شرح صدر نصیب ہوا۔

اصل میں طالب حق کیلئے کلی اصول ایک ہی ہے۔ "الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" صدق طلب شرط ہے پھر مجاہدہ کی کوئی راہ بھی حق رسی کا بہانہ بن جاتی ہے "سُبل" کی جمع میں بھی اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر اگر کوئی گمراہی کے راستہ پر بھی پڑ گیا ہو، تو وہ کبھی اپنی ہی راہ سے "سبلنا" کی طرف مڑ جاتا یا موڑ لیا جاتا ہے مجھکو تو خود اپنے

اور ایسے ایک سے زائد حب میں اس کا مستاہدہ ہوا بلکہ صدق و خلوص کی بڑی قیمت ہے یا اس ہو تو پانی زکی گئی۔

آب [illegible] زندگی [illegible] [illegible] جو شد [illegible]

لیکن جھوٹی یاس استغاثہ ہلاکت ہے

یہ تو اصلی تھا حال ہے [illegible] سوا وں کی [illegible] موم ہوں [illegible] بھی

زندگی رہ گئی ہے۔ اسی زندہ کتاب اور اس کے زندہ (حی لایموت) مصنف کے آستانہ پر ختم ہو جائے

چونکہ یہ عریضہ آپ کے لئے ہے اس لئے اس عجیب اسے کہ بعض مجید تحریرات اس خیال سے [illegible]

عرض کر دینے کا حق چاہتا ہے کہ [illegible]

ابتدائی [illegible] بیان [illegible]

اس کے الفاظ لفظ اور [illegible] کلام [illegible] سب سے زیادہ [illegible] خوب بیان [illegible]

کیسطرح یہ بات تصور میں نہیں آتی کہ کوئی انسان بھی [illegible] دماغ [illegible] سامنے [illegible]

دو چار آیات بھی بول سکتا ہے جس طرح یہ کتاب ابتدا سے انتہا تک بے تکلف ایک ہی [illegible] بیان میں [illegible]

حد یہ کہ لفظی غیر لفظی کوئی ترجمہ جو [illegible] کتاب کا جب کسی دوسری زبان میں پڑھتا ہوں۔ تو [illegible]

ترجمہ کے اندر پھر انسان شریک ہو گیا۔ تفسیر وغیرہ کا ذکر ہی کیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ خود کسیطرح میرے

ہاتھ میں ایک کتاب دے دیتے اور فرماتے کہ یہ "یہی الہ [illegible]" جو کچھ ہے لفظ لفظ حرف حرف میرا کلام ہے۔ تو بھی میرا

تشکی اور احتمال آفریں ذہن اسکے کلام اللہ ہونے پر شاید ہی اتنا یقین کر سکتا جتنا اس عجیب و غریب اسلوب بیان

کی بنا پر حاصل ہے۔ مجھکو تو اس انداز کلام کا نام ہی بجز کلام اللہ کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔ کاش ایمان اور عدم ایمان دونوں سے اپنے ذہن کو ایک بار خالی کر کے۔ بلا ترجمہ و

تفسیر ممکن بے تعصبی کے ساتھ خود اس کتاب کا مطالعہ کچھ دن جاری رکھ سکیں۔ تو ان شاء اللہ انکی سب بحثیں اور اعتراضات

از خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ اگر آدمی اتنی عربی جانتا ہو کہ عربیت کے تحت صحیح معنے سمجھ لیتا ہو، تو پھر ایک ہی ترجمہ و تفسیر

کی ضرورت رہجاتی ہے، کہ انسانی فطرت اور انسانی زندگی کے تحت پیش آنے والے واقعات و تجربات، اور انکی مشکلات و مہمات میں اسکی تفسیر تلاش کرے، تو مومن تو مومن غیر مومن کو بھی یہ اذعان حاصل ہو کر رہے گا، کہ انسانیت جہاں کہیں اور جس حال میں بھی پائی جاتی ہو، اس کی سیدھی راہ وہی راہ ہے جس کی طرف یہ کتاب رہنمائی کرتی ہے۔

ان ربی علیٰ صراط مستقیم

غم و غصہ دونوں زیادہ مسلمانوں کے حال پر آتا ہے، جو اس زندہ کتاب پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں اور پھر زندگی کا راستہ دوسروں سے پوچھتے اور ادھر ادھر ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ انکو تو صرف اسکی ضرورت تھی، کہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں بس اسی کتاب کو بطور ایک زندہ کتاب کے استعمال کرتے۔

کہنے کی بات نہیں، لیکن آپ سے کہہ دینے کا جی چاہتا ہے، کہ میرا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ لغت اور زبان کے اعتبار سے معانی سمجھ لینے کے بعد، اگر کوئی واقعہ طلب شئے ہو، تو واقعہ کو سمجھ لینے کے بعد، جہاں اور جس مقدار میں اس کلام اللہ کے ساتھ تفسیر وغیرہ کی صورت میں کلام الناس کو شریک کیا۔ اسی قدر ہمیشہ نہیں لیکن زیادہ تر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، کہ جو روشنی ملی تھی اسکی جگہ پھر تاریکی چھانے لگی۔ بس "ماینطق عن الھویٰ" میں اپنا پایا پرایا جتنا ہوائی علم مل جاتا ہے، شاید اتنا ہی خالص وحی کے علم کا حجاب بنکر اس کے فیضان کو روک دیتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک، تو مفسر کے علم و تقویٰ کو معلوم کئے بغیر ہر تفسیر کو پڑھنے لگنا بہت خطرناک ہے۔ الا آنکہ کسی کا علم و تقویٰ خود کافی محافظ ہو۔ اور آج کل تو ہر شخص مفسر ہے، اور ہر اخبار و رسالہ اسکی تفسیر شایع کرنے کے لئے کھلا ہوا ہے۔

ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے، کہ لوگ پورا قرآن سمجھنے سمجھانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ یقیناً سارا قرآن ساری انسانیت کی ہدایت کیلئے ہے لیکن ہر انسان کیلئے سارا قرآن اسیطرح نہیں جسطرح کرۂ ارض کا سارا رزق ساری انسانیت کیلئے لیکن ہر انسان کیلئے نہیں۔ اگر ہر آدمی حلق تک ماکولات ارض جمیعاً کے تحت سارے آدمیوں کا کیا دو چار کا حصہ بھی ہوس میں آکر کھا جائے تو اکثر صورتوں میں بدہضمی و ہلاکت یقینی ہے

قسمت حق است روزی خوانے ہر یکے را بہر نے دیگر را نے

جس طرح ہر جسمانی غذا کا ہر مزاج و ماحول کے انسان کے لئے موافق آنا ضروری نہیں۔ وہی حال روحانی

خدا کا بھی ہے ، بلکہ ارواح کے الوان و اقتضاوات احسام سے بہت زیادہ کثیر و متفاوت معلوم ہوتے ہیں ایک شخص دوسرے کا حصہ کیسے پا سکتا ہے۔

ایک موٹی مثال عرض کرتا ہوں " ان من ازواجکم و اولادکم عدوالکم ۔۔۔ قرآن کی آخر کی آیات تک کا ترجمہ تو ہر شخص ہی سمجھ سکتا ہے لیکن جو شخص ازدواجی زندگی کے تجربات سے سرے سے نہیں گزرا یا جس کو " عدوالکم " سے سابقہ نہیں پڑا وہ " فاحذروھم " کے پرہیز یا " وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا " کے علاج کی کیا قدر جان سکتا ہے ، اسی طرح " انما اموالکم و اولادکم فتنۃ واللہ عندہ اجر عظیم الخ " کا تحقیقی فہم ، ہر شخص کو کیسے نصیب ہو سکتا ہے ، جو اس فتنہ اموال و اولاد میں پڑا ہی نہ ہو ۔ ذہانت یا دوسروں کے تجربات تفسیر بیان کر دینا اور بات ہے ، لیکن ذاتی تحقیق تو بہر حال ذاتی تجربہ ہی کا ثمرہ ہو سکتا ہے ۔ اس یافت و تحقیق کی قائمقامی ، نہ ذہانت کی کوئی مقدار کر سکتی ہے اور نہ معلومات کا کوئی وسیع سے وسیع سرمایہ ۔

ایک اور ذرا باریک مثال لیجئے ایک شخص کا دماغ خالق و مخلوق کے ربط کو سمجھنے کے لئے سالہا سال عقلی آوارگی میں گرفتار رہا ، فلسفہ اور مابعد الطبیعات کی راہوں کی خاک چھانتا پھرا ، اس کے بعد اسکو ہو الاول والآخر والظاہر والباطن وھو بکل شیء علیم " سے اگر کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اسکی پیاس بجھتی ہے ۔ اور " بکل شیء علیم " نے ایک اشارہ سے خالق کی اولیت و آخریت ، ظاہریت ، و باطنیت ، و مخلوقات کے ساتھ اسکے ربط و تعلق کی گرہ کھل جاتی ہے ۔ تو جس دماغ میں یہ سوال ہی نہیں ، اسکو جواب کیا ملے گا ۔ یا اسکی کیا قدر ہو گی ۔ کیا اسکی کوئی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک فلسفی دماغ کی ہدایت کے لئے قرآن میں کوئی راہ نہ ہو ،

حاصل معروضات یہ ہے کہ مسلم عقائد و اعمال کی جس مقدار کی تکلیف ہے ، اس حد تک تو سب کو تبلیغ و تفہیم ساری ہو ۔ کی بھی تکلیف ہے ۔ باقی قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مختلف الوان و احوال یا مختلف " سبل " اور راہوں کے لوگ اپنی اپنی خاص راہ سے اس زندہ کتاب کے ذریعہ اپنے زندہ رب سے اپنی زندگی کے سارے کاروبار میں زندہ اور شخصی ربط و تعلق پیدا کریں ۔ بغیر اس زندہ ایمان کے نہ جیسہ درب میں عبدیت و ربوبیت کا ربط قائم ہوتا ہے ۔ نہ ایمان کی حلاوت ملتی ہے ، نہ اس کے اعلیٰ ثمرات پیدا ہوتے ہیں ، واللہ اعلم بالحق والصواب ،

یاد ایام

از مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم اے انسپکٹر و رجسٹرار مدارس عربیہ الہ آباد

سُنے ہوں گے بہت قصے مگر وہ سب تھے افسانے

یہ میری آپ بیتی اور خود میری زبانی ہے

سب اس ادبی لکھنؤ کی روایت آج بھی کسی کے طاق پہ ہے مٹی ع ٹھ گئی کھنڈر سے کچھ آگ اور شان لکھنؤ میری عمر کتب بینی کے ابتدائی دور تک لکھنؤ میں گذری والدہ مرحومہ تیری زبان بولتی تھیں کیونکہ میرا ننھیالی خاندان مشہور ہے فرخ آباد میں نواب صاحب فرخ آباد کا متوسل رہا اس لئے میری زبان کاکوری کی قصباتی زبان پر نہیں پڑی لکھنؤ میں نصف صدی سے قصباتی خاندان میں ہمارے خاندان کو جو وقار حاصل تھا وہ ایک تاریخی واقعہ ہوگیا ہے۔ انکی ڈیاں پھولوں میں رہیں جناب منشی امتیاز علی صاحب مرحوم و مغفور ایک بڑی وکالت چھوڑ کر حسب الارشاد اویس زمانہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ بھوپال میں وزارت فرما رہے تھے اب انکے عم زاد بھائی جناب منشی اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دور دورہ تھا انکی للاہیت خلوص اور اخلاق و فیاضی، خدمت خلق اور قابلیت نے انکو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔ میں انھیں کی گود میں کھیلا انھیں کی نظر کے سامنے حاضر و غائب رہا۔ دل پر اثر تھا کہ وہ ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔ الحمد للہ یہ مرافقت اب بھی حاصل ہے بعض شرارتوں پر زنان خانے کا جانا دن دن بھر بند کر دیا جاتا اور کبھی تو کامنی کے ایک درخت سے آگے جو انکی کوٹھی میں انکی نشست گاہ کے سامنے والے صحن کی حد تھا جانا بھی روک دیا جاتا لیکن کبھی ایک دھپ بھی نہ لگی اکاکوری کی تقریب شادی غمی یا عرسوں میں جانا چند دنوں کے لئے ہوتا تو ہوتا ورنہ لکھنؤ ہی کی خوبو اور آب و ہوا میں بڑھا پلا اور وہی دل کو بھائی لکھنؤ کے ہر طبقہ کے لوگ ہمارے یہاں برابر آتے جاتے رہتے۔ اور پیارے صاحب رشید کا بھی اکثر آنا ہوتا۔ لکھنؤ کی زبان کا چسکا اسی وقت سے پڑا منشی صاحبؒ کے چھوٹے بیٹے

برادر عزیز حاجی انور علی اور مجھ میں سال دو سال کی بڑائی چھوٹائی تھی ساتھ کھیلتے اور ساتھ پڑھتے باہر جانے کے سوائے گھر میں کھیلتے تو ادنیٰ شرارت پر ایک سائیس بھی ٹوک دیتا اور کبھی کبھی ماں تک ہماری شکایت ہو جاتی مگر اسکی اس جرأت پر گھر میں کبھی کسی کے چشم و ابرو پر بل نہ آیا بلکہ کہا تو یہ کہا کہ خوب کیا اچھا کیا۔ لکھنؤ نواب واجد علی شاہ کے بعد تعلقداروں اور شاہزادوں و نواب زادوں کی بدولت، دولت کا امنا تھا تعلقداروں کی وجہ سے اس دولت کی نمائش بازاروں میں خوب ہوتی تھی۔ چونکہ والد صاحب علیہ الرحمۃ تعلقداران اودھ کے مشیر قانونی تھے اسلئے اس زمانے میں دن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی تعلقدار اپنے جاہ و حشم کے ساتھ ہمارے گھر بار رہتا تھا۔ اس چیز نے میری آنکھوں کے زنگار ہٹا دیئے اور پھر میں کبھی دولت کے رعب سے مرعوب نہ ہوا اور نہ خود میری زندگی میں کوئی ٹیم ٹام آئی۔

ندوۃ العلماء

یہ نام کب نہیں سنا تھا یاد نہیں آتا۔ ندوہ کا دوسرا سالانہ جلسہ منشی صاحبؒ کی دعوت پر لکھنؤ میں قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں ہوا۔ جہاں علاوہ قیصر باغ کے خود ہماری کوٹھی میں ٹھہرے تھے اس ضرورت سے زنانہ مکان خالی ہوا اور ہم سب پرانے مدرسہ کے قریب والے دوسرے زنانے مکان میں اٹھ گئے اتنا یاد ہے اور خوب یاد ہے تب کو وہاں سوئے صبح صبح جب کوٹھی آئے تو سلام کے بعد زنان خانے جا کر لگا یا کہ دیکھیں تو یہاں کیا ہے؟ وہاں دیکھتے ہیں تو لمبی لمبی ڈاڑھیاں اور عماموں والے کئی ایک بزرگ نظر آئے مگر ایک صاحب کی سادہ لمبی زلفوں اور بات چیت کی رعنائی نے ہم کو انکی طرف متوجہ کیا انھوں نے بھی بچے کی نظر پہچان کر ہم کو بلا کر اور شفقت سے اپنی گود میں بٹھا لیا اور پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ فوراً وہاں سے اٹھکر کسی خدمت گار سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں اس نے کہا شاہ سلیمان صاحب (سید سلیمان صاحب نہیں) خدا غریق رحمت کرے مولانا عبدالحیؒ صاحب فرنگی محلیؒ کے شاگرد تھے اور خاندان اور نسبت پھلواری شریف کی تھی اور ایسے دلکش واعظ تھے کہ نواب محسن الملک مرحوم کی گاڑی بھی اپنے فتوحات میں بغیر انکے نہیں چلتی تھی۔

دن کو ندوہ کا اجلاس شروع ہوا دوپہر کو اپنے والد منشی محسن علی صاحب مرحوم و مغفور کے ساتھ سفید بارہ دری میں گیا تو اسوقت بھی بلبل بہار چہک رہا تھا اور پہلی مرتبہ "توبرائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی" ایک پرکیف لَے کے ساتھ انکی زبان سے سُنا آمدی اور وصل کردن کے معنی معلوم تھے مگر فصل کردن بعد کو کسی سے پوچھکر سمجھا۔

تعلیم

ساتویں برس قرآن پاک ختم کیا۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کی تمنا تھی کہ حفظ کر لیتا کیونکہ انکے خاندان سے حفظ و قرأت کا سلسلہ جناب امیر علیہ السلام کے وقت سے منقطع نہ ہوا تھا میں کمزور تھا اس لئے بزرگوں کی رائے نہ ہوئی حافظہ بہت اچھا تھا اگر کر لیتا تو سعادت دارین حاصل ہوتی اور سنت آبائی بھی ادا ہو جاتی مگر قسمت میں نہ تھا! ختم قرآن کے ساتھ تختیاں اور گنتیاں بھی ختم کر لی تھیں۔ ہمارے استاد ہمیشہ کوئی نہ کوئی عالم جناب حاجی حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم کے مطب کے پڑھنے والے یا حضرت مولنا عین القضاۃ صاحب قدس سرہٗ کے یہاں کے دور کے شریک ہونے والے ہوتے کریما مقیماں آمدنامہ پڑھا گلزار دبستاں جب نصف پڑھ لی تو نام حق بامعنی ہونے لگی گلزار دبستاں ختم کر لی تو میزان منشعب ایک وقت اور دوسرے وقت گلستاں پھر نصف بوستاں حضرت مولانا محمد علی صاحب قدس سرہٗ بانی ندوۃ العلماء تشریف لائے امتحان لیا تو منشعب کے بعد علم الصیغہ جو انکے استاد اور ہمارے ایک بزرگ مفتی عنایت احمد صاحبؒ کی تصنیف تھی اور حضرت نے اس کو طبع کرایا تھا، شروع کرا دیا سب سے پہلے میں ہی نے شاید علم الصیغہ پڑھا پھر تو دارالعلوم ندوہ کی بدولت مقبول ہو گیا۔ اس دور میں ام الصبیان کی شکایت شروع ہو گئی۔ دماغی کام سے قدرے روکا گیا مگر اگلی تعلیم جاری رہی۔ بیماری کیا تھی خدا کی رحمت تھی "ا کے علاوہ بڑے بڑے اولیاء اللہ کی توجہات اور دعائیں ملیں جنکی برکت آج تک شامل حال ہے اللہ نے جلد صحت دی۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہماری ابتدائی تعلیم اگر بجائے علماء کے کسی منشی کے ہاتھوں ہوتی تو سیاق سباق اچھا ہوتا اور فارسی سے بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی مگر ہمارے اساتذہ یہ سمجھتے تھے کہ انکی قابلیت خوشخطی کی!

محتاج نہ تھی اور فارسی انکے دور مرتبہ تھی۔ اس زمانہ میں اردو کون پڑھتا تھا بلوغت تک وقت سے فارسی میں رقعہ لکھائے گئے جب پڑھنا آگیا تو ایک نیا دروازہ کھلا جو کتاب اردو کی ملتی اس کو پڑھ ڈالتا گھر میں منتخب اُردو کا کتب خانہ تھا خدا اس میں زیادہ تر تصوف کی کتابیں تھیں بزرگوں کے حالات شوق سے پڑھتا۔ اب خالی وقت کتابوں کے نذر ہو جاتا کھیل میں کھیل کبھی کنکوا یا گھوڑے کی سواری تھی۔

مدرسہ کا درس ختم ہوا تو عم محترم کی وکالت بھی کم ہونے لگی اب عماد صاحب کی صحبت تھی اور مذاق العارفین کا شب کو دور ہوتا تھا اور علماء سے بحث ہوتی جاتی تھی انکی ثقاہت ذہن کا کیا کہنا تقریر و بحث کے نصی پہلو کو چھوڑ کر ہمیشہ تفقہ میں انکا پلہ بھاری رہتا۔ اسی زمانے میں سنا تھا کہ امام غزالیؒ حدیث اور نقل حدیث میں کچے ہیں ایک کونے میں بیٹھکر حفظ دل لگتا سننا اور کبھی کبھی وہیں لیٹ کر سو بھی جاتا۔ وہ کانوں میں پڑی ہوئی باتیں بعد کو بہت کام آئیں۔ اس دور کے بعد مثنوی مولانا رومؒ کا دور شروع ہوا پہلے تو کسی قلمی مطلا نسخہ سے پڑھی جاتی مگر جناب مولنا احمد حسن صاحب کا محشی نسخہ آنے لگا تو وہ پڑھا جاتا اپنی شُد بد فارسی سے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ سرورق پر بہت قرآن در زبان پہلوی جو اس نسخہ میں چھپا تھا وہ یاد کرکے حضرت شاہ سلیمان صاحبؒ کی نقل اتارتا تھا مثنوی کے سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آگیا سُن لیجئے۔ ایک صاحب جو مراتب تصنیف میں قزاقی کے منصب پر فائز تھے مگر بڑے اچھے اور محبت کے بزرگ تھے۔ حضرت الاستاذ علامہ شبلیؒ کی صحبت میں سہ پہر کو بیٹھے تھے شرر صاحب بھی تھے نہ جانے مولوی ابوالکلام تھے یا نہیں۔ مگر مولوی عمادی اڈیٹر البیان ضرور تھے، فرمانے لگے مولنا آپ نے جتنے کام کئے خوب کئے مگر اس سائین کی سوانح عمری (یعنی سوانح مولنا روم) لکھکر اسکی تو عزت بڑھائی مگر اپنا وقت خراب کیا حاضرین بہت محظوظ ہوئے پھر تو لطائف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا حضرت الاستاذ کی علمی مذاکروں میں اکثر اس قسم کے لطائف نمک کا کام دیتے تھے اور ہمیشہ انکی صحبت باغ و بہار رہتی۔

دار العلوم کا قیام

ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس میں یہ بات طے پائی کہ اصلاح نصاب کے لئے ندوۃ العلماء کو اپنا ایک دار العلوم

نمونہ کا کھولنا چاہیے مگر دہلی کے تیسرے جلسہ میں مقام کے متعلق بڑے مباحثہ اور دہلی و لکھنؤ کی کشمکش سے نکل کر آخر لکھنؤ غالب رہا اور یہیں لکھنؤ میں گولہ گنج میں ایک تعلقدار کا مکان خرید کرکے دارالعلوم کی رسم افتتاح ادا ہوئی۔

ایجوکیشنل کانفرنس اور اسوقت کے نیچریوں نے بھی علماء کے جمود میں یہ ہیجان دیکھکر صدائے لبیک کہی اور کانفرنس میں رزولیوشن ندوہ کی تائید کا پاس ہوا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے، آخر مولوی تو تھے ہی، رگ مولویت جوش میں آگئی تو بڑی پرجوش تقریر کرڈالی مگر ہمارے سید محمود صاحب نے (بانکی پور والے نہیں) کہا تو یہ کہا

از صحن خانہ تا لب بام از آنِ من وز بام تا بعقد ثریا از آں ماست

افسوس علماء کی بیچیدہ زنی اور اسلام کی غلط ترجمانی نے یہ کہلوایا ورنہ اسلام تو دنیا میں دنیا کے لئے بھی دین کی تعلیم دیتا ہے۔

ندوہ والے لوگ تھے مگر مصلحت وقت کچھ اور تھی لہذا طے ہوا کہ ندوہ افتتاح ہوں ایک تو کسی بڑے مقدس بزرگ صاحب نسبت کے ہاتھ سے اور ایک شان دار جلسہ کرکے جس میں عمائدین کی شرکت بھی ہو اور کمشنر صاحب لکھنؤ کو بھی مدعو کیا جائے۔

ندوہ کا دفتر

ندوۃ العلماء صرف حضرت مولانا محمد علی صاحب قدس سرہ العزیز بانیٔ ندوہ کا تخیل تھا اور وہی پہلے ناظم تھے اس کا دفتر ان کے مستقر کانپور میں تھا عمارت جب خرید لی گئی تو دفتر بھی لکھنؤ منتقل ہو آیا۔ خود حضرت مولانا ناظم رہ اور استاذی مولانا سید عبد الحیؒ صاحب مددگار ناظم (طبیب لکھنؤ آکر بعد کو ہوئے) استاذی مولانا عبد اللطیف صاحب مفتی ندوہ (حال مدرس اول شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی) اور مرحوم منشی محمد علی دفتر سے عبارت تھے۔ ہاں ایک مہر بھی مصلح القوم ندوۃ العلماء قابل ذکر ہے۔

ہمارا دارالعلوم میں داخلہ

اس زمانہ میں عربی کی صرف و نحو کچھ مختصر ادب مگر نحو شرح جامی تک فارسی کے درسیات کیساتھ عام تعلیم

کے لئے پڑھانا ضروری تھا، چنانچہ جب ہم لوگ عربی پڑھتے تھے تو ہمارے خاندان والے بھی سمجھتے تھے کہ آگے چلکر انگریزی اپنے اور بھائیوں کیطرح پڑھیں گے مگر عم محترم رحمۃ اللہ علیہ کو جو شغف ندوہ کے ساتھ تھا اس سے انکا گوارا کیسے بچ سکتا تھا لھذا برادر عزیز انور اور میرا نام ندوہ کے رجسٹر داخلہ میں سب سے پہلے لکھا گیا۔

پہلا افتتاح

حضرت اقدس زمانہ قدس سرہٗ بقید حیات تھے انکے خلفا دین بڑے بڑے صاحب سلسلہ اور ارشاد بزرگ اور عالم موجود تھے مگر اشارہ ایک گوشہ نشین مجذوب سالک کی طرف ہوا جو صاحب دعا و تصرف تھے بڑی بات یہ کہ عاشق رسول تھے یعنی مرشدنا حضرت شاہ نجم الدین صاحب قدس سرہ العزیز فتحپوری ایک دس برس کا لڑکا علم الصیغہ لیکر انکے سامنے حاضر ہوتا ہے کچھ پڑھتا ہے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ جاتے ہیں اسکے پورے تیس برس کے بعد وہی لڑکا اس شیخ کامل میں فنا ہوکر دس برس گذارتا ہے یہ ندوہ کی پہلی تقریب افتتاح اور میرے لئے نسبت کی ابتدا تھی۔ (باقی)

ایک نام کے ندوی کا دوسرا پیام
ندوہ کی برادری کے نام

از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

"یہ خطبہ مولانا نے بحیثیت صدر طلبۂ قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۰ء میں ارشاد فرمایا تھا مُدیر"

آٹھ سال بعد یاروں کی طبیعت پھر لہرائی اور ایکی زندہ دلوں نے اس سے بھی بڑھکر دل لگی کی ٹھہرائی جو ندوی ہے محض نام کا اور جس کی ندویت نری اعزازی! اللہ اللہ! اس کے نصیب میں یہ سرافرازی! ۱۹۳۲ء میں تو پھر غنیمت تھا کہ صدارت محض استقبالیہ کی رہی، ۱۹۴۰ء میں تھوپ دی گئی صدارت اصل جلسہ کی! اسے ایک ناچیز کو اپنی ستم ظریفی کا ہدف بناتے اللہ کے ان نیک بندوں نے اتنا نہ سوچا کہ باہر کی دنیا ان کے اس "حسن انتخاب" پر کھل کھلا کر ہنس نہ پڑے تو آخر اور کیا کرے؟

بزرگو اور عزیزو، بڑے اور چھوٹے بھائیو!

آج آپ مدتوں کے بعد پھر وہیں اکٹھے ہوئے ہیں، جہاں آپکی عمر کے بہترین اور خوشگوار ترین حصے گزر چکے ہیں کسی کے صرف چند مہینے اور کسی کے سالہا سال۔ کوئی بچپن میں آیا ہوگا۔ اور جوان ہو کر نکلا ہوگا۔ کوئی مبتدی کی حیثیت سے داخل ہوا ہوگا۔ اور عالم و فاضل بن کر رخصت ہوا ہوگا۔ آج بے اختیار یاد آ رہے ہوں گے۔ وہ پرانے ہم نشیں اور انکی صحبتیں وہ زمانۂ معصومیت کے شوق اور نوجوانی کی ہمتیں! وہ بےفکری کی ہنسی اور چہچہے۔ وہ نوعمری کے عزم و ولولے! وہ طالب علمی کی راتیں اور راتوں میں بیداریاں، وہ آپس کی نوک جھونک اور پھر ہمدردیاں اور غمگساریاں! وہ یہاں کے صحن اور میدان کے کھیل کود، وہ یہاں کی مسجد کے رکوع و سجود! وہ امتحانات میں کامیابیاں اور کبھی ناکامیاں۔ وہ استادوں کی شفقتیں اور کبھی جھڑکیاں! دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر، عملی زندگی میں قدم رکھ کر، فکر معاش کے دلدل میں پھنس کر۔ اب قدر ہو رہی ہوگی یہاں کی آزادیوں کی بیفکریوں کی، خوشی وقتیوں کی! آہ! کیسی مٹھاس تھی اسوقت کی تلخیوں میں اور کتنی لذت تھی اُس سوز کی

بدمزگیوں رہیں یا — کاش وہ زمانہ پھر آتا! کاش بس میں ہوتا! پھیر لیں گئے ہوئے سن کا۔ گزرے ہوئے ان کا کاش پکڑ سکیں ہم، زمانہ کی گھڑی کی سوئی کو الٹا گھما دیتا!

یہ حسرتیں تو اب زندگی کے ساتھ ہیں لیکن برادران کرام! ماضی کیسا ہی خوشگوار، وہ آپکی یا کیسی ہی پرلطف سہی فکر کی چیز تو ماضی نہیں۔ حال و مستقبل ہے، اور اصل دولت خود شناسی کی دولت ہے

روزہا گر رفت گو رو پاک نیست
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

نہ ہو کہ جب یہ حال بھی ماضی بن جائے۔ اور آئندہ گزشتہ میں تبدیل ہو جائے۔ تو ہم آنسو بہائیں اسوقت کی فرصتوں اور بیسر کوئی کریں آج کی غفلتوں پر! ساری خرابیاں تو پیدا ہوتی ہیں اپنے کو بھلا دینے سے اپنے کو پہچان لیجئے، اپنے مقام کو جان لیجئے، عرفان نفس کا سبق حاصل کر لیجئے۔ تو ابھی ساری مشکلیں حل ہوئی جاتی ہیں

ندوہ یا دارالعلوم ندوہ نام در و دیوار کا نہیں، اینٹ و چونے کی عمارت کا نہیں دفتر نظامت کے کاغذات اور رجسٹروں کا نہیں۔ کتبخانہ یا اقامت خانہ کا نہیں۔ نام ہے چند مقاصد کا، ایک مخصوص و متعین پروگرام کا۔ ایک بلند نصب العین کا آپ اگر ندوی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے ندوہ کے اس پیام کو قبول کر لیا۔ اس آواز کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ ندویت کوئی مادی، ڈپلوما یا کاغذی سند نہیں۔ نام ہے اس نسبت کا۔ اس رشتہ کا۔ اس رابطۂ قلب کا۔ جو آپ نے مقاصد ندوہ کے ساتھ قائم کر لیا ہے۔ ندوی ہوتے ہی آپ کے جزو زندگی بن گئے، یہ مقاصد ندوہ، اور فرض ہو گیا۔ آپ کا ان مقاصد پر اعتقاد و عمل۔ انکی تبلیغ و ترویج۔ انکی نشر و اشاعت۔ اب آپ لوگوں سے ملیں گے ان کے لئے۔ لڑیں گے، ان کے لئے کھینچیں گے انکے لئے، جھکیں گے ان کے لئے، تنیں گے، بنیں گے۔ غرض یہ کہ جئیں گے ان کے لئے!

مقاصد کی فہرست کچھ بہت طویل نہیں۔ پھیلانے کی جگہ سمیٹنے پر اور بسط کے بجائے ایجاز پر آئیے تو کل دو لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں اسلام کی خدمت اور دین کی نصرت۔ توحید کی حرارت اور ناموس رسول کی غیرت۔ اسی کی شان سے جینا۔ اسی کی آن پر مرنا فلا تموتن الا وانتم مسلمون یہی مقصد ہے اور یہی مدعا یہی قبلۂ مقصود اور یہی نظر کا منتہیٰ۔ باقی جو کچھ ہے

سب اسی متن کی شرح، اور پھر شرح کا حاشیہ ۔ درس و تدریس کے مشغلے، عمارتوں کے سلسلے، تصنیف و تالیف کی الماریاں، وعظ و تذکیر کی سرگرمیاں، سب اسی مقصود کے ماتحت اور اسی کے تابع سب اسی مطلوب کے وسائل اور اسی کے ذرائع۔

دین کی نفس خدمت میں یہ نہیں کہ ندوہ منفرد ہو دین کی خدمت ندوہ کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ہو رہی تھی ۔ اب بھی ندوہ کے حدود سے باہر ہو رہی ہے ۔ دہلی ۔ لکھنؤ ۔ دیوبند سہارنپور، وغیرہ وغیرہ کی درسگاہیں ۔ پہلے بھی معطل نہ تھیں، اب بھی خاموش نہیں ہیں ۔ کہیں تجوید سکھائی جا رہی ہے ۔ کہیں رجال پر جرح و تعدیل ہو رہی ہے ۔ کہیں سے فقہ کے مفتی نکل رہے ہیں اور کہیں دیہات کے لئے مبلغ و مناظر ڈھل رہے ہیں ۔ یہ سب خدمتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ۔ اور مستحق اجر بھی ۔ قابل قدر بھی لیکن ندوہ کا دائرۂ عمل ان سب سے کچھ الگ سا ہے ۔ اس کا مقابلہ ہے وقت کے سب سے پر قوت اور سب سے پرشوکت فتنہ سے ڈنک مار کر تڑپا دینے والے بچھوؤں سے نہیں ۔ بلکہ مسلم نگل جانے والے اژدہے سے ۔ اس کا کام ہتھیلیوں میں گڑی ہوئی پھانسیں اور تلوؤں میں چبھے ہوئے کانٹے نکالنا نہیں ۔ اس کا کام ہے جسم ملت کو محفوظ رکھنا سر کے صدمہ سے ۔ قلب کے اوپر حملہ سے فتنہ کا نام دجالیت رکھئے یا فرنگیت، بہر حال ہے وہ فتنۂ قیامت، ترکی اس کا شہید، ایران اس کا قتیل، مصر اس کا شکار، ہندستان میں اس کے پھیلنے کے راستے بیشمار، کہیں وہ آ رہا ہے یونیورسٹیوں کالجوں ۔ اسکولوں کی راہ سے کہیں قدم جما رہا ہے ۔ مختلف کانگرسوں، کانفرنسوں کے بھیس میں، اخبارات اور رسالے اس کے نقیب، سینما اور ریڈیو اس کے وکیل ۔ کہیں وطن پرستی کا نقاب اس کے چہرہ پر پڑا ہوا، کہیں وہ "تجدد" کے پردہ میں جلوہ نما ۔ کہیں لاطینی حروف کا پروپگنڈا، کہیں شورنسائیت اور بے پردگی کا برپا، غرض خدا معلوم کتنے اس کے نام ہیں اور کتنے مظاہر ۔ سچے ندوی کی زبان جب کھلے گی ۔ اس حملہ کے جواب میں، اس کا قلم جب اٹھے گا ۔ اسی حریف کی زد میں، مقابلہ جب ہوگا اسی عدو مبین سے، اسی الد الخصام سے

ندوہ کی تاریخ دیکھ جائیے ۔ قدیم ترین ناظم مولانا شاہ محمد علی ؒ مونگیری تھے ۔ مسیحیت کی تردید میں دفتر کے دفتر اس وقت لکھ ڈالے جب دل و دماغ مرعوب تھے دانایان فرنگ کی دانائی اور حکمت سے، اور بہ استثناء شاذ کسی میں نہ ہمت تھی نہ حوصلہ فرنگیت اور فرنگیوں کے مقابلے میں آنے کا ۔ آفرین آپ کے اس قدیم ترین ندوی کے اس عزم مجاہدانہ پر، اس ہمت مردانہ پر۔

شبلی مرحوم کے دور میں آئیے، انکا تو اوڑھنا بچھونا ہی تھا اس حریف سے زور آزمائی کرنا سوال یہاں شبلی کے جوابات کی قوت وضعف کا نہیں، صرف ان کے مطمح نظر کا ہے۔ تاریخ ہو سوانحگری ہو۔ ادب ہو، اور تو اور شاعری ہو۔ کوشش ہر جگہ یہی رہتی تھی۔ اسلام کا بول بالا ہو۔ اور دین کا چہرہ روشن سے روشن تر نظر آئے نہیں اور ننگ تہذیب بدگویوں کا طعنہ دور کر رہے ہیں، کہیں مامون الرشید کا دربار سجا رہے ہیں کہیں فاروق اعظم کی آستان بوسی کی تیاریاں ہیں، کہیں غزالی نعمان ابی حنیفہ رح۔ اور مولانائے روم کے سوانح حیات سنا رہے ہیں۔ کلامی رنگ سب سے جھلکتا ہوا، سب میں جھلکتا ہوا۔ حد یہ ہے کہ جب فارسی شاعری اور شاعروں کے خاص تذکرہ شعر العجم پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تمہید میں یوں زمزمہ سنج ہوتے ہیں:۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا جو سطح خاک کے چپہ چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدر استعداد پہونچا۔۔۔۔ جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکا دیا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے ایرانی ہمیشہ سے تہذیب معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے، اسلام نے انکو ممتاز تر کر دیا"

اور آخری تصنیف سیرت النبی جس کی تحت بالخیر سے قبل خود مصنف کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اس کی کلامی حیثیت تو اس کی تاریخی حیثیت سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔

مولانا شبلی ہی کی لپیٹ میں انکے عزیز قریب مولانا حمید الدین فراہی اور انکے رفیق وحبیب مولانا شروانی کو بھی لے چلئے۔ فراہی مرحوم ومغفور تو زندگی بھر قرآن مجید ہی سے لگے لپٹے رہے۔ لیکن خود شروانی صاحب کے بھی دینی کارنامے، اور اسلامی خدمات کب محتاج ہیں کسی تعارف جدید اور توضیح مزید کے؟ ان دونوں کے گہرے تعلقات ندوہ اور اہل ندوہ سے بالکل ظاہر و واضح ہیں۔ پھر تلامذہ شبلی ہی کی فہرست نظروں میں رکھئے تو خدا معلوم کتنے ہیرے جیسے اعزازی ندوی قلم کے دھنی اور مخالفین اسلام کے حق میں دلیر اور جری نکل آئینگے معارف الدین اور محبت ساوی وغیرہ کے مصنف سید نواب علی ایم اے اور کمریڈ کے مشہور و نامور حق گو ایڈیٹر مولانا محمد علی رح۔ سید نام اس سلسلہ میں کافی ہونگے۔ دونوں کی حمایت ندوہ، اور دونوں کی دلچسپیاں ہماری جماعت

کے ساتھ محتاج بیان نہیں۔

یا اب پڑیا، ترتیب زمانی کے لحاظ سے ایک نام مولانا شبلی سے بھی پہلے آ جاتا ہے، تھا۔ صوبہ بہار میں ایک مشہور اور پرانا قصبہ ہے پھلواری۔ پڑھے لکھوں میں کون ناواقف ہے اس چمن کے بلبل ہزار داستان، مولانا قاری شاہ سلیمان سے، کانفرنس کے مجمع میں، ندوہ کے جلسہ میں جہاں کہیں واعظ سحر بیاں کھڑا ہو گیا، سننے والوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگ گیا، ہجوم بوڑھوں سے بڑھ کر جوانوں کا، عربی دانوں سے کچھ بڑھ ہی کر انگریزی خوانوں کا۔ اب حضرت سلیمان ہیں کہ خدا جانے کتنے پڑھے جنوں کو شیشہ میں بند کرتے جاتے ہیں۔ کتنے عفریتوں کو جان سے مارتے جاتے ہیں۔ اپنے میٹھے بولوں سے، مثنوی کے سریلے نغموں سے۔ بگڑے ہوؤں کے ایمان سنبھلتے جاتے، فرنگیت اور لادینی کے داغ دھبے دلوں سے دھلتے جاتے۔ شاہ صاحب مرحوم و مغفور آپکے ندوہ ہی کے رکن خاص الخاص تھے۔

آپ کے قدیم ارکان میں کاکوری کے منشی اطہر علی مرحوم نے جس ہمت و پامردی سے صوبہ کی طاغوتی حکومت کا مقابلہ کیا۔ اس کی نظیر اس وقت کی تاریخ میں ملنی آسان نہیں۔ بعد کے ارکان میں ایک نامور نامی شیخ مشیر حسین قدوائی مرحوم کا ہے، انگریزی میں رسالوں، پمفلٹوں، کتابچوں کا ایک انبار لگا گئے ہیں، سب کے سب مسائل اسلامی ہی کی حمایت و نصرت میں ہیں، اور آخر عمر میں تو بالشوزم اور اسلام پر ایک ضخیم و معرکۃ الآرا کتاب لکھ کر اپنی ذریت کا حق ادا کر گئے۔ اور پھر آپ کے ایک سابق شیخ مولانا امیر علی مرحوم و مغفور کی خدمات دینی کو کوئی بھلانا چاہے بھی تو کیونکر بھلا سکتا ہے، ہدایہ اور عالمگیری جیسی ضخیم کتابوں کا نہ صرف مکمل ترجمہ بلکہ شرح بھی اور فتح الباری کے ضخیم مجلدات کے بیشتر حصوں کو اردو میں منتقل کر جانا، اور پھر تیس جلدوں کی طویل عریض و ضخیم تفسیر مواہب الرحمٰن اور اس کے مقدمہ میں جدید مسخ شدہ ذہنیت سے تخاطب۔ یہ کارنامے ایسے ہیں کہ بجائے ایک فرد کے اگر ایک جماعت پر تقسیم کر دیئے جائیں تو جماعت بھر کے فخر کے لئے کافی ہیں۔

محترم بزرگوں اور استادوں سے قطع نظر، اب براہ راست اپنی جماعت کی طرف آئیے۔ طلبائے قدیم یا اولڈ بوائیز یا اگر اس کا لفظی ترجمہ ہی پسند ہو "بوڑھے لڑکے"۔ اور یہاں میرا محل اپنے جانے پہچانے سید الطائفہ

سرمایاں کو پایا ہے۔ وقت کے ہر فتنہ کا مقابلہ آج ان سے بڑھ کر کس نے کیا ہے؟ اور ملت کی ہر اجتماعی ضرورت کے دفعیہ میں ان سے بڑھ کر کون کام آ رہا ہے؟ سیرت سرور کائناتؐ میں اپنے مخصوص کلامی انداز میں دفتر کے دفتر انھوں نے تیار کر ڈالے۔ فتنۂ انکار حدیث میں انکا قلم آج تک شمشیر قاطع۔ اسلام کا پیام ہزار ہا ہزار نوجوانوں کے دل و دماغ تک انھوں نے پہونچایا! شکوک و شبہات کے دلدل سے خدا معلوم کتنے انگریزی خوانوں کو انھوں نے نکالا جو دھنسے ہوئے تھے پھر مغلیات کا جو ایک معلوم و معروف فسوں گر ہے، اس کے منتروں کا توڑ سب سے بڑھ کر انھیں نے کیا۔ اور پھر انکے ساتھ انکے رفیقوں، شاگردوں کی جو سرگرم اور کارکن ایک پوری جماعت موجود ہے قابل فخر بھی اور قابل قدر بھی۔ بھی آخر سب ندویوں ہی کی ہے یا کسی اور کی؟ دارالمصنفین کے کارنامے، ہندوستان ہی سے نہیں، ماشاء اللہ بیرون ہند سے بھی داد حاصل کر چکے ہیں لیکن خود یہ ادارہ اگر ندویوں ہی کا ساختہ پرداختہ اور ندوہ ہی کا ایک پرتو نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہاں کے متہور و معروف منیجر صاحب جن کے "ورود مسعود" سے ہم اس وقت بھی سرافراز ہو رہے ہیں، بہ حیثیت "مقوال" جیسے بھی کچھ ہوں، ان کے "فعال" ہونے اور ملی معاملات میں انکی زبردست عملیت سے کسی منکر کو بھی مجال انکار رہی ہے؟

اعظم گڑھ ہی کے ایک گوشہ میں ایک چھوٹے سے قصبے میں خدمت قرآن کا جو کام انجام پا چکا، یا اب انجام پا رہا ہے، اور وہاں کی زندگی کی قابل رشک صفائی اور سادگی، یہ سب آپ کے ندوہ ہی کا فیض ہے۔ اور آپکے پڑوس کا قصبہ نگرام بھی کس طرح آپ کے ندوہ ہی کی علمی نورانیت سے جگمگا رہا ہے۔ حیدرآباد کی اہم علمی، دینی تصنیفی زندگی میں، ندوہ کا جو ہاتھ ہے۔ وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ حیاں مرگ عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم جیسے جوان صالح، اور جامع علم و عمل فرزند، کیا ہر مدرسہ کے نصیب میں ہر روز آتے رہتے ہیں؟ دکن، بمبئی، دہلی، پنجاب، بہار، یوپی، بنگال، ہندوستان کے مختلف علاقوں کی تعلیمی اور تدریسی زندگیوں میں آپکے دارالعلوم کا عنصر کہاں مؤثر نہیں؟ صحافت جہاں کہیں بھی ندویوں کے ہاتھ میں ہے، خصوصاً بمبئی اور علی گڑھ میں، اپنی متانت و شرافت کا امتیاز قائم کئے ہوئے ہے۔ جامعہ ازہر جیسی دنیائے اسلام کی ممتاز ترین درسگاہ پر جو گہرا اور عظیم الشان

نقش آپکے ایک بھائی ابھی حال میں چھوڑ آئے ہیں، وہ ہمارے اور آپ کے فخر کے لئے بس ہے۔ دین کی تڑپ اور تبلیغ دین کی دھن کی مجسم مثال دیکھنی ہو تو اللہ انھیں نظر بد سے محفوظ رکھے، اور انکی اخلاقی صلاحیتوں کو پختہ سے پختہ تر کرے۔ اس مجمع کے اندر علی میاں کو دیکھ لیجئے۔ خود دارالعلوم اور مجلس ندوہ کو، کہنا چاہئے کہ اسوقت بلکہ عرصہ سے آپ ہی کی برادری کے لوگ چلا رہے ہیں۔ ناظم ندوہ، ندوی، معتمد تعلیم ندوی، مہتمم دارالعلوم ندوی، وقس علیٰ ہذا۔ پھر مدرس کی جگہ مدرس، تاجر کی جگہ تاجر، طبیب کی جگہ طبیب، اڈیٹر کی جگہ ایڈیٹر، غرض اجتماعی زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جہاں آپ کے بھائی ندویوں کو ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل نہیں ؟ اور ندویت ان سب میں مشترک بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں براہ راست اسلام کی خدمت کے مواقع حاصل نہیں، یہ اپنے مختلف عہدوں اور منصبوں سے اہل اسلام کی خدمت کرکے بالواسطہ اسلام ہی کے خادموں کی فوج میں داخل ہیں۔ مقصود ان مثالوں کے پیش کرنے سے، ان ناموں کے یاد دلانے سے، اپنی جماعت کی بڑائی جتانا نہیں، اپنوں کو جھکانا نہیں، تحدیث نعمت اور منعم کے ادائے شکر کے ساتھ اپنے کو ان فرائض کی طرف اور زیادہ متوجہ کرنا ہے۔

کوئی کہاں تک گنتا رہے، کوئی کہاں تک سنتا رہے ایک ایک کے نام کو، ایک ایک کے کام کو۔ بحمد اللہ یہ آپ ہی کے قائم کئے ہوئے دینی ماحول کی برکت اور تبلیغی فضا کا اثر ہے کہ یا جوجیوں اور دجالیوں کی زد آج جہاں بھی اور جب بھی دین پر پڑتی ہے، یہ آپ کا ندوہ ہی ہے کہ سب سے پہلے تڑپ اٹھتا ہے۔ اور پہلی ہی آواز پر آپ کے ارکان، اساتذہ، طلبہ، سب کے سب دوسروں کا انتظار کئے بغیر، جوانمردانہ باہر نکل آتے ہیں، اور بہادرانہ ڈٹ جاتے ہیں۔ کانہم بنیان مرصوص کے مصداق، السابقون الاولون کے مرتبہ سے سرافراز، اس کا حال کوئی ایک فتنہ فروش کے دل سے پوچھے، جس کی مرتدانہ فتنہ زگاریاں اب رسوائے عالم ہو چکی ہیں، اس کے ہر حربہ کو کند کر دینے والی جماعت سب سے بڑھ کر آپ ہی کے ندوہ کے فرزندان قدیم وجدید کی نکلی، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اپنے چھوٹے بھائیوں یعنی موجودہ طلبہ کی مشکلات کا اندازہ کیجئے۔ انکی کڑی آزمائشوں کو نظر میں رکھئے شہری زندگی کے عام فتنے اور بلائیں جو ہر بڑے مرکز کی طرح اس شہر پر بھی مسلط ہیں، انھیں چھوڑ دیجئے صرف یہ سوچئے کہ یہ کس سن میں اور کہاں رہ رہے ہیں؟ ان کے پڑوس میں کون سی عماتیں، عظیم الشان پر تعیش عمارتیں ہیں۔ یہاں کے دن گزرتے رہتے ہیں، اسٹرائکوں، مطالبوں، مظاہروں کے نعروں میں، اور راتیں بسر ہوتی رہتی ہیں سینما اور گراموفون اور ریڈیو کے نغموں میں! آپ کے عزیز اگر اس فضا اور اس ماحول میں بھی اپنے تقویٰ اور اپنی شرافت قائم رکھے ہوئے سکون و یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں تو اسے اللہ کی رحمت اور فضل و کرم کے بعد اور کس چیز پر محمول کیا جائے، بجز آپ حضرات کے اسوۂ حسنہ کے بجز آپ حضرات کی قائم کی ہوئی روایات اسلامیت و شرافت کے؟

خطبۂ "اولڈ بوائز" کے جلسہ کے حدود سے بڑھ چلا۔ سامعہ نوازی کی جگہ سامعہ خراشی دیر تک ہو چکی اور عجب نہیں کہ سامعین کے جبیں تحمل پر بل پڑنے لگے ہوں یہ ساری گفتگو چلی تھی اس پر کہ خودشناسی پیدا کیجئے اپنے کو پہچان خوب لیجئے۔ اپنی اس خودی کو قائم رکھئے، زندہ رکھئے، اپنی اس روشنی کو مدہم نہ ہونے دیجئے اور وہ خودی ہے کیا؟ فلسفہ خودی کے مشہور اسرار شناس اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

ندوہ کی خودی، ندویت، بس اسی ترکِ فرنگ کا دوسرا نام ہے ؎

درگزر از جلوہ ہائے رنگ رنگ   خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

ماضی و حال کا سرسری جائزہ ہو چکا۔ اب مستقبل کے لئے پیام مختصر لفظوں میں سُن لیجئے۔ اور یہی مقطع کا بند ہے

سب سے پہلی عرض یہ ہے کہ ندوہ آپ کا ہے آپ بھی ندوہ کے ہو جائیے، اسے اپنا سمجھئے۔ اسے اپنی زندگی کا ایک جزو بنا لیجئے۔ کارکنوں پر نکتہ چینی سے بڑھ کر آسان اور نفس کو خوش کرنے والا کوئی مشغلہ ہی نہیں۔ کیا اچھا

ہوتا کہ ہم بجائے اس کے خود اپنی ذمہ داریوں کی فکر میں لگ جاتے، خود ہم نے آج تک کارکنوں کو کیا مدد دی؟ اپنے وقت عزیز کا کتنا حصہ ندوہ کے کاموں کے لئے نکالا؟ اپنی آمدنی میں سے اپنے اس عزیز دارالعلوم کو کس حد تک شریک کیا؟ اپنے صاحب اثر عزیزوں دوستوں، اور ملنے والوں کو اس کی اعانت پر کہاں تک توجہ دلائی؟ غرض یہ کہ اپنے ندوی ہونے کے فرائض کہاں تک ادا کئے؟ —— "جرمنی جرمنوں کے لئے" "ہندستان ہندوستانیوں کے لئے" اس دور کے نعرے آپ نے بارہا سنے ہوں گے، آپ کا مصرعہ اسی ردیف و قافیہ میں یہ ہونا چاہئے "ندوہ ندویوں کے لئے" بلحاظ حقوق بعد کو، بلحاظ فرائض پہلے،

دوسری بات یہ ہے کہ اپنی اس انجمن پر دل سے توجہ کیجئے، اس میں روح از سر نو پھونکئے! اسے فعال بنائیے، کوئی انجمن اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی کہ بس سال میں ایک جلسہ کر ڈالا، اور سال بھی ایسا جو کبھی ۱۲ مہینہ کے بعد آیا، کبھی ۲۔۳ مہینہ کے بعد، اور کبھی اس کے بھی بعد اس باب میں سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان طلبہ پر جو مرکز میں مقیم ہیں اور دارالعلوم یا دفتر ندوہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ ان میں بعض یقیناً پیکر عمل بھی ہیں اور ان کی معمولی سی توجہ، مستعدی، اس مشکل کو حل اور اس داغ کو انجمن کے دامن سے دور کر سکتی ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ انجمن کے باضابطہ نظام سے قطع نظر یوں بھی ہر ندوی کو دوسرے ندوی کے ساتھ ایک مکمل نمونہ ہونا چاہئے، اخلاص و ہمدردی کا، شفقت و رحمت کا، عزیز داری اور بھائی چارہ کا، مواسات و یک جہتی کے لئے رشتۂ ایمانی خود کیا کم ہے، اس دستاویز پر تو ندویت کے بعد ایک مستحکم مہر توثیق لگ جانا چاہئے۔ مشہور ہے کہ فری میسن برادری کا ہر فرد، ایک دوسرے کے حق میں اپنے نفس سے بڑھ کر ہوا خواہ و مخلص ہوتا ہے۔ اپنے اخلاص و یگانگت کے ایسے مکمل نمونے پیش کیجئے کہ فری میسنوں تک کو آپ پر رشک آنے لگے اور مثنوی کے اس مصرع

مومناں آئینہ یک دیگر اند

کی قرأت آپ کے نسخہ میں ؎

ندویان آئینہ یک دیگر اند

ہو جائے۔ طالب علمی کے زمانہ میں عصبیت وطن کچھ نہ کچھ ضرور رہتی ہے۔ اور کہیں کہیں تو مستقل صوبہ وار ٹولیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ اولڈ بوائے ہو کر کوشش کیجئے کہ یہ عصبیت گم ہو کر رہے ندویت کی عصبیت میں۔

ترتیب کے لحاظ سے چوتھی اور آخری لیکن اہمیت کے اعتبار سے سب سے مقدم گذارش یہ ہے۔ کہ اپنی خودی کو خود فراموشی سے نہ بدلئے۔ اپنی خودی کو عزیز دینی ندویت کو ہمہ وقت بیدار رکھئے۔ ندویت نام ہے علم سے، زبان سے، قلب سے جہاد فی سبیل اللہ کا، فرنگیت سے کفر کا اپنے پر ایمان و اعتقاد کا ؎

اے اسیر رنگ پاک از رنگ شو مومن خود کافر افرنگ شو

وانی از افرنگ واز کار فرنگ تا کجا در قید زنار فرنگ

آپ کے درس ندویت کی بائے بسم اللہ بھی یہی تھی اور تائے تمت بھی یہی۔ یہی مبدا اور یہی منتہیٰ۔ چاہئے کہ یہی آپ کا مقصد وجود رہ جائے یہی آپ کی غایت زندگی بن جائے۔ زبان پر جاری یہی قال رہے، دل پر طاری یہی حال رہے۔ اللہ کی دنیا میں چلئے پھریئے، ملئے جلئے، ہنسئے بولئے، لیکن یہ خیال جما رہے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کہ آپ ہیں اللہ کی فوج کے سپاہی۔ پتلے بن جایئے غیرت دینی کے پیکر ہو کر رہ جایئے جرارت ایمانی کے۔ بگڑ جایئے اس سے جو آپ کے دین کے ساتھ تمسخر واستہزار کا قصد کرے، لڑ پڑیئے اس سے جو آپ کے آقا وسردار کے ناموس سے گستاخی کی جرأت کرے۔ آنکھیں نکال لیجئے اس کی جو آپ کے قرآن کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھے، تعلقات عمر بھر کے لئے توڑ لیجئے اس بدبخت سے جو ارتداد کی راہ کھولنا چاہئے۔ یہی آپ کی جماعت کا سب سے بڑا تمغۂ امتیاز ہے، اور سب سے بڑا شرف و افتخار!

کریم وکارساز! مالک و مولیٰ! چلا اپنی مرضیات پر ہم سب کو ہمارے بڑوں کو اور چھوٹوں کو۔ ہمارے دوستوں کو

عزیزوں کو، پیاروں، رفیقوں کو، شریکوں کو، لبریز کر دے ہمارے سینوں کو اپنے دین کی عصبیت سے، اپنے محمدؐ کے نام کی غیرت سے! دنیا تل جائے تجھ سے بغاوت پر، غداری پر، ہم کو استوار رکھ اپنے رسول کی اور اپنی کتاب کی وفاداری پر! اٹھیں تو تری عظمت کے نعرے لگاتے ہوئے، دم توڑیں تو تیری توحید کے لئے شہادت دیتے ہوئے۔ جی کر اٹھیں تو تیرے نام کا کلمہ پڑھتے ہوئے! فیق اور ساتھی ساتھ چھوڑتے ہیں، ہٹتے رہیں۔ کٹتے رہیں، ٹوٹ ٹوٹ کر دشمنوں سے ملتے رہیں، پر ہمارا قدم نہ ڈگمگائے۔ ہماری ہمتوں میں، وفاداریوں میں فرق نہ آئے۔ جب وہ ناگزیر وقت آئے کہ سارے سہارے بودے نکلیں اور سارے آسرے دغا دے جائیں تو اس وقت بھی دل کے اندر بسا ہو تیرے قرآن کا بتایا ہوا دین، اور روح کی گہرائیوں میں رچا ہو تیرے رسول کا لایا ہوا آئین۔ اور لب اور زبان پر ہو آخری سانس کے ساتھ۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ضروری گذارش

نئے سال کا پہلا پرچہ حاضر خدمت ہو رہا ہے براہِ کرم اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے وی، پی، میں آپ کا چار آنے کا نقصان ہوگا۔

"منیجر"

نوٹ

طلبائے قدیم کے جلسہ کی کارروائی کی وجہ سے یہ پرچہ ۴۰ صفحہ کا شائع ہو رہا ہے، ہماری خواہش ہے یہ اضافہ مستقل ہو جائے لیکن اسکی تکمیل ہم سے زیادہ ہمارے دوستوں کے اختیار میں ہے۔

حالاتِ ندوہ

دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ایام میں ندوہ میں خاصی چہل پہل رہی ۲۵ اور ۲۶ دسمبر کو طلبائے قدیم کے سالانہ اجتماعات تھے! اس تقریب سے ندوہ کے پرانے طالب علموں ندوی دوستوں اور اس درسگاہ کے ہمدردوں اور معاونوں کی ایک اچھی خاصی جماعت مجتمع ہوگئی تھی۔ دو تین دن بڑے لطف و مسرت سے گذرے قدم قدم پر برادرانہ محبت اور عزیزانہ یگانگت کے جلوے نظر آرہے تھے، عجب سماں تھا، مدت کے چھوٹے ہوئے ساتھی جمع تھے۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست گلے مل رہے تھے زمان و مکان کی حدبندیاں ختم ہوگئی تھیں کچھ دیر کے لئے دماغ مستقبل کی فکرمندیوں سے خالی ہوگئے تھے، حال کی شورشیں ماضی کے پرلطف تذکروں میں دب گئی تھیں، اور کشاکش حیات کی الجھنیں، عالم خیال سے محو ہوگئی تھیں زندگی کے بھولے ہوئے خواب یاد آرہے تھے۔ مدت کی فراموش داستانیں حافظوں میں تازہ ہورہی تھیں، اور اخلاص و وفا کے ٹوٹتے ہوئے رشتے پھر سے استوار ہورہے تھے،

خوش قسمتی سے اسکی اس جلسہ کی صدارت ہمارے مخدوم جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ندوی نے قبول فرمائی تھی، انکی کشش انگیز ذات نے جلسے میں ایسی گیرائی پیدا کردی تھی کہ موسم کی شدت، مسافت کی دوری، قومی اور سیاسی جلسے، تعلیمی اور ادبی کانفرنسیں کوئی چیز شرکت اجلاس میں حائل نہ ہوسکی اور لوگ ہرطرف سے کھینچ کھینچکر ندوہ کے مرکز میں جمع ہوگئے۔ حاضرین میں دارالعلوم کے اساتذہ اور لکھنؤ کے مقامی دوستوں کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی۔ مولانا حفاظت علی ندوی پروفیسر جوبلی کالج خان بہادر مولانا محمد سعید خان ندوی وکیل ہردوئی، مولانا شاہ فضل الرحمٰن مجددی ندوی۔ مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوی ناظم ندوۃ العلماء۔ مولانا سعدالدین ندوی پروفیسر جامعہ ملیہ

مولانا نجیب اشرف ندوی پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی، مولانا مصطفےٰ حسن ندوی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی، مولانا عبد
ندوی پروفیسر طبیہ کالج علی گڈھ۔ مولانا عبدالرحمن صاحب کاشغری ندوی، پروفیسر مدرسہ عالیہ کلکتہ۔
معین الدین ندوی تحصیلدار جہانگیر آباد، مولانا ضیاء اللہ ندوی مدیر مستقبل جونپور، حکیم محمد اسحاق ندوی ا
جامع العلوم کانپور، حکیم عماد الدین ندوی، حکیم بشیر احمد ندوی۔ خاص طور سے قابل ذکر ہیں

تلاوت قرآن مجید کے بعد صدر استقبالیہ مولانا سید شاہ عز الدین ندوی نے اپنا خطبہ سنایا جس
کے مقاصد، انجمن طلبائے قدیم کے قیام کی غرض وغایت اس کی گذشتہ تاریخ، ندویوں کے موجودہ حالات،
مشاغل ومصروفیات کی تفصیل تھی، یہ خطبہ جلسہ میں بڑی دلچسپی سے سنا گیا۔ شاہ صاحب نے متانت وسنجیدگی میں
کا ایسا پیوند لگایا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ساری مجلس بزم نشاط بن گئی، برجستہ فقروں اور سجع و قوافی کی
رعائتوں نے اس لطف کو دوبالا کردیا تھا، خطبہ استقبالیہ اور ناظم انجمن مولانا حامد علی ندوی کی رپورٹ کے
اجلاس مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا، جو بڑی توجہ سے سنا گیا، یہ پورا خطبہ اسی رسا
شائع کیا جارہا ہے، تاکہ جن کانوں تک مولانا کی آواز نہ پہونچ سکی ہو، ان تک بھی مولانا کا یہ پیام پہنچ جائے
نگارش اور انداز بیان اتنا مشہور ومعروف ہے کہ اس کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی جیسے کوئی روز روشن میں آ
کا تعارف کرائے۔

ان خطبوں کے علاوہ جلسہ میں چند اور اہم ومفید تقریریں ہوئیں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے ندویوں
فرائض وواجبات کیجانب توجہ دلائی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے مقا
ایک موثر اور دلپذیر تقریر فرمائی، مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب مجددی ندوی نے اسلامی زندگی کا
پیش فرمایا۔ اور بتایا کہ روح کی غذائے صالح کا مجرب نسخہ کیا ہے۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے، ند
زمانے کے موجودہ پریشان کن مگر انقلاب انگیز حالات کی طرف توجہ دلائی، اور بتایا، کہ فکر وخیال کے اس انتشا

قوم کو ندویوں سے کیا توقعات ہیں، اور زندگی کی پیچیدہ راہوں میں وہ کسی طرح شمع راہ بن سکتے ہیں۔

پھلواری شریف کے اجلاس میں انجمن کے استحکام اور اس کے کاموں کی توسیع کی غرض سے صوبہ جاتی مجالس کے قیام کی تجویز منظور ہوئی تھی، بہار، بنگال، آسام کی شاخیں پہلے قائم ہو چکی تھیں، اس سلسلہ میں صوبہ جات متحدہ کی شاخ بھی قائم ہوگئی، خان بہادر مولانا محمد سعید خاں ندوی ایم اے ایل ٹی، وائیس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ ہردوئی، اس کے صدر اور مولانا حفاظت علی ندوی پروفیسر جوبلی کالج اور مولانا معین الدین ندوی تحصیلدار جہانگیر آباد، نائب صدر منتخب ہوئے، یہ کاتب سطور بھی اسی زمرہ میں شامل کیا گیا مولانا نجم الدین احمد ندوی منصرم دار العلوم سکریٹری مقرر ہوئے، اس کے ساتھ ناظم صاحب انجمن کی تحریک پر قانون کی نظر ثانی کی غرض سے مولانا حفاظت علی صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے، جو آئندہ جلسہ میں قانون کا نیا خاکہ پیش کرے گی۔

طلبائے دار العلوم کی انجمن الاصلاح کا ذکر وقتاً فوقتاً ان صفحات میں آتا رہا ہے۔ دسمبر میں سال نو کے انتخابات عمل میں آئے جدید کابینہ حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

(۱) صادق اللہ بہاری	صدر	(۲) علی احمد گیانی	ناظم
(۳) محمد یوسف سیدی	نائب ناظم	(۴) محمد اسماعیل سورتی	مددگار ناظم
(۵) محمد اسحاق پشاوری	محاسب	(۶) محمد صدر الدین اعظمی	معتمد صحافت
(۷) ابو العرفان جونپوری	معتمد خطابت	(۸) عبد الحفیظ قدوائی	معتمد مالیات
(۹) مجیب اللہ غازی پوری	معتمد بزم ادب	(۱۰) محمد صابر سانٹری	معتمد دار الکتب کلاں
(۱۱) مصلح الدین	معتمد دار الکتب خورد	(۱۲) محمد زبیر	معتمد دار الاخبار

---

۲۹ دسمبر ۱۹۴۰ء کو باقاعدہ رسم مسند نشینی عمل میں آئی، اس موقع پر طلباء کے علاوہ اساتذہ دار العلوم ممتاز ندوئین اور بعض سربرآوردہ معززین شہر بھی موجود تھے، محمد نواب خاں صدر انجمن نے جلسہ کی صدارت کی اور اقبال وارث انصاری سابق ناظم نے سال گذشتہ کی رپورٹ سنائی جسکی منظوری کے بعد صدر و ناظم نے نئے ارکان کے گلوں میں ہار ڈالے، اور منتخب صدر و ناظم کے لئے جگہ خالی کر دی، مہتمم صاحب دار العلوم نے اُن کے گلوں میں زریں ہار ڈالے، اس کے بعد صدر منتخب صادق اللہ صاحب نے اپنا خطبہ صدارت سُنایا جس میں انجمن کی گذشتہ تاریخ اور آئندہ لائحہ عمل کا ذکر تھا، پھر ناظم جدید علی احمد کیانی نے اپنے کابینہ کیجانب سے انجمن کے ارکان اور شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اسلامی نظام حیات کا ایک ایسا مکمل خاکہ مرتب ہو جو نوجوانوں کے لئے شمع راہ بن سکے اور جس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی اسلامی رنگ میں رنگ سکیں پچھلے دنوں مسلم لیگ نے اس غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی نواب جمشید علی خاں صاحب رئیس باغپت اور نواب صاحب چھتاری کی تحریک پر ملک کے متعدد ممتاز فضلا اس کمیٹی میں شریک ہوئے ہیں، ۵ جنوری کو دار العلوم ندوہ کی عمارت میں اس کمیٹی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا نواب صاحب چھتاری جلسہ کے صدر تھے کمیٹی نے غور و فکر کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ، مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنا دی ہے تاکہ یہ حضرات پورے غور و فکر سے اس موضوع پر ایک کتاب کا مسودہ تیار کریں۔

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ محرم الحرام سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۲

قیمت فی پرچہ تین آنے — سالانہ چندہ دو روپیے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

جنوری کا رسالہ عرصہ ہوا حاضر خدمت ہو چکا ہے اب نئے سال کا یہ دوسرا پرچہ روانہ ہو رہا ہے اس تیرہ چودہ مہینے کی مدت میں رسالہ نے جو تدریجی ترقی کی اس کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ گذارش صرف یہ ہے کہ آپ اسے اپنی چیز سمجھیں لوگوں کو اس جانب توجہ دلائیں اور اس کی اشاعت کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں ندوہ کے ارکان، دارالعلوم کے طالب علموں اور ندوی دوستوں سے خصوصیت سے گذارش ہے اور امید ہے کہ وہ اس بارہ میں غیر معمولی توجہ سے کام لیں گے۔

برما کے مدرسہ ندوۃ المسلمین کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے یہ مدرسہ مولوی سکندر احمد ندوی اور مولوی افلاطون احمد ندوی کی کوششوں سے گذشتہ سال قائم ہوا تھا پہلے اس کا مرکز ناگچنگ (NINGCHONG) میں تھا لیکن امسال یہ لوگ اسے ٹیمنگ چونگ۔ بوتھیڈانگ (TAIMONGCHONG, BOTHIDONG) ایکیاب میں لے آئے ہیں متوسطات تک تعلیم کا انتظام ہے نصاب اور طرز تعلیم میں ندوہ ہی کا اصول پیش نظر ہے عربی زبان اور علوم دینی کی نشر و اشاعت کے ساتھ اس مدرسہ کا یہ بھی مقصد ہے کہ برما کے مسلمانوں میں اُردو کو رواج دیا جاوے تاکہ انکی ذہنی سطح بلند ہو ان کے خیالات کا دائرہ وسیع ہو اور ہندوستانی اسلامی برادری سے ان کے تعلقات پیدا ہو سکیں اس غرض سے مدرسہ کے کارکنوں نے ایک دار المطالعہ قائم کیا ہے انکی خواہش ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس کام میں انھیں مدد دیں ہمیں امید ہے کہ اُردو کی اشاعت گاہیں اور اُردو اخبارات و رسائل اس جانب ضرور توجہ کریں گے۔

معین الندوہ کا کام بحمداللہ ترقی پذیر ہے ملک کی تجارتی ابتری، اقتصادی بدحالی اور سیاسی کشاکش کے باوجود کچھ نہ کچھ کام آگے بڑھ ہی رہا ہے ندوہ کے ہمدردوں کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ پچھلے دنوں بنگال و آسام میں بھی معین الندوہ کا حلقہ قایم ہوگیا ہے مولوی عتیق احمد ندوی اس حلقہ کے ناظم مقرر ہوئے ہیں ہمیں امید ہے کہ بنگال و آسام کے مسلمان اس کام میں عتیق صاحب کی پوری مدد دیں گے ندوہ کے ہمدردوں اور ندوی دوستوں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ندوہ کا کام خود ان کا کام ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں گے اور پوری قوت سے معین الندوہ کے کام کو آگے بڑھانے کی سعی کریں گے۔

طلبائے قدیم کے تازہ اجلاس نے ایک تجویز منظور کی تھی کہ تمام ندوی اپنے پتوں اور مشاغل سے دفتر کو مطلع کریں اس سلسلہ میں ناظم صاحب ایک یادداشت مرتب کر رہے ہیں جس میں ندویوں کے خود نوشت حالات جمع کئے جائیں گے تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ندوہ کی تعلیم دینی خدمت کے اعتبار سے عملاً ملک و ملت کے لئے کیسی ثابت ہوئی انکی خواہش ہے کہ تمام ندوی اپنے حالات قلمبند کرکے انجمن طلبائے قدیم (مرکزی) دارالعلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر اولین فرصت میں بھیجدیں تاکہ وہ مجموعہ جلد شایع ہوسکے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

سب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اسلام کے متعلق صحیح واقفیت دی اور ہندو سوسائٹی میں رہ کر میں ۱۶ برس کی عمر سے پہلے مسلمان ہوگیا، وہ "تحفۃ الہند" ہے، تحفۃ الہند کے (میرے ہمنام) مؤلف نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقائد و رسوم کو نقل کرنے کے بعد ہندوؤں کی طرف سے ایک اعتراض نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں بھی مشرکانہ اعمال و رسوم پائے جاتے ہیں۔ اس کا جواب مؤلف نے مختصر طریقہ پر یہ دیا ہے کہ ہم نے ہندو مذہب کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ انکی مستند مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہے لیکن اس کے جواب میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ اسلام کی مستند کتابوں سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اعمال و رسوم ہیں، جنکا اسلام ذمہ دار نہیں ہے، اور قرآن و حدیث سے انکی کوئی سند پیش نہیں کیجا سکتی، اس موقع پر میرے ساتھی کو جو میری طرح نومسلم تھے توجہ ہوئی کہ وہ اس بات کی تحقیق کریں کہ کیا واقعی اسلام کی مستند کتابیں اس مسئلہ میں بالکل بے داغ ہیں اور اُن میں ان اعمال و رسوم کا کہیں ثبوت نہیں، اس موقع پر ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں صرف قرآن و حدیث کے حوالہ سے اسلام کی توحید پیش کی گئی ہو۔ خوش قسمتی سے تحفۃ الہند کے بعد جو دوسری کتاب ہمارے ہاتھ میں آئی وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" تھی جو اس سوال کا جواب شافی تھی اور جس سے ہمکو معلوم ہوگیا کہ اسلام کی توحید بالکل خالص ہے، اور قرآن و حدیث مسلمانوں کے ان اعمال و رسوم سے بالکل بری ہیں۔

ان دونوں کتابوں سے میں اسلام کے متعلق ایسا صحیح عقیدہ پیدا کرسکا کہ آجتک شاید میں اسمیں ایک حرف بھی اضافہ نہیں کرسکا

دیوبند کی طالب علمی کے بعد قبلہ نما مولانا محمد قاسم کی کتاب میرے لئے ایک بڑی محسن چیز ہے میں یہ شبہ خود تو کبھی دل میں نہیں لا سکا کہ بیت اللہ کے سجدہ میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ مگر جب یہ شبہ میرے سامنے آیا تو میری طبیعت پوری اس کے حل کرنیکی طرف متوجہ ہوئی میں جب قبلہ نما پڑھ چکا تو گویا میرا سارا بدن نئے ایمانی نور سے بھر گیا اس کے بعض چیدہ چیدہ حصے آجتک میں بے نظیر مانتا ہوں، اس کتاب نے میری ذہنیت میں ایک دوسری تبدیلی پیدا کردی، دانشمندی حاصل کرنے میں جن مصنفین کی کتابیں مدرسوں میں پڑھی جاتی ہیں ان کے مصنفین کا ایک خاص اثر طالبعلم کے دماغ پر پڑتا ہے وہ انکی تحقیقات کو بے نظیر چیزیں سمجھنے لگتا ہے پھر اسی روشنی میں وہ کتاب و سنت سمجھنے کی کوشش کرتا ہے. مولانا محمد قاسم کو میں نے قبلہ نما میں اسطرح پہچان لیا کہ وہ علامہ تفتازانی، میر سید شریف ایسے بزرگوں سے بہت بڑے ہیں اگر یہ انکی محقق چیزوں کو نہیں مانتے اور اپنا مسلک ان سے جدا مقرر کرتے ہیں اور اپنے مسلک کی پابندی میں اتنے بڑے مشکل مسئلے کو حل کر دیتے ہیں تو ان کا مسلک ان سے میرے نزدیک بہت زیادہ صحیح اور صاف ہے، یہی جراثیم تھے جو آگے چل کر شاہ ولی اللہ صاحب تک پہونچانے کے باعث بنے اگر میں ان درسی کتابوں کے مصنفین کی تقلید سے آزاد نہ ہو جاتا تو کبھی شاہ ولی اللہ کو امام نہ مانتا.

اس کے بعد میری محسن کتابوں میں "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس کے ذریعہ سے میں قرآن سمجھا، حدیث سمجھا. فقہ سمجھا، حجۃ اللہ کو میں ایک مرکزی حیثیت سے اپنی محبوب کتاب مانتا ہوں ورنہ شاہ صاحب کی ہر سطر میری محسن ہے حجۃ اللہ کے بعد شاہ صاحب کی کتابوں میں سے الفوز الکبیر، فتح الرحمان، بدور بازغہ کی بہت زیادہ اہمیت میرے دماغ میں ہے.

محسن کتابوں کے سلسلہ میں اگر میں ان کتابوں کے بعد کوئی کتاب لکھوا سکتا ہوں تو وہ مولانا شہیدؒ کی عبقات ہے جس نے حجۃ اللہ کے مقدمہ کا کام دیا.

شاہ صاحب کی تصنیفات کے مطالعہ کی ترتیب اور انکے مقدمات | جس نے سلم کی شرح پڑھی ہوں اس کا

درجہ آج وہی ہے جو پہلے شرح مطالع پڑھنے والے عالموں کا تھا. ایک ذکی نوجوان طالبعلم جب اس درجہ سے فارغ ہوجائے تو اس کو سب سے پہلے شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی تکمیل الاذہان پڑھنی چاہئے اسکے بعد عبقات اسکے بعد سطعات اس کے بعد البدور البازغہ مگر مقدمہ چھوڑکر اس کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کے بعد الفوز الکبیر اسکے بعد فتح الرحمان فتح الرحمان پڑھتے ہوئے تمام تفسیریں جو ممکن ہوں سامنے کھلی جائیں ان کا جو فائدہ عزیب در عام مفسرین سے ایک علیحدہ سی بات معلوم ہو اس کو خاص طور پر قابل توجہ سمجھا جائے اس نکتہ پر تمام تفسیرین مطالعہ کی جائیں اس کے بعد یعین کرنا ہوگا کہ کیا راز تھا کہ شاہ صاحبؒ نے عام مفسرین کا مسلک ترک کردیا جو چیز سمجھ میں آجائے اس کو مستقل محفوظ کرلیا جائے کبھی کسی مخالفت کی کوئی بات نہ مانی جائے۔

اس سلسلہ میں مولانا محمد قاسمؒ کی کتابیں بھی ہمارے نزدیک ان حضرات کی کتابوں کی طرح تقریب کرنیوالی میں ایک کالج کا طالبعلم پہلے یہی کتابیں زیادہ دیکھے اور جو اسے اجنبی سے معلوم ہوں انھیں چھوڑتا چلا جائے اور بار بار دیکھے تو وہ شاہ صاحبؒ کی تصنیفات سمجھنے کی استعداد پیدا کرلیگا آخر میں تفہیمات الٰہیہ دنیا کے مختلف معرکۃ الآرا مسائل کو حل کرنے کیلئے ایک اہم تصنیف سمجھنی چاہئے مگر اسوقت ذہنیت اتنی وسیع ہو کہ شیطان سے بھی حکمت سیکھ سکتا ہو۔

شاہ صاحبؒ کا سیاسی مسلک اور ازالۃ الخفاء

ہم نے سب سے پہلے ازالۃ الخفاء میں اس آیت کی تفسیر بڑے غور سے پڑھی ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون (صف ع ۱) شاہ صاحب کی کتابوں میں ہم نے جتنا زیادہ غور کیا ہے یہی تفسیر انکی ساری حکمت سیاسی کا مرکزی نقطہ معلوم ہوا۔

شاہ صاحب کی ازالۃ الخفاء میں فاروق اعظم کے مذہب کا جو رسالہ ہے وہ ایک بے نظیر کتاب ہے میں صحاح ستہ میں سے پانچ کتابوں کو موطا کی شرح بناتا ہوں اس کے بعد موطا کو اس فاروق اعظم کے مذہب کی شرح بناتا ہوں، اس سے میرے تمام شکوک حل ہوگئے اور قانون کے مختلف زبانوں میں تبدیلی کی ضرورت صاف ہوگئی۔

فاروق اعظم کے زمانہ کی جو چیز تھی اسی نے بنی امیہ کے آخر دور میں موطا کی شکل اختیار کر لی اور موطا عباسیوں کے دور میں بخاری مسلم ابوداؤد اور ترمذی کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہم ان چار حدیث کی کتابوں کو چار انجیلوں کی طرح صحف الہیہ میں شمار کرتے ہیں وہ تورات کی تشریح کرتی ہیں یہ قرآن کی تشریح کرتی ہیں مگر اس میں احتیاط کی ضرورت ہے کہ حجۃ اللہ کے قاعدہ تطبیق کے دونوں طریقوں کو سہ .. ات میں جمع کر لیا جائے اس کے بعد فقط مستفیض اور متواتر کو سند بنایا جائے آحاد خبروں کو اسی کے درجہ پر چھوڑ دیا جائے اس میں تبدیلی بقدر ضرورت آسانی سے ہو سکتی ہے۔

ازالۃ الخفا میں شاہ صاحب نے قرون ثلثہ کی تفسیر لی ہے ہم نے آج تک دوسرے عالم سے یہ تفسیر نہیں سنی ہم اس کو شاہ صاحبؒ کے بہت اعلیٰ علوم میں شمار کرتے ہیں۔

مجھ سے یورپ میں بارہا سوال کیا گیا کہ قرآن کا آپ کے نزدیک کیا مطلب ہے یعنی میں اپنے فلسفی انداز میں کس طرح تفسیر کرتا ہوں، میرا جواب یہ تھا کہ حضرت عثمان کی شہادت تک جو کچھ مسلمانوں کی جماعت نے کیا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک) وہ قرآن کا مقصد ہے اسکی تشریح میں جس فلسفہ سے چاہوں کر سکتا ہوں تاہم یہ ہے قرآن کا مقصد یہ ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کی رو دیکھکر شیعہ سنی کا مسئلہ ہاتھ میں لیا، اور اسی کو اپنی حکمت بیان کرنیکا ایک عنوان بنا لیا وہ کہتے ہیں شیخین انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں اس لئے کہ وہ نبی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اب ضرورت پڑی کہ بتایا جائے کہ نبوت کیا کرتی ہے اور انھوں نے کیا کیا، تو حکمت کے دونوں باب حل ہو گئے نبوت کا مطلب بھی معین ہو گیا اور خلافت راشدہ کا مضمون بھی صاف آ گیا۔

شاہ صاحب کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابوبکرؓ کے دور کو عمرؓ کے دور کی تمہید سمجھتے ہیں اور عثمانؓ کے دور کو اس کا نتیجہ یا تکمیل اب اس تمام خلافت میں وہ اصلی چیز فاروق اعظم پر توجہ کرتے ہیں اور فاروق اعظم نے چونکہ کسریٰ قیصر کی حکومت فتح کر کے ایک حکومت بنائی تھی جو شاہ صاحبؒ کی تفسیر میں مقصد تھا نزول قرآن کا

تو فاروقِ اعظم کے کام کو وہ نبوت کے بعد قرآن کا بہترین مصداق مانتے ہیں اساسی پر وہ ساری قوت صرف کردیتے ہیں، چونکہ وہ فاروقی ہیں اس لئے وہ پوری ہمت سے اس مسئلہ کو واضح کرنے کی طبعی استعداد رکھتے ہیں اور جب ایک صدیقِ اعظم کی سیرت ایک صدیق لکھدے تو پھر نبوت کے بعد بزرگوں کے معیار سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں صاف نمایاں نظر آتا ہے کہ جسقدر روحانی فیوض اپنے والد ماجد کے ذریعہ اُن کو حاصل ہوئے ان میں زیادہ تر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا واسطہ ہے اس لئے وہ ائمہ اہلبیت سے قلبی محبت صحیح معنی میں رکھتے ہیں مگر انکے طریقہ کو جسقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی ادھر وہ متوجہ نہیں ہوئے میں نے شاہ صاحب کے تتبع میں اس حصہ کو پورا کرلیا ہے اور وہ میرے خواص علوم میں سے ہے۔

دو اور محسن کتابیں میری ایک محسن کتاب احکام القرآن ابوبکر رازی ہے اسلامی سیاست اجتماعی کے بعض ایسے مسائل جو حجۃ اللہ میں رہ گئے تھے میں اسی کتاب سے حل کرسکا۔

یورپ میں میری سیاحت کے لئے مولوی الیاس صاحب برنی کی علم المعیشت بھی ایک محسن کتاب ہے اگر یہ کتاب مجھے نہ ملتی تو میں کسی یورپین کے اقتصادی پروگرام کو سمجھنے کے قابل نہ ہوتا۔

شیراز ہند پورب[1]

اودھ، جونپور، اور بہار میں علم کی رفتار

از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

اسلام ایک ابر کرم تھا۔ اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن بعض بقدر استعداد پہونچا جس خاک میں جسقدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی:

ہندستان کی یہ فضائے بسیط بھی اس ابر کرم سے محروم نہ رہی۔ ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابر کرم کے چھینٹوں نے اوس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو بھی سرسبز و شاداب کر دیا۔ بحر ہند کے سواحل ملیبار و مدراس سے لیکر گجرات و کاٹھیاوار تک مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہو گئیں۔ دوسری طرف سندھ کی وادی اسکی فوج ظفر موج سے معمور ہو گئی۔ تیسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی اپنی سلطنت کی طرح ڈالی! اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا۔ اور اس کے تخت و تاج کا وارث وہ نامور ہوا جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں سے لیکر بحر ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا۔

سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پرشور کر دیا اور غزنی سے لیکر پنجاب تک یکلخت اسلام کی حکومت قائم کر دی۔ چھٹی صدی میں غوری آئے۔ تو انھوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیر نگیں کر دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہے جس میں نو کروڑ توحید کے حلقہ بگوش اللّٰہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان | جس طرح ہندوستان کو خراسان و ماوراء النہر و عراق و عجم کے

[1] حیات شبلی کا پہلا باب۔

تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا اسی طرح اوس کے دل ودماغ کو انھیں ملکوں کے ارباب کمال نے اپنا باج گزار بنایا تھا قطار در قطار علمائے بخارا ۔ بلخ ۔ سمرقند ۔ خوارزم ۔ عراق ۔ اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے اس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا اس لئے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا ۔ ملتان اور سندھ کے بعد ان کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوئی ۔ سلطان شمس الدین التمش نے جب ۶۰۷ھ میں دلی کو اسلام کا دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علما اسمٹ سمٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے ۔

غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ ۔ ۶۸۵ھ) کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی شمس الدین قوشجی برہان الدین براز ۔ نجم الدین دمشقی ۔ کمال الدین زاہد وغیرہ بیسیوں ارباب کمال تھے جن کے علم وفضل کی رونق سے دلی بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی ۔

علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ ۔ ۷۱۶ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری ۔ فرید الدین شافعی حمید الدین مخلص شمس الدین یحییٰ محی الدین کاشانی ۔ فخر الدین ہانسوی ۔ وجیہ الدین رازی ۔ تاج الدین مقدم ۔ وغیرہ چھیالیس علما دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیاء برنی جیسے مورخ کا بیان ہے کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔

محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ ۔ ۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی ۔ قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی ۔ مولانا خواجگی شیخ احمد تھانیسری ۔ جیسے باکمال تھے جن کے دامنِ تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی جونپوری پرورش پاکر ملک العلما بن کے نکلے[1]

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علماء کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ پہلے اگر بلخ ۔ بخارا ۔ کاشان ۔ توشنج (ترکستان) رے اور دمشق کے علماء کے نام تھے تو اب ملتان بھکر ۔ ہانسی ۔ دلی ۔ تھانیسر ۔ وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے ہیں ۔ ملتان تو اب بھی مشہور شہر تھے

---

[1] مضمون اسلامی نصاب درس مولانا سید عبدالحئی مرحوم الندوہ فروری ۱۹۰۹ء

بھکر نہ میں ہے۔ بانسی پنجاب کے موجودہ ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے۔ اور تھانیسر پانی پت کے پاس ہے۔

مورخ ضیاء برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ تا ۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علماء کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔

"در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علمائے بودند کہ اینچنان استادان کہ ہر یکے علامۂ وقت و در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و صفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشند و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و اصول دین و نحو و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موئے می شگافتند و ہر سالے چند طالبان علم ازاں استاداں برآمدہ بدرجۂ افادت میرسیدند و مستحق جواب دادن فتویٰ می شدند و بعضے ازاں استاداں در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند چنانکہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرپای و مولانا نصیر الدین غنی و مولانا تاج الدین مقدم و مولانا ظہیر الدین لنگ و قاضی مغیث الدین بیانہ و مولانا رکن الدین سنامی و مولانا تاج الدین کلاہی و مولانا ظہیر الدین بھکری و قاضی محی الدین کاشانی و مولانا کمال الدین کولی و مولانا وجیہ الدین پائلی و مولانا منہاج الدین قاینی و مولانا نظام الدین کلاسی و مولانا نصیر الدین کڑہ و مولانا نصیر الدین صابونی و مولانا علاء الدین تاجر و مولانا کمال الدین جوہری و مولانا حجت ملتانی قدیم و مولانا حمید الدین مخلص و مولانا برہان الدین بھکری و مولانا افتخار الدین برنی و مولانا حسام الدین سرخ و مولانا وحید الدین ملہو و مولانا علاء الدین کرک و مولانا حسام الدین ابن شادی و مولانا حمید الدین بنیانی و مولانا شہاب الدین ملتانی و مولانا فخر الدین ہانسوی و مولانا فخر الدین شاقلہ و مولانا صلاح الدین ستری و قاضی زین الدین ناقلہ و مولانا وجیہ الدین رازی و مولانا علاء الدین صدر الشریعہ و مولانا میران ماریکلہ و مولانا نجیب الدین ساوی و مولانا شمس الدین تم و مولانا صدر الدین گندک و مولانا علاء الدین لوہری و مولانا شمس الدین یحییٰ و قاضی شمس الدین گازرونی و مولانا صدر الدین تادی و مولانا معین الدین لونی و مولانا افتخار الدین رازی و مولانا معز الدین اندہپتی و مولانا نجم الدین انتشار و جیل و

شش استاذ مذکور کہ من القاب اسامی ایشاں نوشتہ ام آنانند کہ در پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ و بیشترے را در مسند افادت و در محافل و مجالس دیدہ و بسیاراں از شاگردان مولانائی شرف الدین پوشنجی۱؎ واستاداں یکدگر کہ من القاب ایشاں نیاوردہ ام در عہد علائی بر صدر حیات بودہ اند و دایم سبق میگفتند. در آخر عہد علائی مولانا علم الدین نبیرۂ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کہ جہان علم و عالم دانش بود در دہلی رسیدہ. و اگر من خواہم کہ درین تاریخ جملہ استاداں و متعلمانیکہ در محل استاذی رسیدہ بودند ذکر کنم تطویل انجامد و از غرض باز مانم. و افسوس ہزار افسوس کہ قدر و قیمت بزرگی و فضل آں استاداں سلطان علاء الدین نہ دانست کہ یک حق از صد حقوق ایشاں نہ گذاردہ و نہ معاصران عہد دانستند کہ خاک قدم آنچناں استاداں را در چشم جہاں بین خود کشند. و نہ من کہ مولف ام و در اں ایام خبرے از جلال و کمال ایشاں ادراک کردم و امروز کہ قرنی بیشتر گذشتہ کہ آں عدیم المثالاں بجوار رحمت رب العالمین پیوستہ اند. نہ بدرگاہ قرب حضرت بی نیازی ترقی کردہ و بعد از ایشاں نہ ہمچو ایشاں و نہ دہ ہزارم بجز ذات ایشاں مرا نہ دیگرے را نظر آمدہ بعضے کہ قدر و قیمت ایشاں دریافتہ ام کہ اگر در کمالات علوم و تفنن ہر یکے مجلدے بنویسم مقصر باشم در اں ایام کہ استاداں کہ ہر یکے ابو یوسف قاضی و محمد شیبانی عہد و عصر خویش بودند بر صدر حیات افادت میکردند اگر مفتی طمطراق استاذی بر سر کردہ از خراساں و ماوراء النہر و خوارزم و یا از شہرے دیگر در دہلی برسیدے و کمالات علوم بزرگان مذکور را مشاہدہ کردے سبق درست گرفتے و تلمذ پیش ایشاں بزانوے ادب در آمدے و اگر در حیات آں استاداں تصنیفے جدید ہر علمے کہ فرض کنند از بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق در شہر آوردندے کہ اگر استاداں شہر آں تصنیف را استحسان و اعتباری کردندی معتبر شدی و الا مہجور ماندے و مقصود از ذکر ایشاں در تاریخ علائی آنست کہ چہ عصرے و عہدے بود کہ در آں عہد و عصر چندیں متفننان نفایس علوم بر صدر حیات در افادت علوم مشغول باشد و چگونہ آں عصر مستثنائے عصرہا و آں شہر مستثنائے شہرہائے ربع مسکوں نباشد"

(فیروز شاہی برنی ص۳۵۳ تا ۳۵۵ کلکتہ)

۱؎ ملتانی

علم کا قافلہ پورب کو ان بزرگوں کی نسبت وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف اگر کاشان، قاین، رے، گازرون وغیرہ کے نامور تھے تو ان کے پہلو بہ پہلو اب ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، سنام، پٹیالہ، بیانہ (آگرہ کے پاس)، ہانسی (حصار پنجاب)، دلی، اندرپت (دہلی کے پاس)، کنتور (الہ آباد کے پاس)، کول (علی گڈھ)، پائل، سرکھ (بارہ بنکی) کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں یعنی علم کا قدم اب عجم سے بڑھ کر پورب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ ان بزرگوں کی عظمت وجلالت یہ تھی کہ ان میں سے ایک کو غزالی و رازی کا ہمسر مانا ہے جن کی توثیق وسند سے بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق کے اماموں کی تصنیفیں اعتبار اور مرتبہ پاتی تھیں۔

بدایوں غرض خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جارہی تھی۔ اسلام کے علم وفضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے حضرت سلطان الاولیا نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیاح معرفت ہیں جنھوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملادیا۔ اوس زمانہ میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (استاد نظام الاولیا) قاضی جمال الدین بدایونی ملتانی رکن الدین بدایونی۔ خواجہ نخشبی بدایونی وغیرہ ہیں۔ خواجہ نخشبی بدایونی جنھوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطے اڑائے ہیں، تصوف میں انکی دو کتابیں "سلک السلوک" اور "کلیات وجزئیات" ہمارے کتبخانہ میں ہیں۔

کڑہ بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کڑہ اب بھی ایک قصبہ ہے مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے مشرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا۔ سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بدنداں ہے اسی شہر میں دریا کے کنارے گذرا تھا۔ عہد علائی میں مولانا نصیر الدین کڑہ کا نام پڑھ چکے اور اسکے بعد مولانا مطہر کڑہ کا نام آتا ہے جنکے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڈھ کو ہاتھ آئے ہیں۔ یہ حضرت نصیر الدین اودھی چراغ دہلی کے مرید تھے۔

اودھ بدایوں اور کڑہ سے ملا ہوا وہ صوبہ ہے جس کو اودھ کہتے ہیں یہ اصل میں اس شہر کا نام تھا جس کو رام اور کرشن

۱؎ اخبار الاخیار ص ۸۱

کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا، اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا۔

دلی جس زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے وجود اقدس سے جگمگا رہی تھی۔ اوسکی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں۔ اس مطلع خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا اس کا نام شمس الدین یحیٰی اودھی ہے۔ یہ اودھ کے تھے اسی لئے اودھی کہلاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں اس تیرہ و تار دیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی۔ اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ہے

ان سے پہلے مولانا فرید الدین کا نام آتا ہے جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ مولانا فرید الدین اودھی اور ظہیر الدین بھکری کے شاگرد شمس الدین یحیٰی اودھی ہیں۔ اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی ہیں۔ اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلے جن سے اودھ کا خطہ چشمۂ نور بنا۔

سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں جو حضرت نظام الدین اولیا کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہے لکھتے ہیں۔

"مولانا علاء الدین نیلی کہ خلیفۂ سلطان المشائخ بود ..... در کشف غوامض کشاف و مفتاح مثل نداشت و در مجلس مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود۔ قاری کشاف خدمت مولانا علاء الدین (نیلی اودھی) بود و خدمت مولانا شمس الدین یحیٰی و علمائے اودھ سامع بودند" (ص ۲۷۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے عہد میں شیخ الاسلام اودھ کی درسگاہ میں اودھ کے علماء کا ایک انبوہ درس و تدریس میں مصروف تھا جنمیں سے تین نے خاص امتیاز پایا۔

۱۔ شمس الدین محمد بن یحیٰی اودھی — المتوفی سنہ ۷۴۷ھ

۲۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلی اودھی — المتوفی سنہ ۷۵۷ھ

۳۔ شیخ علاء الدین نیلی اودھی — المتوفی سنہ ۷۶۱ھ

اہل تذکرہ نے اس بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کے پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کے خلفا میں اودھ کے قصبہ گوپامؤ (سردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے۔ اودھ کے علما جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوا کہ راستہ میں ان سے ملتے جائیں سیرالاولیا کی عبارت یہ ہے۔

"دیاراں اودھ چنانچہ مولانا شمس الدین یحیٰی و شیخ نصیرالدین محمود و مولانا علاءالدین نیلی وعزیزاں دیگر چوں از خدمت سلطان المشائخ بازی گشتند فرمان می شد چوں در گوپامؤ رسید خواجہ مبارک را بہ بینید (ص ۲۳۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگوار گوپامؤ (ہردوئی) کے ادھر ہی کے کسی مقام کے رہنے والے تھے۔

اودھ سے اصل مقصود تو اجودھیا ہے۔ ان کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (ص ۱۹) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ۸۵۳ھ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں۔ ان میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھہ ہے جس کو حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ کے خوابگاہ بننے کی عزت حاصل ہے۔

قنوج اور کٹرہ | دلی اور ممالک پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا۔ اس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کٹرہ (الہ آباد) تھی۔ ممالک پورب کے دونوں بازوں پر یہ دو شہر آباد تھے۔ ان دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہوجاتی تھی۔ قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہت اور پورنیہ ہوکر بنگال۔ اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کٹرہ سے پار ہوکر جونپور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھ کر بنگال یہی دونوں راستے آج بھی ہیں۔ ایک پر۔ ای۔ آئی۔ ریلوے ہے۔ اور دوسری پر بی۔ این۔ ڈبلو۔

ظفرآباد اور جونپور | سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دور سے ہندوستان کے مغربی اور شرقی حصوں میں

---

[1] خلجی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ (لکھنؤ کی) منزلیں تاریخوں میں پڑھیے۔

اتصال بڑھتا گیا، سلطان خود بنگال تک گیا، واپس آیا اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفر خان اور دوسرے کا فخر الدین جونا تھا۔ پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفر آباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) نے جونپور آباد کیا[1]۔ یہ آبادی ۷۶۱ھ سے پہلے ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس سال سلطان فیروز شاہ نے بنگال سے لوٹ کر جونپور میں قیام کیا تھا[2]۔

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جونپور و ظفر آباد کے حلقہ میں اسلامی نوآبادیوں نے وسعت پائی۔

ملک پورب و مشرق | ۷۹۶ھ[3] میں خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جونپور کو اپنا مرکز بنایا۔ اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں۔ اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملے گا۔

"در عرصہ جونپور رفت۔ بآہستگی اقطاع قنوج وکٹرہ (الہ آباد) واودھ وسندیہ (سندیلہ) ودلمؤ وبہرائچ و بہار وترہت را در قبض وتصرف خود آورد۔" (ص ۱۵۷ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج، بہرائچ، اور الٰہ آباد سے لیکر بہار اور ترہت (مظفر پور و دربھنگہ وغیرہ) تک ملک پورب کی وسعت تھی۔ آٹھویں صدی سے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں۔[4] بدر الدین اودھی۔ تاج الدین کٹرہ۔ جلال الدین اودھی۔ شیخ دانیال ستر کھ (بارہ بنکی اودھ) رکن الدین کٹرہ۔ رکن الدین ظفر آبادی (جونپور) رکن الدین بہاری۔ زین الدین دیوہ (بارہ بنکی) قاضی سماء الدین بجنور (بارہ بنکی) صلاح الدین ستر کھ (بارہ بنکی) علاء الدین اودھی۔ علاء الدین سندیلہ۔ قاضی فخر الدین ستر کھ۔ شیخ مبارک گوپاموٗ (اودھ) شیخ محمد معروف امیٹھی (اودھ) شیخ منہاج الدین بہاری۔ مخدوم شیخ شرف الدین منیری بہاری وغیرہ۔

[1] آئین اکبری جلد ۲ ص ۱ نولکشور [2] مبارک شاہی ص ۱۲۵ کلکتہ [3] فرشتہ میں ۷۸۶ھ [4] یہ نام نزہۃ الخواطر مولانا سید عبد الحی مرحوم جزو ثانی ثامنہ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد سے چنے گئے ہیں۔

خواجہ جہاں نے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا اور اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے خودمختارانہ جلوس کیا یعنی نویں صدی ہجری کے آغاز سے پورب کی آزاد خودمختار سلطنت کی بنیاد پڑی مبارک شاہ ۸۰۴ھ میں مرگیا اور اب اسکی جگہ پر ابراہیم شاہ شرقی بیٹھا جو اس خاندان کا سب سے بڑا نامور فرمانروا گذرا ہے۔ اس نے جونپور میں چالیس برس حکومت کرکے ۸۴۴ھ میں وفات پائی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں لاہور ملتان اور دلی سے علم کا مرکز منتقل ہوکر پورب کے اطراف میں آیا گو اس حکومت نے اس کے بعد صرف چالیس برس اور زندگی پائی یعنی ۸۸۳ھ میں بہلول لودی کے ہاتھ سے یہ مٹ گئی۔ اور یہ زمانہ بھی شرقی بادشاہوں کی جنگجوئی اور دلی کے لودی بادشاہوں کے دست برد سے امن وچین سے نہیں گذرا تاہم علم وفن کی جو شمعیں روشن تھیں وہ سیاسی حوادث کی ان آندھیوں سے نہ بجھیں بلکہ انکی روشنی روز بروز اور تیز ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ تیموریوں کے عہد میں یہ خطہ اور سراپا نور بن گیا۔ شاہ جہاں فخریہ کہا کرتا تھا کہ "پورب شیراز ماست" علامہ آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ پورب کی وسعت میں تین صوبے تھے۔ صوبۂ الہ آباد، صوبۂ اودھ، اور صوبۂ عظیم آباد، مغلوں سے پہلے اودھ اور جونپور ایک ساتھ بولے جاتے تھے اور قنوج سے لیکر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جونپور دونوں شامل تھے۔ اور دوسرا صوبہ کڑہ یعنی الہ آباد کا تھا جس میں گنگ کے اس پار کا علاقہ موجودہ کانپور سے لیکر کڑہ مانک پور، فتحپور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گذرتا ہوا غازیپور تک کا علاقہ شامل تھا صوبۂ عظیم آباد موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔

یادِ ایّام

(۲)

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات عربیہ الہ آباد

سُنے ہوں گے بہت قصے مگر وہ سب تھے افسانے
یہ میری آپ بیتی اور خود میری زبانی ہے

عام جلسہ کا افتتاح

پرانے دارالعلوم واقع گولہ گنج کی عمارت میں بڑے ہال کے سامنے ایک بہت بڑا قطعہ اراضی کا دکن جانب تھا جسمیں، ہمارے داخلہ کے وقت جوار کا کھیت تھا وہ کھیت صاف کیا گیا اور وہیں باقاعدہ شامیانہ نصب ہوا سوال یہ پیدا ہوا کہ علماء صوفیاء کرام کرسیوں پر بیٹھنا گوارہ نہ کریں گے، انگریز کو بلانا ہے وہ تو کرسی ہی پر بیٹھے گا اور اس کے ساتھ علماء اور دنیا داز اکبر نے اسوقت یہ شعر نہیں کہا تھا.

ادھر یہ ضد ہے کہ لمینڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا

غرض سمجھوتہ یہ ہوا کہ ایک چبوترہ ہال کے سامنے اتنا بلند بنایا جائے کہ کرسیوں کی سطح کی برابر ہو جائے، اسی (چبوترے پر بعد کو ایک اور ہال اور برآمدہ تعمیر ہوا) کہ کمشنر صاحب بھی نیچے نہ پڑیں اور صحن کو کسیقدر گہرا کرکے اسمیں کرسیاں ڈالدی جائیں چنانچہ یہ تجویز منظور ہوئی اور بیلدار اس خدمت پر معین ہو گئے فراشوں کے دونوں جگہوں دریاں اور قالین بچھائے اور دوسرے شامیانے کھڑے کر دیئے غرض پنڈال چمنستان بن گیا عصر کے بعد جلسہ شروع ہوا اور نجانے کب ختم ہوا ہم تو آٹھ بجتے بجتے سو گئے تھے جب صبح کو آنکھ کھلی تو کل کار روائی ایک خواب نظر آتی تھی. اسوقت تک صرف میں طالب علم دارالاقامہ میں تھے۔ ایک چکن کا کرتہ سبز وبیزکی صدری سر پر سفید بنارسی ٹپکے کا عمامہ پاؤں میں دہلی کا کامدار جوتہ پہنکر ہم پورے مولوی بن گئے کبھی پہلے یہ لباس کا ہیکو پہنا تھا کمشنر صاحب بعد عصر تشریف لائے نماز مغرب اسی چبوترے پر ادا ہوئی بعد مغرب ہم لوگوں کا استادی مولٰنا حفیظ اللہ صاحب نے پیش کیا ہم سب کا لباس لنبا کرتہ سبز صدری اور سفید عمامہ تھا اور مولٰنا ایک سیاہ عبا در بر اور سفید عمامہ بر سر تھے

خدا بخشے ہمارے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ اس جلسہ میں موجود تھے مولانا سے انسے بڑی بے تکلفی تھی انھوں نے آخر انڈے بچے والی مرغی کی ابنر کہی ڈالی۔

دارالعلوم

حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء سب سے اوپر کے کوٹھے پر رہتے تھے اس کے سامنے ایک بڑی بھاری چٹائی بھی (جبکہ ہماری انجمنوں کے جلسے اکثر وہیں ہوتے تھے اور علامہ شبلی مرحوم نے بھی اسی کو اپنی قرارگاہ بنا لیا تھا) وہیں سے حضرت تعلیم اور جملہ انتظامات کی رہبری فرماتے تھے انکی نفاست ظاہری اور نفاست طبع کا کیا کہنا حضرت شاہ ابو الخیر صاحب دہلویؒ کے علاوہ کسی اور میں یہ بات نہ دیکھی انکی تعلیمی رہبری پر حیرت ہے نیچریوں کے سایہ سے گریز تھا سید احمد خاں کی تفسیر کا رد لکھا تھا مولویانہ نہیں بلکہ نہایت دقیق اور ناقدانہ مناظرہ کا خاص سلیقہ تھا ۸۰ برس کی عمر میں مونگیر میں جبکہ دماغ بیحد ضعیف ہو گیا تھا اور بعض اوقات تو الفاظ بھی سمجھ میں نہ آتی تھی اسوقت بھی قادیانیوں کے رد کا تحریری سلسلہ جاری تھا۔

مولانا حفیظ اللہ صاحب مفتی صاحب مولانا عبدالشکور صاحب (النجم والے) عربی کے مدرس تھے منشی محمد علی مرحوم گنتی پہاڑے اور حساب سکھاتے تھے منشی واجد علی مرحوم لکھنوی خوشنویسی کراتے اور فارسی پڑھاتے تھے اور اگر کوئی طالب علم سلام علیکم کہدیتا تو بہت خفا ہو کر کہتے کہ یہ کیا جولاہوں کا طریقہ سلام کا سیکھا ہے طلبہ انکے درجہ میں انکو بندگی ہی عرض کرتے بعض طالب علم باہر کے اونچی کتابیں پڑھنے والے بھی تھے ان میں خود ناظم صاحبؒ کے مرحوم صاحبزادے مولوی احمد علی مرحوم اور مولوی منظور النبی سہارنپوری تھے۔ ہماری ابتدا اتنی کھیلتے بھی اور پڑھتے کبھی ایک مرتبہ دن میں حضرت ناظم صاحبؒ کے پاس ضرور جاتے وہیں جتنی کتابیں رکھی ہوتیں انکو الٹتے پلٹتے اور وہ انکے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتے ضرور۔ اقرب الموارد شرتونی کی پہلے پہل جب ہی دیکھی تھی کبھی کبھی کوئی مصدر لیکر اسکی گردان یا کسی صیغے کی تعلیل بھی کرا لیتے مگر اس سزا کو بھگت کر ہم وہاں سے فوراً ایک دو تین ہو جاتے یہ واقعہ ہے کہ جب فیضان ربانی شروع ہو جاتا ہے اور علم لدنی کی رو جاری ہو جاتی ہے تو ذہن بلا تکلف و شعور معاملات میں

جدوجہد ریغ کرتا ہے صحیح جاتا ہے۔ اصلاح نصاب کا خاکہ اس درس نظامیہ کے پڑھے ہوئے انسان کے ذہن میں فن دانی
متقدمین کا طرز تعلیم اور طریقہ املا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود حضرت کے استاد مفتی عنایت احمد صاحبؒ بھی
فن دانی کے گرویدہ تھے علم الصیغہ سی جامع اور مرتب کتاب محض ذہن سے کالے پانی میں جہاں بالزام بغاوت
غدر کے بعد وہ بھیج دیئے گئے تھے لکھ ڈالی خود فرماتے ہیں "درود حقیر دراں جزیرہ از نیرنگ تقدیر بودہ وہیچ کتابے
شل.......... نزد خود نداشتم" صرف تو صرف تاریخ حبیب الہ بھی یوں ہی لکھی تھی۔ لہٰذا اب
جب تعلیم شروع ہوئی تو ابتدائی درجوں کے متعلق حضرت کے ارشادات اور ہدایات بھی شروع ہوئے ہمارے مولانا
عبدالشکور صاحب قبلہ تو کچی لکڑی تھے حضرت مولانا عین القضاۃ صاحبؒ کے یہاں کے سب سے ذہین مستعد اور
منتہی طالب علم کس باپ کے بیٹے تھے تحصیلدار حافظ ناظر علی صاحب جنکی بالمعیت اور مراتب کی ادنیٰ تفصیل یہ ہے
کہ حضرت سیدنا شاہ ابوالخیر صاحب دہلویؒ کو کہتے سنا ہے کہ ارے میاں انھوں نے تو حضرت جبرئیلؑ کی بھی زیارت
کی ہے مولنا کا دل حضرت ناظم صاحبؒ کی طرف متوجہ تھا اور وہ ان کے ہدایات کو قبول کر لیتے ہمارے مالا بدمنہ
کی تعلیم کے دور میں جو املا کراتے وہی دراصل آگے چل کر بڑا ہو کر علم الفقہ بنکر چمکا۔ جناب مفتی عبداللطیف صاحب
ندوۃ العلماء کے دارالافتاء کے مالک تھے (اس ضرورت سے ندوہ کا کتب خانہ بھی بڑا ہو گیا تھا) فقیہ اور فقہ
جامع پر نظر وسیع ویسے بھی مدرس زوردار تھے مولنا مفتی لطف اللہ صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے شفقت
بھی فرماتے مگر "تنبیہ الغافلین" کے بہت بڑے عامل تھے مولانا حفیظ اللہ صاحب صاحب علم و فضل تھے بنا بھی اچھا تھا
علم مجلس میں اپنے ہم چشموں میں سب سے بالا درسیات کے ماہر تقریر کتابی نہایت درجہ منجھی ہوئی۔ دربار رامپور
دیکھے ہوئے مدرسہ عالیہ چلائے ہوئے مولانا عبدالحق خیرآبادی ایسے علامہ اور گھاگ کو نیچا دکھا چکے تھے انتظام اور
رعب غضب کا بڑے بڑے ندوی اُن سے اب بھی ڈرتے ہیں۔ مگر درسیات سے باہر قدم رکھنا انکی شان اور مذاق
کے خلاف تھا۔ حضرت مولنا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کے چوٹی کے شاگرد تھے اور خود مولنا کو انپر اتنا اعتماد تھا
کہ اپنے خویش اور بھتیجے مفتی محمد یوسف مرحوم کی تعلیم کے لئے انہیں کا انتخاب کیا تھا۔ اور مفتی میر عباس صاحب

سے پڑھی تھی ایک مرتبہ کوئی مدرس خالی نہ تھا، قصیدے سبعہ معلقہ کے پڑھا دئے۔ پڑھا سب کچھ سکتے تھے۔ تحریر ایسی کہ ایک مرتبہ حضرت استاد علامہ سے اشاعرہ کے متعلق کچھ بحث آگئی خود علامہ کی فرمایش پر ایسا مضمون لکھ ڈالا کہ وہ فرماتے تھے کہ مضمون برابر زور دار، گرفت سے پاک ہے پھر وہ کسی وجہ سے الندوہ میں شایع نہیں ہوا۔

یہ سب تھا مگر اس جوپائے اصلاح نصاب کے کام کے یہ لوگ نہ تھے۔ اکثر یہ مشورے ہمارے گھر میں بیٹھکر ہوتے اس لئے میں ان سے واقف رہتا تھا۔ تمام لوگوں پر نظر دوڑائی گئی آخر میرے حقیقی محسن اور حقیقی اُستاد حضرت علامہ زمانہ مولانا محمد فاروق صاحب عباسی چریاکوٹی پر نظر گئی جو کتنے مدرسی اور وکالت کے چکر کھا کر اسوقت مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں مقیم تھے اب حضرت مولانا کا سن ڈھل چکا تھا مگر نیستان علم کے شیر تھے وارفتہ مزاج تھے ہر قاعدے اور قانون سے بری اور محکومیت سے آزاد رہنا چاہتے تھے باوجود ان سب باتوں کے ناظم صاحبؒ نے اپنی افتاد طبیعت کے خلاف ان کا بلانا منظور کیا۔ مدرسہ کا انتظام دارالاقامہ اور سب کچھ مولانا حفیظ اللہ صاحب جانیں وہ آزاد رہ کر جو چاہیں کریں جو چاہیں پڑھائیں انکی شان علم کو سب کچھ شایاں ہے یہی آخری فیصلہ ہوا چنانچہ وہ صدر مدرس بنکر آئے اور مولانا تعلیمی امور میں انکی ہدایات کے پابند مگر با اختیار مہتمم باقی رہے۔ اب دور فاروقی شروع ہوتا ہے میں دارالعلوم کی علمی روایات کی نشو ونما کے بیان میں اتنا مصروف ہو جاؤں گا کہ یہ ذکر کر دینا ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے ناظم صاحبؒ کو جسمانی تربیت کا اپنے طلبہ کی بہت خیال تھا چنانچہ یہ تجویز ہوا کہ مغلی ورزشیں شروع کرادی جائیں اتفاق سے کاکوری کے ایک صاحب منشی شمس الدین جو اس فن کے استاد اور لکھنؤ کی اصطلاح میں بانکے اور اکھاڑے الٹے ہوئے تھے اس خدمت کیلئے تجویز ہوئے اور شام کو طلبہ ایک جانگیہ جو در اصل نیکر تھی اور ایک شلوکہ جو آستین دار صدری تھا پہنکر اُن سے یہ کرتب سیکھتے اور آپس میں مشق کرتے منشی شمس الدین بڑی محبت کے آدمی تھے کھانا دال روٹی اور گوشت اور صبح کو ایک روغنی یہ منظور شدہ سب کو ایک دسترخوان پر دارالطعام میں کھلا دیتے۔

بڑی بے انصافی ہو گی اگر اس سلسلہ میں میں منشی محمد علی مرحوم محاسب ندوہ کا ذکر نہ کروں طلبہ کے لئے بھلائی

تھے بڑے خوش خلق تھے اور زندہ دلی انپر ختم تھی مدرسین اور طلبہ ان کو ہر وقت گھیرے رہتے۔ اس یارباشی میں ساری تنخواہ ہیں صرف ہوجاتی حضرت مولنا لطف اللہ صاحبؒ کے عزیزوں میں تھے اور ناظم صاحب کیا ہر ایک کو انپر اعتماد تھا دفتر مولویانہ تھی تدلینا اور ہاتھ پاؤں بڑے بڑے ان کا کیسٹرا بنانا ذرا مشکل تھا۔ ان کا گھنٹہ حساب کا آخر میں ہوتا تھا یعنی تین بجے کے بعد لہذا ہم نظر بچا کر کبھی کبھی چلدیتے کبھی تو راہ سے گرفتار ہوکر آتے اور کبھی دوسرے دن پھر وہ ایک عدد لیٹر پندرہ دن کیلئے کافی ہوجاتا۔

(باقی)

ابتدائی حدیث کا تحریری سرمایہ

از عبدالسلام قدوائی

اکتوبر ۱۹۴۰ء کے ندوہ میں محدثین کے حیرت انگیز حافظے کے عنوان سے مولانا احمد اللہ صاحب ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا اس سلسلہ میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ حدیث کے تحریری سرمایہ کے متعلق ایک مضمون شائع کریں گے ذیل کے سطور اسی وعدہ کا ایفا ہیں۔ اب سے پچیس تیس برس پہلے مخالفین اسلام نے اس خیال کو بڑی شد و مد سے پیش کیا کہ تیسری صدی ہجری سے پہلے پہلے لوگوں کے حافظے سے باہر حدیثوں کا تحریری شکل میں کہیں وجود نہ تھا لیکن دین کے محافظوں نے پوری قوت سے ان اوہام کی تردید کی اردو میں سب سے پہلے غالباً مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ میں ان شبہات کے جواب دئے ہیں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے خطبات مدراس میں اس سلسلہ کی جانب بہت خاص توجہ فرمائی ہے۔ مولانا محمد علی لاہوری اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے مقام حدیث اور تدوین حدیث کے عنوان سے اچھے رسالے لکھے ہیں حال میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے التیسیر الحثیث اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث کے نام سے اچھے خاصے رسالے لکھے ہیں لیکن ابھی اس خاص مسئلہ پر اور لکھنے کی ضرورت ہے ذیل کی سطور اسی ضرورت کا احساس ہیں امید ہے کہ یہ مختصر تحریر اس موضوع پر بہت سے مفصل مضامین کا پیش خیمہ ہوگی۔ "سلام"

عہد رسالت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کا مجموعہ قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حدیث کی کتابوں میں مندرج ہیں۔ اس لئے مسلمانوں نے قرآن مجید

کے حفظ و ضبط اور تحریر و ترویج کے ساتھ احادیث کی نشر و اشاعت اور حفاظت و صیانت کی جانب خاص توجہ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح آج سیکڑوں برس گزرنے کے بعد قرآن مجید ہر قسم کے تغیر و تبدل اور تحریف و تبدیل سے پاک ہے اسی طرح غیر معمولی صحت و صداقت کے ساتھ ہزاروں حدیثیں اوراق و صحف میں محفوظ ہیں سچ تو یہ ہے کہ آخری دین کامل شریعت اور دائمی نمونۂ عمل کے لئے ایسے ہی حفاظت کی ضرورت تھی تاکہ قیامت تک کسی شک و شبہ کی گنجایش نہ ہو اور خدا کا آخری دین ہمیشہ نوع انسانی کے لئے نمونۂ عمل رہے یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن مجید کے ساتھ احادیث کی جانب بھی شروع ہی سے توجہ رہی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا خاص خیال تھا صحابۂ کرام کو قرآن مجید کی آیتیں سناتے ان کے معانی و مطالب سے آگاہ فرماتے اور اسلامی احکام کی تشریح کرتے، اجمال کی تفصیل کرتے، ابہام کی وضاحت فرماتے اور پیچیدہ سوالات کا جواب دیتے صحابۂ کرام آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو یاد رکھتے، خود بھی اس پر عمل کرتے اور دوسروں تک بھی اسے پہونچاتے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ بلغوا عنی ولو آیة، فلیبلغ الشاھد منکم الغائب[1]، ونضر اللہ امرء سمع منا حدیثا فحفظه وبلغه غیرہ الخ، صحابۂ کرام نے اس پر پورا عمل کیا ارشادات نبوی کو سننے اور انھیں یاد کرنے کا اس درجہ اہتمام تھا کہ بہت اصحاب نے دنیا کے سارے علائق کو چھوڑ رکھا تھا اور شبانہ روز اسی میں وقت گزارتے تھے اصحاب صفہ کا پورا گروہ اسی قسم کا تھا یہ لوگ گھر بار کی فکروں اور بال بچوں کی ذمہ داریوں میں مبتلا نہ تھے ان کا یہی کام تھا کہ جہاں تک ہو سکے آنحضرت سے استفادہ کریں ان بزرگوں کے علاوہ جن لوگوں کو روزمرہ کی خانگی ضرورتوں کی بنا پر اس کا موقع نہ تھا وہ آپس میں باری مقرر کر لیتے تھے اور ہر شخص اپنی باری کے واقعات اپنے ساتھی کو سناتا تھا[2]۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں یہی طریقہ رہا کہ لوگ حدیثیں زبانی یاد کرتے اور اسی طرح دوسروں کو پہونچاتے تھے اس

[1] بخاری کتاب العلم باب لیبلغ العلم الشاھد الغائب۔

[2] بخاری کتاب العلم باب التناوب فی العلم

دوہ میں قرآن مجید کے سوا ہر چیز کے لکھنے کی ممانعت تھی مقصود یہ تھا کہ کلام الٰہی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہے اور آیت الٰہی کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ ہونے پائے

بعد کو جب اسلام لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوگیا اور قرآن مجید کا کافی حصہ نازل ہوچکا اور اس کا کوئی خوف نہ رہا کہ حدیث کے الفاظ قرآن مجید میں مل جائیں گے اور تحریف کا امکان پیدا ہوجائے گا تو پھر کتابت حدیث کی اجازت دیدی گئی حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کی منہ روایت ہے۔

کنت اکتب کل شئی اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فنھتنی قریش وقالوا اکتب کل شئی تسمعہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیکلم فی الرضا والغضب فامسکت عن الکتاب فذکرت ذلک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاومی باصبعہ الی فیہ وقال اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا الحق لہ	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کے ارادہ سے لکھ لیا کرتا تھا قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے ہو سب لکھ لیتے ہو حالانکہ آپ خوشی میں باتیں کرتے ہیں اور کبھی غصہ کی حالت میں یہ سُن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا پھر آنحضرت سے اسکا ذکر کیا آپ نے اپنے دہن مبارک کیطرف اشارہ کیا اور فرمایا لکھو خدا کی قسم اس سے حق ہی نکلتا ہے

غرضکہ اس طرح عہد رسالت ہی میں سینوں کی امانت سفینوں میں منتقل ہونے لگی اور احادیث کا اچھا خاصہ حصہ کتابی شکل میں مرتب ہوگیا حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کا اوپر ذکر ہوچکا ہے ان کا حال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اس طرح انھوں نے ایک اچھی خاصی کتاب تیار کرلی اس کتاب کا نام انھوں نے صادقہ رکھا یہ صحیفہ انھیں بیحد عزیز تھا وہ فرمایا کرتے تھے

ما یرغبنی فی الحیاۃ الا خصلتان الصادقہ والوھط لہ	مجھے زندگی کی خواہش صرف دو چیزیں صادقہ اور وہط دلاتی ہیں۔

لہ جامع ص۳۶ لہ جامع ص۳۷ لہ ایک زمین کا نام ہے۔

صادقہ کا یہ نسخہ عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا اُن کے پوتے عمرو ابن شعیب کے پاس لوگوں نے اسے دیکھا اور ذکر کیا ہے[۱]

حضرت علیؓ نے بھی آنحضرتؐ سے سنکر کچھ روائتیں لکھ لی تھیں جو ان کے پاس کتابی شکل میں موجود تھیں[۲]

حضرت انسؓ نے بھی کچھ حدیثیں قلمبند کی تھیں یہ مجموعہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی ان کے پاس موجود رہا چنانچہ جب لوگ زیادہ جمع ہو جاتے تو وہ اسے نکال کر انھیں دکھاتے تھے[۳]

یہ تو چند خاص اصحاب کی تحریری کوششوں کا ذکر تھا لیکن کتابت وتحریر کا کام صرف اسی حد تک محدود نہ تھا بلکہ آنحضرتؐ کی مجلس مبارک کا عام دستور تھا دارمی کی مشہور روایت ہے۔

عن ابی قبیل قال سمعت عبد الله قال بینما	ابو قبیل کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرت عبد اللہ سے سُنا
نحن حول رسول الله نکتب اذ سئل رسول الله	کہ وہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
صلی الله علیه وسلم ای المدینتین تفتح اولا	لکھ رہے تھے کہ اتنے میں آپ سے دریافت کیا گیا [illegible]
قسطنطنیة او رومیة فقال [illegible] صلی الله علیه	دونوں شہروں میں سے پہلے کون فتح ہوگا قسطنطنیہ یا رومیہ
وسلم لا بل مدینة هرقل[۴]	اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ ہرقل کا شہر۔

حضرت ابوہریرہ کا بھی ایک اسی قسم کا بیان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں حدیثوں کی روایت کے قلمبند کرنے کا عام رواج تھا[۵]

صحابہ کرام کی ان تحریری کوششوں کے علاوہ آنحضرت صلعم بھی بعض ضروری احکام وہدایات لکھوا دیا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے سال میں خزاعہ کے کچھ لوگوں نے بنی لیث کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا رسول اللہ صلعم کو اسکی خبر دی گئی تو آپ نے سواری پر سوار ہو کر ایک خطبہ دیا جس میں مکہ معظمہ کی عظمت وحرمت کا ذکر فرمایا اور لوگوں کو قتل وخونریزی سے باز رہنے کی ہدایت کی ایک یمنی صحابی (ابو شاہ) نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ یہ خطبہ مجھے لکھ دیجئے

---

۱ تہذیب جلد ۸ صفحہ ۴۹ ۲ بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم ۳ تقیید العلم صفحہ ۱۰ ۴ دارمی صفحہ ۶۸ ۵ خطبات مدارس بحوالہ مسند احمد بن حنبل جلد ۱۲

آنحضرتؐ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور یہ خطبہ ان کو لکھوا دیا۔[۱]

حضرت معاذ بن جبلؓ جب یمن کے گورنر مقرر کئے گئے تھے تو روانگی کے وقت آنحضرت صلعم نے انھیں اسلامی مسائل سے متعلق ضروری ہدایات دین اور نظائر و اشباہ پر قیاس اور استنباط مسائل کی تعلیم فرمائی لیکن بایں ہمہ یمن میں انھیں بہت سی باتیں دریافت طلب محسوس ہوئیں چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق آنحضرت صلعم سے لکھ کر دریافت کیا جس کے جواب میں آپ نے انھیں ایک تحریر بھیجی دارقطنی نے اس واقع کو تفصیل سے لکھا ہے[۲]

اسیطرح عبداللہ بن الحکیم ایک دوسرے صاحب نے انھیں مردہ جانوروں کے احکام کے متعلق ایک تحریر لکھی تھی[۳]

وائل ابن حجر مشہور صحابی ہیں جب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوکر اپنے وطن حضر موت واپس جانے لگے تو رسول اللہ صلعم نے نماز روزہ سود شراب وغیرہ سے متعلق اسلامی احکام لکھکر ان کے حوالہ کئے[۴] حضرت عمرو ابن حزم کو جب یمن کا حاکم بنا کر روانہ کیا تو انھیں فرائض صدقات ودیات کے متعلق ایک تحریر لکھ کر حوالہ کی[۵] بعض امراکو زکوٰۃ کے احکام بہت تفصیل سے لکھکر بھیجے یہ تحریر حضرت ابوبکرؓ بن عمرو ابن حزم اور ان کے بعد اُن کے خاندان کے لوگوں کے پاس عرصہ تک محفوظ رہی چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانہ میں یہ تحریر اُن کے خاندان کے یہاں برآمد ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے پاس کچھ صدقتیں لکھی ہوئی رکھی تھیں آپکی وفات کے بعد آپکی تلوار کی میان میں وہ صحیفہ روایات پایا گیا[۶]

یہ تو چند تحریروں اور مشہور صدیثوں کے مجموعوں کا ذکر تھا اس کے علاوہ مختصر طور پر صحابہؓ کو خاص ہدایات خطوط لکھ کر بھیجے۔ مدینہ منورہ کی مردم شماری کے کاغذات، قبائل کے نام ہدایت نامے، امراء وولاۃ کے نام احکام

---

۱ بخاری جلد اول کتاب العلم باب کتابۃ العلم ۲ دارقطنی ص ۲۵ ۳ خطبات مدارس بحوالہ طبرانی صغیر ص ۲۱۷

۴ خطبات بحوالہ کنز العمال جلد ۳ ص ۱۸۶ ۵ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ اور دارقطنی ص ۲۰۵ جلد ۲

۶ جامع بیان العلم ص ۳۲

سلاطین و اقوام عالم کے نام اسلام کے دعوت نامے، صلح نامے، معاہدے، امان نامے سینکڑوں ہزاروں ملتے ہیں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں اور خود آپ کی رہنمائی میں تحریری شکل میں مرتب ہوگئی تھیں، و مختلف صاحبوں کے پاس محفوظ تھیں۔[1]

عہد صحابہؓ

عہد صحابہ میں ان تحریری کوششوں میں اور اضافہ ہوا جن بزرگوں نے عہد رسالت میں اپنی روایتیں کتابی شکل میں مرتب نہیں کی تھیں اب انھوں نے بھی اس جانب توجہ کی حافظے کتابت کی شکل اختیار کرنے لگے اور سینوں کی امانت سفینوں میں منتقل ہونے لگی خلافت راشدہ کے ابتدائی عہد میں کچھ دن ارتداد کے ہنگاموں نے اس کا موقع نہ دیا لیکن جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو قرآن مجید کے ساتھ حدیث کی جمع و ترتیب کی جانب بھی توجہ ہوئی بعض صحابہ کو شروع میں تامل رہا جسکی وجہ ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی ابتدائی ارشاد تھا کہ

لاتکتبوا عنی شیئا سوی القرآن فمن کتب عنی شیئا سوی القرآن فلیمحہ[2]	مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو جس شخص نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہو اسے چاہئے کہ اس کو مٹادے۔

جن صحابہ کو اس کا نسخ نہیں پہونچا تھا وہ پرانے حکم کی بنا پر کتابت حدیث کے قائل نہ تھے بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ اس طرح حفظ و ضبط کی طرف توجہ کم ہو جائیگی اور سفینوں کا علم سینوں کو خالی کر دیگا۔ آئندہ صرف تحریریں رہ جائیں گی جن کے پس پشت حافظہ کی قوت نہ ہوگی کہ غلطیوں کی تصحیح ہو سکے اور صرف اضافہ کا پتہ چل سکے اس طرح خطرہ تھا کہ تحریف کے دروازے کھل جائیں گے اور منافقین، یہود اور دوسرے مخالفین کو روایات

---

[1] اس موضوع پر خطبات مدارس کا تاریخی خطبہ قابل ملاحظہ ہے مولانا نے اس میں اس قسم کے بہت سے جزئی واقعات جمع کر دئیے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط اور معاہدے تحریری شکل میں اس وقت بھی موجود ہیں۔

[2] جامع بیان العلم ص ۳۲

میں تغیر و تبدل، حذف و اضافہ اور زیادتی نقصان کا موقع مل جائیگا اور دین کی بنیادوں میں رخنہ اندازی کی راہیں کھل جائیں گی، ان وجوہ کی بنا پر کچھ دن تک لوگوں کو تذبذب رہا لیکن جب اسلام کی قوت میں اضافہ ہوا اور اس جانب سے اطمینان ہوا تو قرآن مجید کی طرح رفتہ رفتہ حدیثیں بھی کتابی شکل اختیار کرنے لگیں لیکن حفظ و ضبط پر اب بھی زور دیا جاتا تھا اور حافظہ کے بغیر کتابیں دیکھ دیکھ کر روائتیں بیان کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں تحریری مجموعوں کو کوئی غیر معمولی اہمیت حاصل نہ ہوسکی تاہم اب اسکی ضرورت عام طور سے محسوس کی جانے لگی تھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صحابۂ کرام کتابت حدیث کی ضرورت و اہمیت پر متفق ہوچکے تھے حضرت عروہ کا بیان ہے۔

ان عمر ابن الخطاب اراد ان یکتب السنن	حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ حدیثیں لکھ لی جائیں صحابہ
فاستفتی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ	سے مشورہ کیا انھوں نے لکھنے کی رائے
وسلم فی ذالک فاشاروا علیہ ان یکتبہا[1]	دی تھی۔

حضرت عمرؓ کا خود خیال ہی ہورہا تھا کہ احادیث و سنن کتابی شکل میں جمع کر دی جائیں لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ فسخ کر دیا کہ کہیں اس کی وجہ سے قرآن مجید کی جانب سے بے توجہی نہ ہوجائے لیکن بعد کو یہ شبہ جاتا رہا اور اسکی ضرورت بالکل واضح ہوگئی تو حکم دیدیا قیدو العلم بالکتاب[2] علم کو احاطہ تحریر میں لاؤ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی پانچسو حدیثوں کا ایک مجموعہ اپنی زندگی میں مرتب کیا تھا۔ جو حضرت عائشہ کے پاس رکھا ہوا تھا انتقال کے وقت خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مجموعہ میں میں نے اپنے اطمینان پر کچھ ایسی روائتیں لکھ لی ہوں جو صحیح نہ ہوں اس لئے اسے ضائع کردیا[3]۔ تاہم چونکہ یہ مجموعہ عرصہ تک حضرت عائشہ کے پاس رہا اور اُن کا شوق حدیث اور علم و فضل مشہور و معروف ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ سارا مجموعہ ان کے حافظہ میں محفوظ ہوگیا ہوگا جو بعد کو ان کے شاگردوں کے ذریعہ کتابی شکل میں آگیا ہوگا

---

[1] جامع ص۳۳ [2] دارمی ص۶۸ [3] تذکرۃ الحفاظ ذکر حضرت ابوبکرؓ

کتابت حدیث کا رجحان برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں کافی تحریری سرمایہ کتابی شکل میں جمع ہوگیا تھا[1]

اب روز بروز جمع وترتیب حدیث کے متعلق شکوک وشبہات ختم ہوتے جاتے تھے اور جو صحابہ پہلے اسے پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی اپنی رائے بتدیل کر رہے تھے حضرت عبداللہ ابن عباس جو پہلے کتابت حدیث کے سخت مخالف تھے اور لوگوں کو اس سے روکتے تھے اب اس کے قائل ہی نہیں بلکہ اس پر عامل ہو چکے تھے[2]

حضرت عبداللہ ابن مسعود جو کبھی تحریری روایات کے اتنے سخت مخالف تھے کہ لکھے ہوئے حروف کو پانی سے دھلوا دیتے اور روایتوں کے مجموعوں کو نذر آتش کر دیا کرتے تھے[3] اب وہ خود اور ان کے شاگرد حدیثوں کے لکھنے لکھانے میں مشغول تھے[4]

حضرت عبداللہ ابن عباس کا اب یہ حال تھا کہ ان کے شاگرد حدیث کی نشر واشاعت میں پوری توجہ سے مصروف تھے ان کے شاگرد ان کے پاس بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے حضرت سعید ابن جبیر کا بیان ہے کہ

کنت اکتب عند ابن عباس فی صحیفۃ[5] میں عبداللہ ابن عباس کے پاس کتاب میں لکھتا تھا۔

اور جب کاغذ میں گنجائش باقی نہ رہتی تو نعلین کو پلٹ کر اس پر لکھتے[6] حالت سفر میں کجاوے کی لکڑی سے یہ کام لیا جاتا[7] غرضکہ سفر وحضر ہر جگہ حدیثیں لکھی جا رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے پاس متعدد صحیفے جمع ہوگئے تھے[8] جب ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے کتابوں کا اتنا ذخیرہ چھوڑا تھا جو ایک اونٹ کا بوجھ تھا۔

(باقی آئندہ)

[illegible] ابراہیم

جامعہ نگر (دہلی)

---

۱ جامع ص۳۲ ۲ ترمذی کتاب العلل ۳ جامع ص۳۲ جلد اول ۴ جامع ص۳۰

۵ دارمی ص۶۶ ۶ ایضاً ۷ ایضاً ۸ ترمذی کتاب العلل

حالات ندوہ

سال رواں کی پہلی سہ ماہی ختم ہوگئی اس منزل پر پہونچ کر تمام کاموں پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے تاکہ اسکی روشنی میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جاسکے پہلی سے تیسری فروری تک سہ ماہی امتحانات کا سلسلہ جاری رہا اس کے بعد محرم کی تعطیل ہوگئی تعطیل کے بعد نتائج مرتب ہوجائیں گے اور غالباً وسط مارچ سے پہلے ہی ان کا اعلان ہوجائے۔

گذشتہ سال اسی مہینے کے رسالہ میں ہم ندوہ کی اقامت گاہوں کا ذکر کرچکے ہیں یہاں روزمرہ کے تمام انتظامات ناظر دارالاقامہ کی رہنمائی میں طلبہ ہی کے ہاتھ میں ہیں تاکہ اتفاق وتعاون اور یک جہتی وہم آہنگی کی فضا قائم ہو عزم وحوصلہ کی دبی ہوئی طاقتیں ابھریں فکر وتدبیر کے مدھم نقوش اجاگر ہوں فرائض کا احساس خودداری وخودنگری کی خو پیدا کرے اور ذمہ داری کا بوجھ ارادوں میں عزم وہمت اور بلندی وپختگی کا باعث ہو امسال یہ انتظامات حسب ذیل طلبہ کے سپرد ہیں۔

نقیب عام (جنرل مانیٹر) محمد نواب خاں

نقیب　محمد یونس　اقبال وارث

نقیب صلوٰۃ۔ محمد ظہور　عنایت اللہ

نقیب صحت۔ شبیر احمد　مصلح الدین

نقیب تعلیم۔ ابوالعرفان　مجیب اللہ

مطبخ کے انتظامات بھی اسی طرح طلبہ ہی کے سپرد ہیں انکی منتخب مجلس مولانا مفتی محمد سعید ندوی

مہتمم مطبخ کی رہنمائی میں تمام کام انجام دیتی ہے امسال حسب ذیل اصحاب اس خدمت کیلئے منتخب ہوئے ہیں۔

ناظم مجلس طعام۔ رفیق احمد

نائب ناظم۔ احتشام علی

اراکین:۔ عبدالجلیل مجددی، مسیح الزماں، معین اللہ، عبدالحکیم، سید یوسف میسوری، محمد صابر، رفیق اللہ بنگالی۔ نجم الدین برمی۔

ورزشی کھیلوں کے انتظامات کے لئے حسب ذیل طلبہ منتخب ہوئے ہیں۔

جنرل کیپٹن۔ محمد یوسف میسوری

نائب کیپٹن۔ عبدالجلیل مجددی

والی بال کیپٹن۔ محمد صابر سماٹری

۲۸ جنوری کو مولانا محمد عمران خاں (انچارج اہتمام دارالعلوم) کی جانب سے الاصلاح مجلس طعام مجلس نقبا، مجلس الالعاب الریاضیہ (گیمس کمیٹی) کے منتخب نمائندوں کے علاوہ مطبخ اور دارالاقامہ کے منتظمین اور ندوہ سے متعلق دوسرے اصحاب بھی موجود تھے کھانوں کی خوش ذائقی کے ساتھ باتوں کی لطافت اور تقریروں کی دلچسپی نے اس صحبت کا لطف اور بڑھا دیا تھا۔

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۲ صفر المظفر ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۳

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر "منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ" کے پتہ پر ہونی چاہیئے

شذرات

تعلیم و تربیت سے مقصود یہ ہو کہ طلبا کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے تا کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہو سکیں اور آئندہ جب ان کے ہاتھ میں قوم کی باگیں آئیں تو ماضی کی یہ تربیت ان کے لئے مشعل راہ کا کام دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضرورت ہو کہ تعلیم گاہوں کے محدود دائرہ میں وسعت پیدا کی جائے طلبا کو موقع دیا جائے کہ وہ درسگاہوں کے باہر بھی زندگی کی حقیقتوں کا مشاہدہ کر سکیں، اس خیال کے ماتحت ندوہ میں مشاہیر قوم کو دعوت دیجاتی ہو کہ وہ اپنے خیالات و افکار سے طلبا کو مستفید کریں، کبھی کبھی طلبا کو ملک کے مختلف تعلیمی اور تمدنی مرکزوں کی سیر بھی کرائی جاتی ہے تاکہ اس سیاحت سے انھیں علمی و عملی تجربے حاصل ہوں۔

امسال فروری کی ابتدائی تاریخوں میں اس سفر کا آغاز ہوا، بیس طلبہ ساتھ تھے۔ اس قافلہ کی پہلی منزل آگرہ میں ہوئی۔ اب گو اکبر آباد اور سیکری کا پچھلا جاہ و جلال ایک قصۂ ماضی بن چکا ہے اور بابر و اکبر اور جہانگیر و شاہجہاں کی پرشکوہ داستانیں صرف تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں، لیکن بزرگوں کے آثار اب بھی عظمت ماضی کے ترجمان ہیں، تاج کے مرمری گنبد، قلعہ کے فلک بوس اور پرشوکت ایوان و قصور اعتماد الدولہ کے دلفریب نقش ونگار اور سکندرہ کے پرشکوہ اور دل افروز مناظر نے تھوڑی دیر کے لئے زمان و مکان کی حدبندیاں ختم کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ زمانہ دو تین سو برس پیچھے ہٹ گیا ہے اور ہم مغلوں کے شاندار دور میں چل پھر رہے ہیں، کہیں بابر چند ہزار جاں نثاروں کے ساتھ رانا سانگا کی دل بادل فوجوں کے سامنے کھڑا نصرت ایزدی کا تماشا دیکھ رہا ہے، شراب کے پیالے ٹوٹے جا رہے ہیں، توبہ کا عہد دلوں میں ہمت پیدا کر رہا ہے۔

کہیں راجپوت سردار اکبر کے جلو میں چل رہے ہیں اور راجگان ہند سے قرابت کے رشتے قائم ہو رہے ہیں، کہیں جہانگیر کے عدل و انصاف کے چرچے ہیں زنجیر عدل محل کی دیواروں سے لٹک رہی ہے. اور بیکس و لاچار مظلوم و ستم رسیدہ براہ راست بادشاہ کے حضور میں عرض و معروض کر رہے ہیں کہیں شاہجہاں تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہے اور لاجواب و بے مثال عمارتوں کے نقشے پیش ہو رہے ہیں. کسی جگہ ابوالفضل و فیضی کے محل نظر آ رہے ہیں جہاں علم و حکمت اور سیاست و تدبیر کے رموز حل ہو رہے ہیں، کہیں عالمگیری جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کے مناظر نظر آ رہے ہیں، باطل کے نقش مٹ رہے ہیں اور قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو رہی ہے.

کچھ دیر تک ہم خیالات کی اس دنیا میں گم رہے رفتہ رفتہ ماضی کے پُر شکوہ جلوے نگاہوں سے اوجھل ہوئے اور حال کا دردناک اور یاس انگیز مرقع سامنے آیا، دل میں ٹھیس لگی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ ؎

ایک وہ تھے کہ جہانگیر و جہاندار زمن — ایک ہم ہیں کہ غلام اور غلامی پہ نثار

آگرہ سے چل کر ہمارا قافلہ کچھ دیر کے لئے علی گڑھ ٹھیرا، اور وہاں سے دہلی پہونچا، دہلی کا چپہ ایک جہان عبرت ہے، ہزاروں برس کی تاریخ اس طرح بکھری پڑی ہے کہ اگر کوئی آنکھیں بند کر کے گذرنا چاہے تو ناممکن ہے شکستہ قلعے، منہدم محل، سنسان مقبرے، اور ویران کھنڈر قدم قدم پر دنیا کی بے ثباتی اور زمانے کے انقلاب کی داستان سُنا رہے ہیں کہ ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

دہلی کے آثار قدیمہ ویسے تو سبھی کے لئے باعث عبرت ہیں، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ شکستہ آثار سامانِ نوحہ و ماتم بھی ہیں۔ اللہ اکبر کہاں اسلاف کی یہ ہمت کہ مٹھی بھر آدمی ایک لق و دق

ملک میں قدم رکھتے ہیں اور گنتی کے چند برسوں میں مالک تاج و اورنگ ہو جاتے ہیں اور کہاں اخلاف کا یہ حال کہ ہر کہ و مہ کے سامنے لرزہ براندام، ایک وہ تھے کہ صرف اٹھارہ سواروں سے صوبے کے صوبے فتح کر ڈالتے تھے اور ایک ہم ہیں کہ نوکر در ہو کر بھی مستقبل سے ہراساں اور ہجرت پر آمادہ،

دہلی کے اس قیام میں آثار قدیمہ کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں اور علمی مرکزوں کی زیارت کا بھی موقع ملا، اس سلسلہ میں جامعہ ملیہ، مدرسۂ فتحپوری، دار الحدیث رحمانیہ اور ندوۃ المصنفین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جامعہ میں پروفیسر محمد مجیب اور مولانا اسعد الدین ندوی کی عنایت سے مختلف تعلیمی اور تربیتی شعبوں کو دیکھنے کا موقع ملا، شام کو ایک فٹ بال میچ ہوا لیکن نتیجہ برابر رہا۔ رحمانیہ اور فتحپوری میں مدرسہ کے عام مشاہدہ کے علاوہ مولانا عبید اللہ اور مولانا اشفاق الرحمٰن کی عنایت سے درس حدیث میں بھی شرکت کا موقع ملا۔

دہلی کے اس سفر میں جناب مولانا محمد الیاس کی خدمت میں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا بڑے خلق و محبت سے ملے اور دیر تک ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا کے صاحبزادے مولوی محمد یوسف سے بھی ملاقات ہوئی۔ آجکل امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی شرح لکھ رہے ہیں، کئی سو صفحوں کا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ موصوف نے ازراہ عنایت جا بجا سے کتاب کے مختلف حصے پڑھ کر سنائے۔

دہلی سے ہم لوگ لاہور پہونچے اور مولانا احمد علی امیر انجمن خدام الدین کی عنایت سے مدرسۂ قاسم العلوم میں قیام ہوا۔ لاہور میں ہمارا یہ پہلا اتفاق تھا لیکن مولانا سید محمد طلحہ، شیخ محمد العربی، برادر عزیز مولوی احمد الحسنی، اور عزیزی محمد ثانی کی بدولت زیادہ اجنبیت محسوس نہیں

ہونے پائی۔ احمد صاحب کی صحت ان دنوں کچھ خراب تھی، آنکھوں کے سلسلہ میں ابھی آپریشن ہو چکا تھا، اور ہنوز علاج کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن یہ کوئی چیز بھی انکی محبت کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔ شب و روز کا اکثر حصہ ہمارے ساتھ گذرتا، ضعف و نقاہت کے باوجود میلوں سفر کرتے مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے بلکہ اور الٹے معذرت کرتے۔ شیخ عربی اور مولانا [illegible] نے بجید مشغولیت کے باوجود یہی نہیں کہ ہمارے ساتھ کافی وقت صرف فرمایا بلکہ اس خاکسار کو اپنی مہمانی کا شرف بھی بخشا۔

لاہور کے آثارِ قدیمہ میں جامع مسجد، قلعہ، جہانگیر و نورجہاں کے مقبرے اور شالامار باغ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو سکھ شاہی کے اثرات ہر جگہ نمایاں ہیں لیکن جامع مسجد، قلعہ اور نورجہاں کے مقبرہ کو دیکھکر تعصب و بدمذاقی کی ایک عجیب تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے خدا معلوم اس عہد کے مسلمانوں نے اس ذلت کو کیونکر انگیز کیا، ان تاریخی عمارتوں کے علاوہ لاہور کا میوزیم بھی قابلِ دید ہے۔ یہاں ہمیں قدیم تاریخ ہند کا اچھا سامان نظر آیا، پتھر کے زمانہ سے بدھ کے دور تک بہت سا قیمتی سامان موجود ہے جس کی مدد سے تاریخ کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑے جا سکتے ہیں، پروفیسر محمود شیرانی کی عنایت سے عہدِ ساسانی اور عہدِ اسلامی کے قدیم سکوں کی زیارت ہوئی۔ خسرو کے سکوں، عہدِ فاروقی کے بسم اللہی سکوں اور بنی امیہ کے ابتدائی درہم و دینار سے لے کر ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کے زمانہ تک کے ہزاروں سکے دیکھے جنمیں عالمگیر کا درم شرعی اور محمد تغلق کا تانبے کا سکہ بھی تھا۔ مولانا سید طلحہ کی عنایت سے لاہور کی رصدگاہ بھی دیکھنے کا موقع ملا، گو آسمان پورے طور پر صاف نہ تھا تاہم مشتری اور زحل دوربین سے بخوبی دیکھے گئے۔

لاہور سے واپسی میں دیوبند، سہارنپور اور رامپور کے دیکھنے کا موقع ملا۔ دیوبند میں یہ ہمارا پہلا اتفاق تھا، لیکن دارالعلوم کے بزرگوں اور دوستوں کی عنایت سے ذرا بھی

اجنبیت محسوس نہیں ہونے پائی۔ ناشکری ہوگی اگر جناب مولانا حسین احمد صاحب مولانا شبیر احمد صاحب مولانا محمد طیب صاحب، مولانا اعزاز علی صاحب مولانا محمد ابراہیم صاحب اور مولانا سلطان الحق صاحب کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ حضرات اس محبت و خلوص اور عنایت و مہربانی سے پیش آئے کہ ہم لوگوں کو مسافرت میں گھر کا مزہ آیا۔ مولوی محمد سعید نے اپنا قیمتی وقت صرف کرکے گوشہ گوشہ کی سیر کرائی۔ برادرم عبدالستار ملتانی، مولوی منور حسین، مولوی عبدالرزاق، مولوی عبدالسمیع، مولوی عبدالشکور اور مولوی عبدالوالی، ہر وقت ہمارے ساتھ رہے اور خود تکلیف اُٹھا کر ہمیں آرام پہونچایا، طلبہ نے ادب و حدیث کے اسباق میں شرکت کی اور کئی گھنٹہ تک دورہ میں حدیث کے علمی مباحث کی سماعت کی۔

سہارنپور میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور مولانا محمد اسد اللہ صاحب کی عنایت سے مظاہر العلوم میں قیام رہا۔ مدرسہ کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کی دینداری، سادگی اور اخلاص و للٰہیت کا طلبہ پر خاص اثر پڑا، ہم لوگوں کا قیام اتنا مختصر تھا کہ اسباق میں شرکت کا موقع نہیں ملا، لیکن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی عنایت سے شب میں طلبہ کو استفادہ کا موقع مل گیا، اور کئی گھنٹہ تک حدیث و رجال کے اہم مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ سہارنپور میں مولانا منظور النبیؒ صاحب ندوی سے بھی ملاقات ہوئی، مولانا بڑی محبت سے ملے اور باصرار ندوہ کے اس قافلہ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔

سہارنپور سے روانہ ہوکر ہم لوگ رامپور پہونچے، اسٹیشن پر قاری محمد اسمٰعیل صاحب مجددی موجود تھے انکی رہنمائی میں ہم لوگ شہر پہونچے۔ قاری صاحب اور مولانا عبدالودود ندوی پرنسپل مدرسۂ عالیہ نے قلعہ اور کتبخانہ میں داخلہ کی اجازت حاصل کر لی تھی، لیکن افسوس کہ وقت کی تنگی کی بنا پر کتبخانہ پورے طور پر نہ دیکھا جاسکا، شب میں مولانا عبدالودود صاحب نے ایک پرتکلف دعوت دی اور ہم لوگ لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

خاکسار کا خاندان چند پشتوں سے مولویوں کا خاندان ہے میرے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم صوبہ بہار کے مشہور معقولی مدرس تھے، والد مرحوم تو نہیں لیکن میرے عم مغفور مولانا حکیم حافظ سید ابوالنصر گیلانی درس نظامیہ کے عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تو اُن کا کم تھا لیکن مطالعہ میں مسلسل منہمک رہتے تھے، اس زمانہ کے عام مولویوں کے اعتبار سے ان کے مطالعہ کا دائرہ وسیع تھا، عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کی علمی کتابوں کا پڑھ لینا اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتے تھے، اس لئے مولانا شبلی، سر سید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، وغیرہ جیسے لوگوں کی کتابوں تک کا مطالعہ بہ شوق کرتے تھے، اگرچہ ان لوگوں کے متغربانہ میلانات سے متفق نہیں تھے، میں نے ان ہی کے آغوشِ تربیت میں آنکھیں کھولیں، چونکہ خود لاولد تھے، اس لئے بجائے بیٹے کے مجھے مانتے اور چاہتے تھے، تین ہی سال کی عمر میں جب الفاظ کے تلفظ پر زبان گونہ قادر ہو چکی تھی، سینکڑوں فارسی کے الفاظ مجھے یاد کرا دئیے تھے، یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ تک کتے کو "سگ" کے سوا میں نہیں جانتا تھا کہ کچھ اور بھی کہتے ہیں، بعض دفعہ گھر کی عورتوں کو میری اس فارسی دانی سے کافی مشقت میں مبتلا ہونا پڑا،[1] اسی زمانہ میں دادا مرحوم کے ایک پنجابی شاگرد ملا عبداللہ مرحوم میرے گاؤں میں توطن پذیر ہو گئے تھے، اور مختلف مؤثرات کے تحت دہلی جا کر مولانا نذیر حسین مرحوم کے حلقہ میں پہونچکر حنفی مسلک کو چھوڑ کر عمل بالحدیث

اپنی ننھیال موضع استھانواں میں تھا، عورتیں کسی تقریب میں باہر گئی ہوئی تھیں، اکیلا میں ہی گھر میں تھا، یا اور کوئی کھلائی بھی ہو بہرحال میں نے باورچی خانہ میں کتے کو جاتے دیکھا، عورتیں جب آگئیں تو میں نے اپنی نانی صاحبہ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا "سگ آیا تھا بھات کھا گیا" وہ بیچاری حیران کہ ساگ بھات کو کھا گیا کیا مطلب ہے، والدہ مرحومہ میری اصطلاحوں سے واقف تھیں جب وہ آئیں تب مسئلہ حل ہوا ۱۲۔

یا غیر مقلدیت کا مسلک اختیار کرلیا تھا، چچا مرحوم سخت غالی حنفی تھے، ملا عبد اللہ سے حالانکہ انھوں نے کچھ پڑھا بھی تھا لیکن مقلدیت وغیر مقلدیت کی بحث میں الجھ کر دونوں میں مختلف کلی اور جزئی مسائل کے متعلق رات دن مباحث کا بازار گرم رہتا تھا خصوصاً طلاق ثلثہ مجلس واحد مغلظ ہے، یا نہیں اس مشہور نزاع میں تو رسالہ بازیوں تک کی نوبت آئی، طرفین سے متعدد رسالے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے شائع ہوتے رہتے تھے، میں نے جب ہوش سنبھالا اور چچا مرحوم ہی سے مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا، تو میرا علمی ماحول یہی تھا، ابن حجر ابن قیم ابن تیمیہ شوکانی ان باتوں کی بار بار تکرار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں، اور جب ان لوگوں کی یہ حالت تھی، تو پھر بخاری مسلم امام ابوحنیفہ ابو یوسف ابوہریرہ ابن عمر کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا حال ہوگا، اس مکتبی دور میں مجھ پر سب سے زیادہ کس کتاب کا اثر پڑا، وہ عجیب ہے، فطرتاً میں سخت بد شوق بچوں میں شمار ہوتا تھا چچا مرحوم نے مار مار کے مری کھال تک بعض دفعہ ادھیڑ دی لیکن پڑھنے کی چوری سے کبھی باز نہ آتا تھا، اتفاقاً ایک اردو کی کتاب جس کے ابتدائی صفحات غائب تھے کہیں گھر میں مل گئی، یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا، اب بھی نہیں معلوم کہ اس کا نام کیا تھا، لیکن اس کا اثر اب تک تازہ ہے، قصہ کی کتاب تھی، پورا قصہ تو اب یاد نہیں رہا اتنا یاد رہ گیا ہے، کہ ایک پادری اپنے باغ میں رہتا تھا بچوں کو کچھ پڑھاتا بھی تھا اور نجاری وغیرہ جیسی بعض صنعتیں بھی سکھاتا تھا، طلبہ کو اپنے باغ کے میوے رس بھری وغیرہ کھلاتا تھا، بچوں میں ہیری اور ٹامی دو خاص کیرکٹر کے لڑکے تھے، ان میں ہیری سعادت کا اور ٹومی شقاوت کا نمونہ تھا، ہیری کے جو حالات اس کتاب میں درج تھے ان سے غیر شعوری طور پر میرا دل متاثر ہوا۔ اور اسکی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا ایسا محسوس ہوا کہ کاش ایسی زندگی مجھے بھی میسر آتی، اور اب مجھ میں کچھ پڑھنے کا شوق گدگدی لینے لگا لیکن چچا مرحوم کی بدگمانیوں کا شکار تھا، پٹائی کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، اور اب اس کے بعد میرے لئے یہ مار دھاڑ بجائے نفع کے باعث نقصان بنتی چلی جا رہی تھی اسی عرصہ میں چند دوستوں نے مجھے داستان

امیر حمزہ دکھائی، اسکی دلچسپیوں نے مجھے ہوش رُبا کے طلسم میں گرفتار کردیا مجھ پر تو جو گذری تھی گذر گئی لیکن عبرۃ لاولی الابصار میں ان نتائج کا اظہار ثواب سمجھتا ہوں جو اس طلسم میں گرفتاری کے بعد مجھ پر طاری ہوئے میری عمر اس وقت غالباً دس گیارہ سال کی ہوگی، جب اس مرض میں گرفتار ہوا، گاؤں کے ایک رئیس بابو ظہور حسن مرحوم کو بھی قصہ کہانیوں کی کتابوں سے حد استغراق تک دلچسپی تھی، میری بدقسمتی تھی کہ انھوں نے نول کشور پریس کے ان سارے خرافات کو جن کا داستان امیر حمزہ سے تعلق ہے، منگوالیا تھا، کوچک باختر بالا باختر، ہفت پیکر، نو رافشاں، ایرج نامہ، اور خدا جانے کیا کیا اب تو سب کے نام بھی یاد نہیں، ہر ایک کتاب تک میری رسائی بآسانی ہو رہی تھی، متعلقہ مکتبی اسباق سب بالائے طاق ہوگئے، صرف ان ہی داستانوں میں غرق ہوگیا، چچا صاحب کو میرے اس انہماک کا احساس ہوا، کچھ نگرانی کرنے لگے، یہ واقعہ ہے کہ بیت الخلاء میں کتاب کو چھپا کر رکھ آتا، اور پھر قضاء ضرورت کے حیلہ سے اسی بدبو کدہ میں بیٹھا ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، رات رات بھر میں نے مدتوں یوں گذاری کہ صبح ہوگئی، اور میں ہوں میری یہ داستان ہے، خیر یہ تو چنداں مضرات نہ تھی اس سے زیادہ اس کتاب نے ہم پر حملہ کیا، اور طبیعت ان واقعات کی نقل اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کرنے لگی، جن سے یہ کتاب مملو ہے، کیا کیا لکھوں کہ پھر اس راہ میں مجھ پر کیا گذری حد یہ ہے کہ عیاری جو اس کتاب کا ایک مخصوص حصہ ہے، اور مکر و فریب دھوکہ، چالاکی بھی اس کا خلاصہ ہے، میں نے مدتوں بطور فضائل کے خود اسکی مشق کی، اور اپنی ہمجولیوں میں جو غریب اس کتاب سے ناواقف تھے ان کا امام بن کر مختلف طریقوں سے ان عیاریوں کی عملی مشق میں مصروف ہوگیا وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ پرواز بہ مقدار عمر تھی، گاؤں کے باغ اور کھیت میری اور میرے شاگردوں کی عیاریوں کی جولانگاہ تھے، غریب رکھوالوں کو طرح طرح سے ستایا کرتا، اور اُن کی چیزوں کو برباد کرکے خوش ہوتا کہ عیاری خوب کامیاب رہی، ابھی شباب اور شبابیات سے بیگانہ تھا، اگرچہ بتدریج اُن کے آثار چپکے چپکے ابھر رہے تھے، اور شاید میری بربادی یقینی تھی، اگر ٹھیک عنفوان شباب ہی میں قدرت مجھے اپنے دیہاتی ساتھیوں سے الگ نہ کرلیتی، پہلے

انگریزی تعلیم کا چاؤ کو خیال تھا، سباگل پور اسکول میں نام لکھانے کے لئے بھیجا بھی گیا، انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں دیہات ہی میں ختم ہوچکی تھیں لیکن کسی لطیفۂ غیبی نے میری رفاقت کی ایسے قدرتی مواقع پیش آئے کہ یکایک میری تعلیم کا پروگرام بدل گیا اور اچانک اس طلسمی قید سے نکل کر قدرت نے مجھے بہار سے سیکڑوں میل دور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں پہونچا دیا یعنی ریاست ٹونک کے مشہور منطقی و معقولی عالم حضرت مولانا برکات احمد بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رشتہ داری کے تعلق سے چچا مرحوم نے پہونچا دیا، پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ کن نامعلوم اسباب کے تحت، ماحول کے اس انقلاب نے میرے دل و دماغ کو بدل دیا، ہوش ربا کی داستان کا قصہ ختم ہوگیا، جو جادو اس کتاب نے مجھ پر چلایا تھا، اس کے اثر سے خود بخود شفایاب ہوگیا اب میرا شمار مولانا مرحوم کے شوقین محنتی ذہین طلبہ میں ہونے لگا، حالانکہ چچا مرحوم کے زد و کوب نے مجھے یہ یقین دلا دیا تھا میں سخت کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں۔ ورنہ صبح و شام اتنی مارکیوں کھاتا، اس سلسلہ میں داستان امیر حمزہ کے عیبوں کے ساتھ اس کے ایک ہنر کا بھی ذکر نہ کرنا ناشکری بھی اور شاید گونہ حق پوشی بھی ہوگی، داستان کے اس طویل سلسلہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو کل تین اجزا پر ساری کتابیں مشتمل نظر آئیں گی، (۱) ایک تو وہی عمرو عیار اور ان کے تلامذہ کے عیارانہ کرتب (۲) امیر حمزہ اور ان کے احفاد و اولاد در اولاد بلکہ عیاروں کے حسن و عشق کے افسانے (۳) فرضی کفار کے مقابلہ میں فرضی مسلمانوں کا فاتحانہ استیلا، جیسا کہ میں نے عرض کیا، کہ پہلے جزء کے ساحرانہ نتائج کا تو میں شکار ہی ہوگیا خود بھی ہوا اور اپنے ساتھ کتنوں کو اس فتراک کا نخچیر بنایا، خود تو خیر کم سنی کی وجہ سے صرف باغوں اور کھیتوں تک محدود رہا لیکن میرے ایک ہمجولی میاں معین الدین عرف منا جو گیلان ہی میں میرے بعد کچھ دن رہے، اور اب تقریباً بتیس پچیس ۲۵ سال سے مفقود الخبر ہیں، بعضوں سے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے علاقہ میں پہونچ کر ان پر جذب طاری ہوگیا اور اب ان کا شمار اس علاقہ کے مستجاب الدعوات فقرا میں ہے، ان بیچارے کو ٹونک سے واپسی کے بعد پایا کہ گاؤں کی مرغیوں اور بکریوں پر اپنی عیاریوں کی مشق کر رہے ہیں، داستان امیر حمزہ کے شروع میں عمرو عیار کی طرف مرغی پکڑنے کی جو عیاری منسوب کی گئی ہے یہ اسی کی تجلی تھی جو اس بیچارے کے عمل میں آکر جلوہ گر

ہوئی تھی، رہا دوسرا جز تو اس وقت ان واقعات سے متاثر ہونے کی پوری صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوئی تھی البتہ تیسرے جز کا اگرچہ بظاہر عملی طور پر مجھ پر کچھ اثر نہ تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر میری طبیعت نے اسکا اثر کچھ ضرور جذب کیا تھا، اور کفر کے مقابلہ میں اسلام کے اعلاء و سربلندی کے جذبہ سے میرا دماغ اگر کبھی خالی نہ رہا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں اس داستان نے اس جز کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے اگرچہ اسی زمانہ میں چچا مرحوم کے اصرار سے واقدی کی فتوح الشام و مصر وغیرہ کا بھی میں نے مطالعہ کیا تھا، اور گو آغاز جبراً ہوا تھا لیکن آخر میں چچا مرحوم کی مرضی کے مطابق کسی چیز کو شوق سے کچھ دن میں نے پڑھا تو واقدی کی یہی کتابیں تھیں اور اس جذبہ میں ان کتابوں کی تائید بھی ضرور شریک ہے یہ بات کہ اردو ادب کے اس طویل سلسلہ کے مطالعہ نے میری ادبی قابلیت پر کچھ اثر ڈالا یا نہیں، میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا مجھ میں کسی قسم کا کوئی سلیقہ پیدا نہیں ہوا تھا، اور تھوڑا بہت اگر تھا تو وہ چچا مرحوم کی جبری تعلیم کا اثر تھا۔

اس ہوش ربائی داستان سرائی میں طوالت سے میں نے قصداً کام لیا ہے کیونکہ اپنے ان ہی ذاتی تجربات کی بنا پر میں ان عموم ادبی کتابوں اور رسالوں کو نوخیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے سم قاتل قرار دیتا ہوں جو حشرات کیڑوں کی طرح آج آسمان و زمین سے ہر ہر گھر میں برس رہے ہیں، بچوں سے آگے بڑھکر بچیوں تک کی تباہی و بربادی میں بے پناہ طوفانوں کا کام کر رہے ہیں، نسلیں برباد ہو رہی ہیں اور گھرانے اجڑ رہے ہیں، مگر اس تشکل میں کہ ان کاغذی سانپوں اور بچھوؤں سے ماں باپ بخوشی اپنے بچوں کو ڈسا رہے ہیں، حکومت مدد کر رہی ہے، قوم کے لیڈر ایجوکیشن سوسائٹیں اور خدا جانے کن کن شکلوں سے زہر کے یہ پیالے قوم کے نونہالوں کو بلیغ تقریروں اور فصیح اسپیچوں کے ذریعہ سے پلا رہے ہیں، فانا للہ وانا الیہ راجعون، کہ تباہی کے اس طوفان کے انسداد کے سارے وسائل ختم ہو چکے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا، ما قدر اللہ فسوف یکون، و اذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہ و ما لہم من دونہ من وال،

بہرحال یہ میری جاہلیت کا دور تھا، جو ٹونک پہونچنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، اب واقعی علوم و فنون کا شوق

مجھ پر مسلط تھا شوق کی یہ حد تھی کہ باوجود مطبوع ہونے کے میں نے شدت ذوق میں منطق کی بعض کتابیں خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر پڑھیں، اور ان ہی دنوں میں اسا تو جی قلمی پر اپنے استاد کی تقریروں کو اردو میں بطور حاشیہ کے لکھتا جاتا تھا، جو اب تک میرے کتب خانہ میں بطور یادگار کے محفوظ ہے، مولنا برکات احمد پر مولنا عبدالحق خیرآبادی کے رشید شاگردوں میں ہونے کی وجہ سے خیرآبادی اسکول کے اثرات غالب تھے، منطق و فلسفہ ان ہی دونوں علوم کا انکے حلقۂ درس میں غلبہ تھا، مجھ پر بھی ان ہی کا تسلط قدرتی طور پر ہونا چاہئے تھا سو ہوا لیکن اسی کے ساتھ یہ چچا مرحوم کی ترکیب تھی کہ خطوط میں بعض خاص علمی و ادبی رسائل و اخبار کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہتے اور گو برکاتی ماحول اس مذاق سے قطعاً ناآشنا بلکہ مخالف تھا لیکن اس عرصہ میں میرا یہ شغلہ برابر جاری رہا چچا مرحوم نے اپ کے "الندوہ" کو میرے نام جاری کرادیا تھا اور اسی بنیاد پر علامہ سید مجھے ندویوں میں شریک فرماتے ہیں، کہ درشاً نہیں، قلماً میں ندوۃ کا شاگرد رہا ہوں، ایک حیثیت سے سید صاحب کا یہ خیال درست بھی ہے، مولنا برکات احمد کو میری اخبار بینی، اور رسائل خوانی کا اگر کبھی علم ہو جاتا تو بہت برہم ہوتے اور فرماتے ان سطحیات کے دیکھنے سے تو اپنی استعداد بگاڑ رہا ہے، لیکن "چندانکہ مرا شیخ ابوالفرج ابن جوزی" کا جو قصہ سعدی نے گلستاں میں لکھا ہے، میرا وہی حال تھا، تین چار سال تک اس عرصہ میں مجھے کسی مصنف یا کسی تصنیف سے کوئی خاص لگاؤ پیدا نہیں ہوا، البتہ جب شرح عقائد شروع ہوئی تو میرے ایک پنجابی ملتانی استاد مولنا محمد اشرف مرحوم نے شرح عقائد کی ایک گمنام شرح کا پتہ دیا، اس کا نام نبراس ہے، اور اب بھی لوگ اس سے ناواقف ہیں، یہ ملتان ہی کے ایک غیر معروف بزرگ مولنا عبدالعزیز کی تصنیف ہے اور ملتان ہی سے شائع بھی ہوئی ہے کتاب منگائی گئی، واقعہ یہ تھا، کہ اس کتاب میں عام درسی مذاق سے زیادہ مفید چیزیں مجھے ملنے لگیں، اور اس کے مطالعہ میں لذت ملنے لگی، میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ علم کلام کا تصوف کے نظری حصہ سے جو تعلق ہے سب سے پہلے اس کا سراغ مجھے نبراس ہی کے چراغ کی روشنی میں ملا، اس میں کتابی الجھنوں سے زیادہ واقعات سے داغوں کو قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی عرصہ میں جلالین شروع ہوئی، چچا مرحوم نے لکھ بھیجا کہ جلالین کے ساتھ رازی کی تفسیر کا مطالعہ جاری رکھو، تفسیر کبیر نے میری آنکھیں کھول دیں، اور مدرسے

عام طلبہ میں حاشیہ و شروح کے دور از کار نکات کے حل کرنے کا جو عام مذاق پایا جاتا تھا، اور میں بھی اس مذاق میں مبتلا تھا، اس سے رہائی میسر آئی، حاشیہ نگاروں و شرح بازوں کی وقعت نگاہ میں کم ہونے لگی، امام رازی میرے پہلے رہنما ہیں جنھوں نے مجھ میں علم کا صحیح مذاق پیدا کیا، لیکن اس وقت تک صرف دماغی راحت کے سامان کے تلاش میں رہتا تھا، دل و روح کی غذاؤں کا نہ شوق تھا، نہ کسی نے ادھر توجہ دلائی تھی، چچا مرحوم پر بھی مولویانہ مذاق غالب تھا اور گو مولانا برکات احمد پر تصوف کا اچھا خاصہ رنگ تھا، لیکن ان کا درس اس رنگ سے بیگانہ تھا، اس لئے مجھ تک ان کے تصوف کا اثر منتقل نہ ہو رہا تھا کہ اچانک بلقان کی جنگ چھڑی، ندوہ کے ایک عالم نے ٹونک میں چندہ کی تحریک کی غالباً سید محمد رائے بریلوی نام تھا، بیچارے کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، متعدد مجمعوں میں ان کا وعظ ہوتا تھا لیکن صحرا کی صدا بنکر رہ جاتا تھا، مجھے ایک دن کچھ غیرت سی آئی، اور افسوس بھی ہوا، اس زمانہ میں الہلال نکل چکا تھا، ٹونک میں سب سے پہلا پرچہ اس کا میں نے ہی منگایا تھا، ایک جماعت کے ساتھ الہلال کے دلدادوں میں تھا، مولانا ابوالکلام کے الفاظ و طرز بیان کی نقل اتارنے کی صلاحیت محسوس کر کے میں اچانک پہلی دفعہ پبلک کے سامنے تقریر کیلئے کھڑا ہو گیا، ٹونک کی تاریخ میں وہ یادگار دن تھا، جامع مسجد بھری ہوئی تھی، وامتازوا الیوم ایہا المجرمون، کے ساتھ میری کڑکتی ہوئی تقریر کا آغاز ہوا، جو جہاں تھا تھرا کر رہ گیا، پھر مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا کہا، پندرہ [۱۵] بیس [۲۰] منٹ کے بعد ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ خود رو رہا ہوں اور ساری مسجد میں کہرام برپا ہے، روپیہ کا ڈھیر میرے قدموں کے سامنے ہے، لوگ واقعۃً کپڑے پھاڑ رہے تھے، بال نوچتے تھے، منہ پر تھپڑ مارتے تھے، ساری مسجد دیوانی ہو رہی تھی، میں خود حیران تھا کہ قصہ کیا ہے؟ اور آج تک اسکی توجیہ میری سمجھ سے خارج ہے، شائد میرے دبے دبائے جذبات یکایک ابھر پڑے یا کیا ہوا، میں تقریر بھی کر سکتا ہوں، نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود مجھے پہلی دفعہ اس کا علم ہوا۔ اتفاق سے حضرت الاستاذ ٹونک میں نہیں تھے، رہتے تو روک دیا جاتا، مجھے کھلا میدان ملا، عوام نے مجھے اپنا واعظ بنا لیا، اور اب ہر ہر محلے میں جلسے ہونے لگے، اور مجھے تقریر پر مجبور کیا جانے لگا، دو [۲] تین [۳] تقریروں تک تو دماغی مواد سے کام لیتا رہا لیکن اس کے بعد ذخیرہ ختم ہو گیا، بنی ہوئی بات بگڑتی نظر آئی، مجبوراً خیال گزرا کہ وعظ کی

کوئی کتاب دیکھوں خدا کی شان اس راہ میں پہلی نظر امام غزالی کی احیاء العلوم پر پڑی، اب تک جو رازی کو دنیا کا خاتم العلماء سمجھتا تھا، چند ہی ابواب کے بعد میرا حال ہی دوسرا ہو گیا، دوسروں کو وعظ سنانے کے لئے کتاب کھولی تھی، لیکن معاملہ دوسرا ہوا غزالی کی ہر سطر مجھ پر نیشتر کا کام کرنے لگی اور

شد غلامے کہ آب جو آرد　　　آب جو آمد و غلام ببرد

اور دل جو اب تک گونگا بہرا بنا ہوا سینہ میں سویا ہوا تھا تڑپ اٹھا، میر زاہد، سید شریف، ملا باقر، ملا محمود، اور آخر میں امام رازی تک نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اب مجھ پر امام غزالی سوار تھے، وہی دورہ جو طلسم ہوشربا کے مطالعہ میں ابتدائی زندگی میں پڑا تھا، اب عین جوانی میں جب میری عمر انیس بیس کے درمیان تھی پڑا، اور سخت پڑا، اب تک گیلان کی زندگی جاہلیت معلوم ہوتی تھی لیکن اب ٹونک کا عہد بھی قریب قریب اسی شکل میں نظر آنے لگا معقولات کا نشہ اتر گیا، زندگی اور معمہ زندگی کے حل کا سودا سر پر سوار ہوا کچھ دن اس کے بعد جبراً قہراً میں نے ٹونک میں گذارے مگر اسی جنوں میں ایک دفعہ ہر چیز سے الگ ہو کر اجمیر شریف بھاگ گیا، خدا غریق رحمت کرے مولانا معین الدین مرحوم کو میری اس حالت کو دیکھ کر ان کو ترس آیا، اور خاص ترکیبوں سے انھوں نے پھر ٹونک واپس کر دیا مگر جی نہ لگا، اور دوسرے سال وطن سے بجائے ٹونک کے[1] اس آخری قتل گاہ میں پہونچ گیا، جہاں میری شہادت مقدر تھی یعنی دیوبند پہونچ گیا، دیوبند جس لفظ کو سطحیت کے مرادف خیال کرتا تھا، اب حقیقت کی تلاش میں اسی دیوبند کی طرف

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

جاننے والے دیوبندی و خیرآبادی لاگ ڈانٹ سے واقف ہیں، سینہ پر پتھر رکھ کر اس مدرسہ میں داخل ہوا

۱؎ ٹونک سے رخصت ہوتے ہوئے مولانا برکات احمد کے مدرسہ خلیلیہ کی دیواروں پر کوئلہ سے یہ لکھ کر روانہ ہوا۔

روزگارم بشد بنادانی　　　من نہ کردم شما حذر بکنید

میری روانگی کے بعد کسی نے مولانا تک یہ بات پہونچا دی بہت خفا ہوئے ۱۲

خدا جزائے خیر دے غزالیؒ کو اسیر ابن سینا دبا تو تو اس نے حضرت شیخ الہند کے حلقۂ حدیث میں پہونچا دیا کچھ دن کشمکش میں گذرے، عجب کٹھن دن تھے۔ آخر میں جبکی غلامی کی سرفرازی نصیب ہوئی، تعجب ہو سنے گا کہ تین مہینے تک اسکے مصافحہ سے کراہتہً یا اختیاراً محروم رہا۔ ایمان و یقین کے الفاظ سے آشنا تو تھا لیکن حقیقت سے بیگانہ۔ حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس دولت کی سعادت میسر آئی۔ اب تک مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سنا کرتا تھا کہ شعر و خطابت میں اچھے تھے لیکن ٹوٹی پھوٹی سہارنپوری اردو میں ان کے چند رسائل نظر سے گذرے، ایسا معلوم ہوا کہ اس زمانے میں جس علم کلام کی حاجت ہے حضرت پر اسی کا الہام ہوا ہر زبان سے قطع نظر کرکے مطالعہ میں مصروف ہوا، اور اسلام کا ایک جدید نظام سامنے آگیا۔ مولانا کی کتابوں کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا بھی مجھ پر اچھا اثر پڑا، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں جو فلسفہ ان بزرگوں نے تیار کیا تھا اس کا مذاق غالب ہوا۔ اسی مذاق کے سلسلہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی فتوحات پر بھی نظر پڑی، ایسا معلوم ہوا کہ میری کھوئی چیزیں سب اسی میں ہیں، حالانکہ اس کتاب کے فقروں پر فقرے میرے لئے ناقابل فہم ہوتے تھے، مگر جی مطالعہ سے نہیں گھبراتا تھا اور خواہ انکی مراد کچھ ہو، لیکن میری سمجھ میں اسلامی حقائق کے متعلق کوئی نہ کوئی بات ضرور آجاتی تھی، اور میری عقلی سیر کی انتہا شیخ اکبر ہی کی کتابیں ہیں۔ مجھ پر فصوص کا اتنا اثر نہیں ہے جتنا فتوحات کا، اس کتاب کے مطالعہ میں ہر چیز کا سمجھنا میں نے کبھی مقصود نہیں رکھا، بلکہ جو سمجھ میں آجائے اسی کو مقصود قرار دیا۔ شیخ اکبر کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "طبقات" سے اس سلسلہ میں مجھے خاص دلچسپی رہی اور فائدہ پہونچا۔ شیخ اکبر کے متعلق یہ عجیب بات ہو کہ ان کے خاص موضوع بحث وحدت الوجود سے مجھے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ خیرآبادی اسکول کے طالب علم ہونیکی وجہ سے تقلیداً اس خیال کو اچھا سمجھتا تھا لیکن خواہ مخواہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ اندرونی طور پر میرے میلانات اس کے خلاف تھے، اگرچہ اب یہ مسئلہ

میرے لئے بدیہی ہے اور جو بجائے چند وجودوں مثلاً اہرمن ویزداں یا مادہ روح قدمائے عالم سرچشمہ ذات واحد کو بتیے ہیں، اسکی ایک خاص تعبیر وحدت الوجود کو قرار دیتا ہوں، شہود وجود کے اختلافات کو لفظی اختلاف سمجھتا ہوں، بہرحال شیخ اکبر کا معتقد اس مسئلہ کے سوا دوسرے دینی حقائق میں تھا، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس ماحول میں میں نے ہوش سنبھالا تھا اسمیں مقلد و غیر مقلد کی بحث چھڑی ہوئی تھی، اسلئے ایک ہلکا سا تعلق مجھے اسلامی فروع کے اس اختلاف سے بھی کچھ دن رہا، مگر بہت جلد شیخ عبدالوہاب شعرانی کی کتابوں خصوصاً میزان الکبریٰ سے طبیعت سنبھل گئی۔ اور مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی کی کتاب تذکرۂ اعظم سے بھی خیالات میں اصولی ترمیم میسر آئی، نیز دیوبند کے دورۂ حدیث خصوصاً شیخ الہند اور علامہ کشمیری کے درس کا بھی اثر یہی ہوا کہ غیر متعصب حنفی ہو گیا۔ اور بحمداللہ اسوقت تک یہی حال ہو غیر متعصب کا مطلب یہ ہو کہ شافعی، حنفی اختلافات میری نگاہوں میں چنداں نہیں ہے ہر سلسلہ کے بزرگوں کا احترام دینی حیثیت سے کرتا ہوں اور خواہ مخواہ بلا ضرورت فتنہ پردازی کے لئے عوام کے سامنے ان فروعی اختلافات کو چھیڑ کر تفریق بین المسلمین جیسے کبیرہ کے ارتکاب کو مذہبی جرم خیال کرتا ہوں۔ مقلدیت غیر مقلدیت کے سوا اور دوسرے عصری خیالات مثلاً نیچریت یا انکار حدیث والی قرآنیت یا انکار تصوف والی وہابیت، ان چیزوں کا مجھپر کبھی اثر اسلئے نہیں ہوا کہ بچا مرحوم کی صحبت ہی میں سارے سوالات سے واقف ہو چکا تھا، اسلئے مجھے صرف جواب سوچنا پڑتا تھا۔ بہتوں کو دیکھتا ہوں کہ یہ سوالات اچانک ان کے سامنے آتے ہیں، ایک مدت سوالات ہی میں بسر کرتے ہیں، پھر توفیق رفیق ہوتی ہو تو جواب تک انکی رسائی ہوتی ہو۔ بحمداللہ سوال کی منزل میری طے شدہ تھی اسلئے جواب تک بآسانی رسائی ہوتی رہی۔

دیوبند میں میرا قیام کچھ دن تو طالب العلمی کی حیثیت سے رہا، اور کچھ دن مدرسہ کی ملازمت و خدمت میں گذرے کہ اچانک مقادیر نے مجھے حیدرآباد پہونچا دیا۔ مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن دانی کا شہرہ سن چکا تھا، خدا نے انکی صحبت کی سعادت سے سرفراز فرمایا۔ اور قرآن کے چند جدید

بلکہ مجھ پر مولانا کی صحبت میں کھلے کہ اسی عرصہ میں حیدرآباد کے ایک وکیل جناب ناظم (جج) ہیں، اور مولانا
محمد حسین اسم گرامی ہے، انکی ملاقات میسر آئی، حضرت کے طفیل میں قرآن مجید کی آیتوں کے استعمال کی ایک
نئی راہ معلوم ہوئی، بالآخر تھک تھکا کر اب جبکہ میری عمر اُنچاس کے قریب ہے، طلسم ہوشربا کی داستانوں سے شروع
کرکے "ذالک الکتاب لاریب فیہ" کو اپنے مطالعہ کی آخری کتاب قرار دیے ہوئے ہوں، یوں چونکہ مولویت
اور مدرسیت میرا پیشہ ہے اسلئے پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے کے لئے ہر قسم کی کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں، لیکن
ذوق مطالعہ و مراقبہ کی تکمیل صرف اسی کتاب سے ہو رہی ہے، اور حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ اب اسی پر خاتمہ ہو،
غالباً اب اسکے اظہار میں شاید کچھ مضائقہ نہیں کہ اسی قرآنی ذوق میں بحمداللہ قرآن کا ایک بڑا حصہ
بڑھاپے میں محفوظ ہو چکا ہے۔ خدا کرے کہ اسی مشغلہ میں عجیب و غریب تجربات والی یہ زندگی ختم ہو۔

ربنا انک تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ شیٔ
فی الارض ولا فی السماء انت ولیّ فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ایک لطیفہ۔ کتابوں کے افادہ کے سلسلہ میں ایک بات دماغ سے کبھی نہیں نکلتی، بچپن میں جب انگریزی شروع کی اور انگریزی کے حروف
ہجی کو پہچاننے لگا تو ایکدن عجیب واقعہ پیش آیا، میرے ماسٹر صاحب کے پاس انگریزی کی کوئی موٹی سی کتاب تھی جسے وہ پڑھ رہے تھے چھوڑ کر کسی
ضرورت سے وہ گئے، میں نے کتاب اُٹھالی اور دیکھنے لگا چونکہ انگریزی کا ہر حرف دوسرے سے جدا ہوتا ہے جو میں نے دیکھا تو کتاب کے ہر ورق
کی ہر سطر فر فر پڑھ رہا ہوں یعنی اسکے حروف پہچان رہا ہوں۔ میری مسرت کی اس دن انتہا نہ رہی کہ چند ہی دنوں میں انگریزی کی اتنی
بڑی کتاب میری سمجھ میں آنے لگی، اگرچہ بہت جلد اپنی غلط فہمی معلوم ہو گئی لیکن یہ ایسا مغالطہ ہے جو مجھے اکثر اب بھی اسلئے یاد آتا رہتا ہے کہ
جن چیزوں کے سمجھنے کی اسوقت مسرت حاصل ہے کہیں اسوقت بھی وہی مغالطہ پیش آ رہا ہو، کتابوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ زندگی
کے تمام حقائق کے متعلق مجھے کبھی کبھی اس قسم کا خواہ مخواہ خطرہ ہوتا ہے اور عہد طفلی کا یہ مغالطہ باعث عبرت بنا ہوا ہے خیالات کی رَو میں
ایک چیز بھول گیا، میری مراد ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم سے ہے ان دونوں مرحومین کے بعض خیالات نے میری ذہنی تربیت کی
تصحیح میں مدد کی ہے اور ناشکری ہوتی اگر ان کا ذکر قصداً ترک کر دیتا۔ اسی طرح حضرت تھانوی مدظلہ العالی کے بعض اقوال نے بعض
اسلامی حقائق کے سمجھنے میں میری بڑی رہنمائی کی ہے جزاہم اللہ عنا خیر الجزاء، قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کا
بھی ممنون ہوں، سیرت طیبہ کے بعض اہم رُخ انہیں کے اشارے سے میرے سامنے آئے۔ ایک خاص نسبت جس کا اظہار مناسب نہیں ہے
اسمیں مولانا جامی مرحوم کی غزل سرائیوں کو بڑا دخل ہے۔ قدس اللہ سرہ۔

شیراز ہند پورب

(۲)

از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

صوبۂ الہ آباد و اودھ | یہاں ہم کو صرف صوبۂ الہ آباد اور صوبۂ اودھ سے غرض ہے متنبی کا مشہور مصرع ہے

مصائب قوم عند قوم فوائد

یعنی ایک کی مصیبت دوسرے کی مسرت کا ذریعہ ہوتی ہے جس زمانہ میں خراسان و ایران تاتاریوں کے حملے سے زیر و زبر ہو رہے تھے، ہندوستان میں خلجیوں کا زمانہ تھا. ساتویں صدی کے اخیر سال گذر رہے تھے، دو بزرگ ایک صفی الدین جو حضرت امام ابوحنیفہ کی اولاد سے تھے اور دوسرے شمس الدین زاولی اپنے اہل وعیال کیساتھ ہندوستان آئے۔ اور دلی میں سکونت اختیار کی[۱] صفی الدین کے پوتے نظام الدین و شمس الدین کے بیٹے شہاب الدین نے علمائے دہلی کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے اور نامور ہو کر دلی میں ہنگامۂ درس بلند کیا۔ اور شہاب الدین ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے سربلند ہوئے۔

جونپور | دلی بگڑ کر پورب کئی دفعہ آباد ہوا، دو آبادیاں تو آنکھوں کے سامنے ہیں دلی پر جب نادر شاہ درانی و احمد شاہ ابدالی اور جاٹوں کی چڑھائی ہوئی تو کتنے باکمال لکھنؤ اور عظیم آباد کو چلے آئے. پھر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریزوں نے دلی کو تباہ کیا تو پھر دلی بگڑ کر پورب آباد ہوا. اسیطرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلی کو غارت کیا تو ارباب فن و کمال نے پورب کا رخ کیا اس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خود مختار شرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی. شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی اور جونپور آکر رخت اقامت ڈالا. بادشاہ وقت نے بیش از بیش قدردانی کی.

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا. ان سے تین لڑکے ہوئے صفی الدین

۱؎ تاریخ علمائے ہند ص ۹۶

فخر الدین اور رضی الدین تینوں نے اپنے نانا کے درس و کمال سے فیض پایا۔ شیخ صفی الدین نے درس و افادہ کا بازار گرم کیا۔ ہو عربی صرف و نحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی انھیں کی تصنیف ہے شیخ صفی الدین اس زمانہ میں ردولی جاکر سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی سے جو ان دنوں وہاں مقیم تھے مرید ہوئے شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر تھے۔ ان بھائیوں کی اولادوں نے ردولی ہی میں سکونت اختیار کی جن کے سلسلے میں اب تک نعمانی شیوخ کی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے شیخ صفی الدین نے ۸۱۹ھ میں وفات پائی شیخ صفی الدین کے دو بیٹے تھے۔ ایک ابو المکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ یہ وہی ہیں جن کے لئے صفی نے دستور المبتدی لکھی اور انھیں کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کو اپنی فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔ اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پاکر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد میں جس کا نام مسجد اٹالہ ہے دفن ہوئے۔

یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ پودا دلی سے لائے تھے دلی میں انھوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر شریحی کندی سے جن کا عربی قصیدہ لامیہ مشہور روزگار ہے تحصیل علم کی جونپور کی مسند پر جب آکر وہ بیٹھے تو ان کے فیض و کمال سے مشرق کی ساری سرزمین لہلہا اٹھی کڑہ سے لیکر غازی پور تک یکساں یہ فیض جاری ہوا۔

اودھ صوبۂ اودھ کا پرانا مرکز تو اجودھیا تھا۔ اجودھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا جو بعد کو فیض آباد مشہور ہوا حضرت شاہ ابو العباس المتوفی ۷۰۳ھ اور شیخ بہاؤ الدین اکبر المتوفی ۸۰۸ھ شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کر رہے ہیں اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دار السلطنت بنایا ۱۱۹۴ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۲۱۲ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہو چکی تھی

لکھنؤ لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا چونکہ قنوج اور جونپور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی، اس لئے

رفتہ رفتہ اوسکی آبادی بڑھنے لگی۔ تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملہ کے بعد ~~۸۰۲~~ھ میں ملتا ہے تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا۔ اور ظفر خاں نے گجرات میں خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج واودھ وکٹرہ اور جونپور میں۔ اور خضر خاں نے لاہور ودیپالپور وملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں۔ تو ملو اقبال خاں نے دو آبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی مبارک شاہ نے پورب میں اسکے پاؤں جمنے نہ دیے۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے۔ فرشتہ میں ہے۔

"ملو اقبال خاں بقنوج رفتہ خواست کہ بجونپور ولکھنؤ در آید" (ص۱۰۹ نولکشور)

اس سے معلوم ہوا کہ جونپور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی۔ اسلام کی بہت سی آبادیاں ان نفوس قدسیہ کی یادگار ہیں جو آبادیوں سے نفور ویرانوں اور سنسان میدانوں کی تلاش میں رہتے تھے لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے۔

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطین تغلق کے زمانے میں تھے۔ اور جنھوں نے ~~۸۵~~ھ میں وفات پائی ہے۔ اُن کے مرید وخلیفہ شیخ قوام الدین تھے۔ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ مقبرہ او در لکھنؤ است بیرار ومتبرک ~~۱~~ انھوں نے ~~۸۴۰~~ھ میں وفات پائی۔ ان کے مرید وخلیفہ شیخ سارنگ تھے جنھوں نے ~~۸۵~~ھ میں رحلت کی ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ میناؔ ہیں۔ جنکا مزار لکھنؤ میں (موجودہ میڈیکل کالج کے پاس) ہے مخدوم شیخ میناؔ نے ~~۸۸~~ھ میں انتقال فرمایا۔

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آکر گومتی کے کنارے لکھنؤ میں بسے تھے۔ تاتاریوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاؔ الدین کرمانی کرمان سے ہندوستان آئے اور شیخ موصوف سے ملنے کے لئے وہ لکھنؤ وارد ہوئے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ اُن کے پرپوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں۔ جو بڑے عالم ہوئے ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو علم وفضل کا مرکز بنایا۔ وہ اس تحفہ کو جونپور سے لائے۔

~~۱~~ ص ۱۳۶

تیموری حملہ کے زمانہ میں جو لوگ دلی سے جونپور گئے تھے۔ ان میں سے قاضی عبد المقتدر دہلوی کے پوتے شیخ ابوالفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ و شاعر مدرس تھے۔ اور قاضی شہاب الدین کے معاصر ہم استاد تھے ۸۵۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے دامن تربیت میں شیخ اعظم پل کہواں ہوئے۔ اور لکھنؤ میں جاکر مسند درس بچھائی۔ شیخ اعظم کے تلامذہ ضیا لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیرآبادی المتوفی ۹۲۲ھ ہیں۔

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور تیسرا خاندان شیخ سماء الدین لکھنوی کا ہے انکے صاحبزادہ شیخ الاسلام سعد اللہ فراز کندوری ہیں ۹۲۹ھ میں وفات پائی! اور انکے جانشین اور صاحبزادے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں۔ اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل و کمال کی شمعیں روشن تھیں۔ ہمارے کتب خانہ میں شیخ امین کے مکتوبات اور انکے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں۔ انکے دوسرے فرزند شیخ سعد الدین لکھنوی ہیں جنھوں نے ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی تاریخ علمائے ہند کا بیان ہے۔

"مدام بدرس وافادہ علوم دینیہ اشتغال داشت و در مدرسہ وی طلبہ مستعد رجوع می کردند[۲]"

شیخ امین الدین کے صاحبزادے شیخ حامد تھے جن کے نام مکتوبات میں متعدد خطوط ہیں۔ اس نسخہ کے آخر میں اس خاندان کے ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام و نسب لکھا ہے:۔

شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین بن شیخ الاسلام شیخ سعد الدین بن زائر الحرمین الشریفین شیخ سماء الدین بن بندگی حضرت مخدوم قاضی فخر الدین بکلوی (؟)

لکھنؤ کے پاس کسنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، یہاں ایک بزرگ شیخ عبد القادر بن شیخ سلطان جو مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث کی اولاد سے تھے پیدا ہوئے۔ انھوں نے لاہور جاکر علم کا فیض حاصل کیا۔ اور لکھنؤ آکر درس و افادہ کی نہر بہائی۔ اور چالیس برس تک یہ روانی جاری رہی لکھنؤ کے اطراف میں انکے ذریعہ بڑا علم پھیلا۔ ان کا

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۶۲ [۲] تاریخ علمائے ہند ص ۲۳

[۳] تاریخ علمائے ہند ص ۵۵

ناگیارہویں صدی ہجری کا وسط ہے۔ ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب کا ہے جنکی نسبت سے لکھنؤ میں گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہے۔ ۸۰؁ھ میں وفات پائی۔ ان کا اصل وطن جونپور کے ضلع کا مشہور قصبہ منڈیا ہے۔ گر عمر لکھنؤ میں گذاری۔ اور یہیں دفن ہوئے۔ شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد و خلیفہ شیخ محمد آفاق لکھنوی، محمد رضا لکھنوی اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی دراصل پٹنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ تقدیر لکھنؤ کھینچ لائی۔ اور اپنے پیر کے پائینتی آسودہ ہیں۔

موجودہ اعظم گڈھ اور غازی پور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہے جو اس وقت اعظم گڈھ کے ضلع میں ہے یہاں کی خاک سے ایک نامور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے میر محمد شفیع بھی شیخ عطاء اللہ کے شاگرد تھے۔ شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے، پھر میر محمد شفیع سے اور آخر میں سند فراغ شاہ پیر محمد صاحبؒ سے حاصل کیا۔ اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علماء نے انکی شاگردی پر ناز کیا۔ اور شاہ عالم بہادر شاہ انکی ملاقات کا مشتاق ہوا ۱۱۲۶؁ھ میں وفات پائی۔ اور لکھنؤ کی خاک میں ہمیشہ کے لئے آرام کیا۔

فرنگی محل | اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہے جو لکھنؤ کے افق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑگئے اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر انکے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا۔ یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا یہ انصار کرام کا خاندان تھا جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا جس میں مولانا حالی وغیرہ اشخاص پیدا ہوئے اور دوسرا خاندان اودھ آکر سہالی میں آباد ہوا۔ ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نامور ہیں اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے۔

میر فتح اللہ شیرازی | میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لیکر ہندوستان وارد ہوئے اور ۹۹۰؁ھ میں اکبر شاہ تک پہونچے اکبر نے بڑی بڑی قدر کی۔ ۹۹۷؁ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کیلئے مرجھا گیا اور آ

۱؎ تاریخ علمائے ہند ص۱۰۱　۲؎ ماثر کرام آزاد ص۲۱۱

یادِ ایّام

(دور فاروقی)

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم، اے انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

خاندان بنی عباس کی ایک شاخ ایک زمانہ سے قصبہ چریاکوٹ ضلع اعظم گڈھ میں مقیم ہے اس خاندان کے چشم و چراغ، دو بھائی مولنا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی اور مولنا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی تھے۔ بڑے بھائی کو حکمت و ریاضی سے بیحد دلچسپی تھی گھر کی معقول زمینداری تھی اسی پر بسر اوقات تھی عنفوان جوانی میں گھر سے تلاش علم میں نکل گئے اور پانچ برس تک غائب رہے اب گھر لوٹے تو دولت علم سے مالامال اسپر طرہ یہ کہ کلکتہ میں مدتوں یہودیوں میں رہ کر عبرانی میں مہارت پیدا کرلی عہد قدیم کے ہر صحیفہ میں کمال تھا سب سے بڑھ کر یشوع بنی کے صحیفہ جو مخلوط آرامی اور عبرانی ہے جسکی مشکلات ایک یہودی سے پڑھ کر خود مجھے معلوم ہیں اُن کو اسپر عبور تھا۔ اُن کی کتاب بشریٰ جو افسوس ہے کہ شائع نہ ہوئی انکی عبرانی میں مہارت کا ثبوت ہے عربی کی ادب بھی اچھی تھی۔ یہ وہی مولنا عنایت رسول صاحب ہیں جنسے سرسید نے اپنے خطبات احمدیہ اور شرح صحائف میں استفادہ کیا ہے بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی تعلیم کی۔ ذہن ثاقب طبیعت حاضر استعداد معقول تھی پھر بھائی کی پدرانہ شفقت کمی کیوں رہجاتی۔ کچھ شدبد عبرانی بھی جانتے تھے۔ مجھے کچھ بتائی تھی گر علی گڈھ پہونچکر میں نے خود ڈاکٹر ہارویز سے جب ایف اے اور بی اے میں عبرانی پڑھی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت تھوڑی جانتے تھے بھائی کے علاوہ فرنگی محل کے مولنا سعد اللہ صاحب سے بھی تلمذ تھا بڑے کٹر حنفی تھے وفات سے پہلے غازیپور میں ایک غیر مقلد عیادت کو آئے تو منہ پھیر لیا اور کہا لاحول ولاقوۃ آخر وقت یہ صورت نظر آئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاگرد[1] نے زمانہ طالب علمی میں ایک اسکات المبتدی لکھی اور بڑے ہوکر مصنف سیرۃ النعمان بنے اور نعمانی استاد کا رکھا ہوا لقب عمر بھر اختیار کیا جو اُن کا اور ان کے خاندان کا آجتک سرمایہ ناز ہے۔ ہمارے مولنا کو فارسی میں بھی بڑی مہارت تھی فارسی کی خالق باری

[1] علامہ شبلی نعمانی

مجھکو اور اپنے بیٹے مولوی یٰسین مرحوم کو پڑھائی تھی مگر چھپی نہیں علامہ فرماتے تھے کہ "میری فارسیت جو کچھ ہے وہ انہیں کی جوتیوں کا طفیل ہے" نرے کھرے مولوی نہ تھے قانون اور زمینداری خوب سمجھتے تھے وکالت بھی کر چکے تھے۔

مولنا کا دارالعلوم میں ورود

جس زمانہ کا ذکر ہے اس زمانہ میں مولنا مدرسہ احیاء العلوم میں مقیم تھے اس وقت وہ مدرسہ بڑا پر رونق تھا مگر اب نام ہی نام باقی ہے مشاہرہ وہاں بجانے کیا تھا مگر یہاں سے پچھتر روپیہ کا پیام گیا اس وقت کے لحاظ سے یہ مشاہرہ آجکل کے مٹ ... کی برابر تھا مولنا حفیظ اللہ صاحب مدظلہ پاتے تھے مفتی صاحب للٹہ مولنا عبدالشکور صاحب مد منشی واجد علی کو عنہ ہی ملتے تھے غرض سب مراحل طے ہو گئے تو مولنا تشریف لے آئے۔

اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما

قد لمبا تھا دوہرا بدن تھا چہرہ گول تھا ریش مبارک سفید تھی سر کے بال برابر کٹے ہوئے تھے کچھ خفیف سا خیال ہوتا ہے کہ حنا غرا... تے تھے چہرہ پر خشکی زیادہ تھی مگر رنگ صاف مائل بسرخی تھا چھوٹی مہری کا غرارے دار پائجامہ پہنتے تھے اور کرتہ لمبا جو قصباتی شرفا پہنتے ہیں مولویانہ نہیں مگر افتاد طبیعت کی بنا پر ہمیشہ گریباں کھلا رہتا تھا بند باندھنا طول عمل تھا عمامہ اور عبا بجز مواقع کے نہ استعمال فرماتے سر پر قالب کی گول ٹوپی ہوتی مگر شاید قالب پر چڑھتی کم تھی۔ مدرسہ میں جب تشریف لائے تو سفید عمامہ اسی ٹوپی پر باندھے اور ایک سفید عبا کسی ڈوریے کی پہنے تھے پاؤں میں سلیم شاہی جوتہ تھا ایک درجہ کا معائنہ فرمایا اور پھر واپس گئے۔ شام کو عم محترم کی کوٹھی پر ملنے تشریف لائے تو ہم دونوں بھائی پیش ہوئے اور بس اسی وقت سے تعلیم شروع ہو گئی کیا معنی کہ چند صیغے انھوں نے پہلی ملاقات میں پوچھ لئے نہ بتا پائے انکی تعلیل کر کے خود سمجھا دئے اب ہم ان کے سپرد کر دیئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس مدرس کے پاس ہمارے اسباق ہوتے اس درجہ میں وہ بیٹھکر ہم کو خود پڑھاتے تھے جب ذرا بڑے ہوئے تو پھر مطالعہ بھی سب طلبہ کے ساتھ بیٹھکر دارالعلوم جا کر انکی نگرانی میں کرتے تھے نحو میر شروع ہو چکی تھی مولنا عبدالشکور صاحب سے پڑھتے تھے ولی پسرا تک پڑھی تھی ایک بہاری طالب علم ہمارے ساتھ تھے ان کا نام ولی تھا لہذا ولی پسر کی تکرار پر وہ بہت چڑھتے

اور ہم کو لطف آتا تھا۔ مرکب اضافی کی بحث شروع ہوئی تو مشق کے لئے ہماری سلیٹیں چلنے لگیں مرکب توصیفی میں صفت موصوف کا تطابق ایسا مشق ہو گیا تھا کہ آجتک انشا میں یہ غلطی خواب میں بھی نہیں ہوتی۔ اس مشق اور موقع کمال میں تو اس انسپکٹری کی بدولت کھویا گیا۔ حضرت مولٰنا محمد علی صاحب نے انکو اپنا مرکوز ذہنی خوب سمجھا دیا اور وہ تو گئے کہ انکی طبیعت کو اُن کا خیال بھا گیا۔ ورنہ ناممکن تھا پھر کیا تھا جو ذہن میں تھا وہ خارج ہونے لگا۔ علم الصیغہ کی پھر سے مشق شروع ہوئی تاج المصادر کے مصادر چھان ڈالے گئے مولویوں نے صرف ونحو اور خاصکر سینوں میں افلاطونی عشق تھا سراپا سے پاک کوئی معشوق تھا شرح ملا تک پڑھ گئے مگر زبان کچھ نہ تھی اپنی ادب سے ناشناس رہے۔ اب اس مشق کے لئے پنجاب میں ایک ابتدائی کتاب منتخبات العربیہ طیار ہوئی تھی ایک حصہ میں جملے اور دوسرے میں چھوٹے چھوٹے قصے تھے وہ شروع کرادی گئی سبق ایک گھنٹہ میں چار جملوں سے زیادہ نہ تھا مقصود کتاب کا چڑھانا نہ تھا بلکہ استعداد کا پیدا کرانا تھا سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ کلکتہ کی چھپی ہوئی منتہی الارب اگر کہدی گئی جسکی ایک ایک جلد ہم کو بھاری معلوم ہوتی تھی اس کا استعمال سکھایا پھر ہر ہر لفظ لغت سے نکلواتے اور ایک بیاض پر لکھواتے اس کے بعد جملوں کی ترتیب اور ترکیب پر غور کراتے پھر اس کے معنی کہلاتے تحلیل صرفی اور ترکیب نحوی کا خیال اور بعد کو یہ اصطلاح اپنے امتحانات کے لئے میں نے بیس برس ہوئے وہیں سے تراشی غرض اسی طرح مشق ہو کر بنی خدا خدا کرکے چھ ماہ میں منتخبات العربیہ ختم ہوئی اب نحو میر کے بعد اپنی ایک تصنیف منظومہ نحو فارسی میں جو ندوہ نے طبع کرائی تھی زبانی یاد کرادی یہ کتاب ہم کو مولنا عاشق علی صاحب قبلہ میرٹھی جو اس وقت دار العلوم میں مدرس تھے انھوں نے پڑھائی تھی۔ اب ستم ظریفی سنئے زمخشری کی الکلم النوابغ جس کا بہتوں نے تو نام بھی نہ سنا ہوگا ادب میں شروع ہو گئی مگر ہماری استعداد ایسی تھی کہ ہم کو گراں نہ گزری اب علم الصیغہ اور نحو میر سے آگے بڑھکر زبدہ اور فصول اکبری۔ اور ہدایۃ النحو ہم پڑھنے لگے۔ فصول اکبری میں خاصیت ابواب پر بہت زور دیا گیا وہ اب تک یاد ہیں ایک حد تک مگر خاصیت کا راز جب عبرانی کی صرف و نحو پڑھتے تھے تب کھلا کہ زیادتی الفاظ زیادتی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ سیبویہ نے یہی بات الکتاب میں کہیں لکھی ہے مگر الکتاب کوئی مولوی پڑھتا ہے ہم لوگوں کی تعلیم قرأت

تجوید کی مشق کے لئے ایک قاری صاحب، قاری پیران شاہ تھے انسے مشق کرتے تھے مولنا ایسے خفا ہو گئے کیونکہ بھی وہ بازاری مذاق کے آدمی ان کے یہاں سے ہٹا کر مخارج حروف کی بحث یاد کرا دی۔

جب منطق کی تعلیم کا وقت آیا تو کبریٰ سے پہلے قواعد منطق اردو میں مع مثالوں کے لکھائیں ہدایت تو مولنا کی تھی مگر پڑھاتے مفتی صاحب تھے اب جو کبریٰ شروع کی تو عام طالب علموں کے مقابلے میں اس کو خوب سمجھا مجموعہ منطق میں کبریٰ کے بعد صرف تہذیب زبانی یاد کر لی گئی پھر آگے چل کر اسی مصنف کی تہذیب الکلام ایک قلمی نسخے سے زبانی یاد کی تھی مگر تہذیب کے ساتھ ساتھ ہر بیان پر مفتی صاحب مفصل املا کراتے جس سے شرح تہذیب کے لفظی مباحث کے سوا شرح تہذیب سے زیادہ مسائل یاد ہو گئے۔

دار العلوم میں ایک درجہ ہم سے اوپر تھا جس کو زیادہ تر ہمارے مولنا حفیظ اللہ صاحب پڑھاتے تھے نصاب تو اصلاح شدہ تھا مگر وہ درجہ چڑھا ہوا نہیں کے خراب پر تھا اس لئے مولنا اس کو منہ نہیں لگاتے تھے اور وہ انکے نزدیک مرفوع القلم بنا، اب ہم سے نیچے بھی دو درجے اور پیدا ہو گئے تھے۔ سنئے حضرت شاہ فضل الرحمان صاحب کے مریدین ایک بزرگ رنگ کے تھے ہر وقت عشقیہ اشعار پڑھتے تھے اور بڑے باذاق تھے دار العلوم کے کھلنے سے پہلے وہ ہمارے یہاں آتے جاتے تھے بھوپال میں ان کا قیام ایک مدت تک رہ چکا تھا ہم انسے بہت مانوس تھے ان کا اسم گرامی شاہ تجمل حسین صاحب ناظرین اس کا دائرہ ان کو معاف کریں گے یاد ایام تو ہمیشہ سے بات ہی بات پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ایک عزیز ابو حبیب صاحب بھوپال میں طالب علم کرتے تھے وہ زمانہ نواب صدیق حسن خاں صاحب ملک بھوپال کا تھا احناف کو چھوڑ کر شوافع وہ اہل حدیث علم کا ایک شیخ نواب صاحب کے گرد تھا نواب صاحب علم دوست تھے خود بھی جید عالم تھے اتنے وسیع النظر تھے کہ جوع الشہدت کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس دور میں ایک طالب علم وہاں حدیث کی تعلیم سے سیراب ہو کر سیر درواز ہ تقشبندان مجددیہ کی خانقاہ میں بھٹک نکلتا ہے شریعت پڑھی سب طریقت سے بیگانگی ہی نہیں بلکہ اکراہ غالب ہے یہ زمانہ میرے پیر مرشد حضرت سیدنا پیر ابو احمد صاحب رح کا ہے نواب صاحب سے خوب چل رہی۔ بعض مجدد صاحب کی اولاد حضرت شاہ عبد الغنی صاحب اور شاہ

ابوسعید صاحب کے سکھائے ولبند فن دانی اپنر ختم ہوگئی۔ وہ طالب علم شیخ سے بحث کر گذرتا ہے شیخ کو اس غیر مقلد قلب میں استعداد تام نظر آتی ہے وہ گرویدہ ہو جاتا ہے، طالب علم کو دلچسپی ہو جاتی ہے حیثیا حاضر ہوتا ہو مگر یہی ناشناسی ابن تیمیہ شیخ کا ماحی نصرت اپنی طرف کھینچتی ہے چند دنوں میں قدموں پر گر کر گڑگڑاتا ہوا آپڑتا ہے اور کہتا ہے نہ جانے میرا کیا حشر ہوگا اس کا تو انتظار تھا شیخ اپنے آغوش شفقت میں لے لیتا ہے پھر کیا تھا پہلے ہی سے تاک لیا تھا تعلیم و تربیت شروع ہو جاتی مراتب کی تکمیل ہوتی رہی آخر انکو اور حضرت انکو تھوڑی مدت میں خلافت عطا ہوتی ہے اور وہ حکیم شاہ ابو حبیب صاحب ہو جاتے ہیں مجھے اُن سے ملاقات نہ ہونیکا ہمیشہ قلق رہے گا۔ (یہ واقعہ خود پیر و مرشد کا بیان کیا ہوا ہے)

اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ شاہ تجمل حسین صاحب کے ایک عزیز اور شاہ ابو حبیب کے پرداختہ ایک طالب العلم بہار سے آکر داخل ہوتے ہیں یہ تو کیسے کہدوں کہ مور گرد راہ آمدہ بود مگر ہو رہا گرد عارض ضرور آمدہ بود ہم سے ایک درجہ نیچے داخل ہوتے ہیں ظاہر میں خاموش تھے مگر چھیڑنے کو دل چاہا خیال ہوا کہ گھر چھٹنے کا ملال ہے اس لئے کچھ دن طبیعت کو روکا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خاموشی کچھ فطری ہے جو بعد کو علامہ کو بصورت جمود محسوس ہوئی مگر بے تکلفی ہوتے کیا دیر لگتی ہے ہمارے ایک ہم جماعت منشی صدیق حسن مانکپوری فرزند جلیل مرحوم سے تعلقات پیدا ہو گئے اور پھر ہم سے بھی ملاقات اور بے تکلفی ہو گئی۔ عمر بھر ساتھ رہا پڑھتے اور مقابلہ کرتے مگر محبت ایسی تھی کہ مخالف آب و ہوا اور متضاد ماحول میں رہ کر بھی محبت میں فرق نہ آیا اُن کا جمود ٹوٹ کر حرکت ہوئی اور اس وقت تک گویائی مساعدت کر رہی ہے مگر وہ انکی گویائی انکو مبارک میں نے جوان کا جمود اختیار کیا تو آج پورے تیس۳۰ برس کے بعد انکی فرمائش پر یہ مہر سکوت ٹوٹی "محسن کتابیں" پر کیا لکھتا ایک صاحب نے لکھا تو کچھ نہ بتایا انھوں نے خود لکھا تو شرما گئے پوچھئے شرع میں شرم کیا عبدالماجد صاحب بی اے نے سچ بات کہدی اس لئے میں نے یادایام لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ۵ برس سے لیکر ۱۰ برس کے سن تک کے حالات ہیں۔

باقی داستان فردائے شب را

حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ

(۲)

- از عبد السلام قدوائی

- موسیٰ ابن عقبہ کا بیان ہے۔

وضع عندنا کریب حمل بعیر او عدل بعیر من کتب ابن عباس قال فکان علی ابن عبد اللہ بن عباس اذا اراد الکتاب کتب الیہ ابعث الی بصحیفۃ کذا وکذا قال ینسخھا فیبعث الیہ احداھما۔[1]

کریب نے ہمارے پاس ایک اونٹ کے بار عبد اللہ ابن عباس کی کتابیں رکھیں علی ابن عبد اللہ ابن عباس جب کوئی کتاب چاہتے تو انھیں لکھ دیتے کہ مجھے فلاں صحیفہ بھیج دو وہ اسے نقل کرتے اور ان میں سے کوئی ایک بھیج دیتے۔

انکی یہ تصانیف انکی زندگی ہی میں دور دور تک پھیل گئی تھیں اس سلسلہ میں امام طحاوی نے خود انکا بیان نقل کیا ہے

عن ابن عباس ان ناسا من اھل الطائف اتوہ بصحف من صحیفۃ لیقرءھا علیھم فلما اخذھا لم ینطلق فقال انی لما ذھب بصری بلھت فاقرءوھا علی ولا یکن فی انفسکم من ذلک حرج فان قراءتکم علی کقراءتی علیکم[2]

عبد اللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ طائف کے کچھ لوگ ان کے پاس انکی کتابوں میں سے کچھ کتابیں لیکر آئے تاکہ وہ انھیں پڑھ کر سنا دیں عبد اللہ ابن عباسؓ نے وہ کتابیں لیلیں جب پڑھ نہ سکے تو فرمایا کہ جب سے میری نگاہ جاتی رہی میں بیکار ہو گیا ہوں تم لوگ خود میرے سامنے پڑھو اس میں کوئی حرج نہ سمجھو میرے سامنے تمہارا پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ میں تمہارے سامنے پڑھوں

تصنیفات کی اس کثرت کو دیکھ کر تعجب نہ ہو حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے آنحضرت کے اعمال واقوال کے جمع کرنے میں غیر معمولی محنت کی تھی خود ان کا بیان ہے کہ

---

[1] طبقات جلد ۵ ص ۲۱۶ [2] شرح معانی الآثار جلد ۲ ص ۳۸۶

لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم وانا شاب قلت لشاب من الانصار يا فلان هلم نسأل اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ونتعلم منهم فانهم كثير قال العجب لك يا ابن عباس اترى الناس يحتاجون اليك وفي الارض من ترى من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فتركت ذلك واقبلت على المسئلة وتتبع اصحاب الرسول صلى الله عليه وسلم فان كنت لآتي الرجل في الحديث يبلغني انه سمعه من رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجده قائلا فاتوسد ردائي على بابه تسفي الريح على وجهي حتى يخرج فاذا خرج قال يا ابن عم رسول الله صلى الله عليه وسلم مالك فاقول حديث بلغني عنك انك تحدثه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاحببت ان اسمعه قال فيقول فهلا بعثت الي حتى آتيك فاقول انا احق ان آتيك فكان الرجل بعد ذلك يراني وقد ذهب اصحاب رسول الله صلى الله عليه واحتاج الناس الي فيقول كنت اعقل مني[1]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو میں نوجوان تھا میں نے ایک انصاری نوجوان سے کہا کہ اے صاحب آئے ہم لوگ صحابہؓ سے مسائل دریافت کریں اور اُن سے سیکھیں. کیونکہ وہ بہت کافی تعداد میں موجود ہیں اس شخص نے جواب دیا! اے ابن عباس تم پر سخت تعجب آتا ہے دیکھ رہے ہو دنیا میں آنحضرتؐ کے کیسے کیسے صحابی موجود ہیں کیا لوگ تمھاری ضرورت محسوس کرینگے یہ سنکر میں نے اسے چھوڑ دیا اور خود صحابہؓ کی تلاش و جستجو میں نکل کھڑا ہوا اور ان سے مسائل دریافت کرنے لگا میری حالت یہ تھی کہ مجھے معلوم ہوتا کہ فلاں صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر وہ آرام کرتے ہوتے تو میں انکے دروازہ پر چادر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہوا کے جھونکے میرے چہرہ پر لگتے رہتے یہاں تک وہ برآمد ہوتے تو مجھ سے دریافت کرتے اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر عم زاد خیر تو ہے میں عرض کرتا مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں جی چاہا کہ میں سے سنوں وہ فرماتے مجھے کیوں نہیں بلا بھیجا میں خود آپ کے پاس آجاتا میں جواب دیتا نہیں میں آپکے پاس آنیکا زیادہ مستحق ہوں اب اسوقت جب کہ صحابہؓ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور لوگ میرے محتاج ہیں وہ انصاری نوجوان کہتا ہے آپ مجھسے زیادہ عقلمند تھے

[1] جامع صـ۲۲

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعب کیساتھ انھیں خاص اختصاص و تقرب حاصل تھا اس لئے انکی روایات بھی عبداللہ بن عباس کے علم میں تھیں[1]

روایت حدیث میں حضرت ابو ہریرہ کو خاص امتیاز حاصل ہے آج حدیث کی کتابوں میں انکی بکثرت روایتیں موجود ہیں جنکی تعداد ۵۳۷۴ تک پہونچتی ہے حضرت ابوہریرہ نے حدیثوں کے حفظ و ضبط اور جمع و ترتیب میں غیر معمولی محنت و جانفشانی سے کام لیا اسلام کے بعد عرصہ تک زن و فرزند کے جھمیلے سے الگ اور فکر معاش سے بے پروا ہو کر مسجد نبوی کے چبوترے (صفہ) پر شبانہ روز حاضر رہتے آنحضرتؐ کی ایک ایک بات سنتے ایک ایک عمل کو دیکھتے اور اسے یاد کرتے خود ان کا بیان ہے۔

ان اصحابی من المهاجرین کانت تشغلهم صفقا	میرے مہاجر ساتھیوں کو بازار کی خرید و فروخت مشغول رکھتی تھی
تهم بالسوق وان اصحابی من الانصار کانت	اور انصار کھیتی باڑی کے کام میں مصروف رہتے تھے میں ایک مسکین
تشغلهم ارضوهم والقیام علیها وانی کنت امرأ	آدمی تھا اکثر خدمت نبوی میں حاضر رہتا جب وہ غائب ہوتے
مسکینا وکنت اکثر مجالسة رسول الله صلی الله	تھے تو میں حاضر ہوتا تھا جب وہ بھول جاتے تھے تو میں یاد کرتا
علیه وسلم احضر اذا غابوا واحفظ اذا نسوا و	تھا ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے حدیث
ان النبی صلی الله علیه وسلم حدثنا یوما فقال	بیان کی پھر فرمایا کہ کون اپنا کپڑا پھیلاتا ہے کہ میں اس پر اپنی
من یبسط ثوبه حتی افرغ فیه من حدیثی ثم	حدیث ڈال دوں پھر وہ اسے سمیٹ لے، اس کے بعد وہ جو کچھ
یقبضه الیه فلا ینسی شیئا سمعه منی ابدا	مجھ سے سنے گا کبھی فراموش نہ ہوگا چنانچہ میں نے اپنا کپڑا پھیلایا
فبسطت ثوبی او قال نمرتی فحدثنی ثم قبضته	آنحضرتؐ نے حدیث بیان فرمائی پھر میں نے اسے سمیٹ لیا۔ خدا
الی فوالله ما کنت نسیت شیئا سمعته منه[2]	کی قسم اسکے بعد میں نے آپ سے جو کچھ سنا کبھی فراموش نہیں ہوا۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ذکر حضرت عبداللہ ابن عباس [2] طبقات ابن سعد القسم الثانی من الجزء الرابع ص ۵۱ بخاری کتاب العلم باب حفظ العلم میں بھی یہی بات کسی قدر اختصار کے ساتھ موجود ہے۔

انھوں نے رات کے تین حصے کردیے تھے ایک میں سوتے، ایک میں عبادت کرتے اور ایک حصہ میں حدیثیں یاد کرتے۔ اس طرح احادیث کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ ہوگیا تھا۔ بعد کو انکی زندگی ہی میں یہ روایات کتابی شکل میں جمع ہوگئی تھیں اور دورہ ورنگ کیا گئی تھیں سے سلسلہ میں چند نسخے اب تک مشہور ہیں۔

ایک نسخہ بشیر ابن نہیک نے مرتب کیا تھا ان کا بیان ہے کہ

کنت اکتب ما اسمع من ابی ھریرۃ[1] میں ابوہریرہ سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا۔

دوسرا مجموعہ حسن بن عمرو بن امیہ الضمیری کے پاس تھا[2]۔

تیسرا مشہور مجموعہ ہمام ابن منبہ کے پاس تھا، یہ مجموعہ عرصہ تک موجود رہا

امام احمد نے اپنی مسند کی تیسری جلد میں صفحہ ۳۱۲ سے ۳۱۸ تک اس کو نقل کیا ہے[3]۔ بعد کو اصل صحیفہ کا پتہ نہیں چلتا تھا، یہاں تک کہ یہ خیال ہوگیا تھا کہ وہ کہیں ضائع ہوگیا، لیکن اب پتہ چلا ہے کہ وہ برلن کے کتب خانہ میں موجود ہے[4]۔

ان مختلف مجموعوں کے علاوہ جو ان کے شاگردوں نے مرتب کئے تھے، خود حضرت ابوہریرہ نے بھی ایک مجموعہ مرتب کرکے اپنے پاس رکھا تھا۔ اور کبھی کبھی لوگوں کو دکھاتے تھے[5]۔

کثیر الحدیث صحابہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر کا دوسرا درجہ ہے۔ محدث ابن جوزی نے انکی موجودہ روایتوں کی تعداد ۲۶۳۰ بتائی ہے شروع میں یہ بھی کتابت حدیث کو پسند نہ کرتے تھے لیکن بعد کو جب اس کی ضرورت محسوس کی تو لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے ممتاز شاگرد نافع ان کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے[6]۔ مجاہد اور سعید ابن جبیر بھی انکی روایتیں لکھا کرتے تھے۔ اور پوچھ پوچھ کر انکی تصحیح کرتے تھے[7]۔ ان کے بیٹے سالم بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے[8]

---

[1] دارمی ص۶۸ [2] جامع ص۷۴

[3] مسند احمد ابن حنبل ص۳۱۲-۳۱۸ ۔ [4] تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی حاشیہ ص۹۹

[5] خطبات مدارس بحوالہ فتح الباری جلد ۱ ص۱۸۴

[6] دارمی ص۶۶ [7] جامع ص۳۳ [8] دارمی ص۱۳۰

اس کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ خود بھی لکھاتے تھے[1]۔ حضرت انسؓ جنکی آج ۲۲۸۶ روایتیں حدیث کی کتابوں میں درج ہیں۔ انکی اپنی اولاد کو عام تاکید تھی کہ قیدوا العلم بالکتاب[2] ان کے شاگرد آبان ان کے پاس بیٹھ کر تختی پر لکھا کرتے تھے[3]

حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی مرویات سے احادیث کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ جنکی تعداد ۱۵۴۰ ہے[4]۔ ان کے شاگردون کا بیان ہے کہ

کنا ناتی جابرؓ ابن عبد اللہ فنسالہ عن سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنکتبہا[5]

ہم حضرت جابرؓ ابن عبداللہؓ کے پاس آیا کرتے تھے۔ اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کے متعلق پوچھ لیا کرتے تھے پھر انھیں لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ روایتیں خود ان کی زندگی میں متعدد نسخوں میں جمع ہو گئی تھیں ان میں سے تین صحیفوں کا ذکر اجمال کی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک مجموعہ اسمٰعیل ابن عبدالکریم کے پاس تھا[6]۔ دوسرا سلیمان یشکری کے پاس تھا[7]۔ ان کے علاوہ ایک مجموعہ خود ان کے پاس بھی تھا ابوبکر ابن عیاش سے اعمش نے اس زمانہ کے لوگوں کی یہ رائے نقل کی ہے کہ

ان مجاهداً یحدث عن صحیفة جابرؓ[8]

حضرت مجاہد حضرت جابرؓ کے صحیفہ سے حدیث بیان کرتے ہیں

---

[1] خطبات بحوالہ مسند احمدؒ جلد ۲ ص۱۹۹

[2] دارمی ص۶۸　[3] دارمی ص۶۸

[4] تلقیح فہوم الاثر لابن جوزی بحوالہ الندوہ ۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء

[5] طحاوی جلد ۲ ص۳۸۴　[6] تہذیب جلد ۲ ص۳۰۶　[7] تہذیب جلد ۲ ص۲۱۱　[8] طبقات جلد ۵ ص۳۴۴

(باقی)

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ مطابق اپریل ۱۹۴۱ء نمبر ۴

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپیہ

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر بنام منیجر "الندوہ" بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

پچھلے مہینہ کا رسالہ پریس میں جاچکا تھا کہ سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے انتقال کی دردانگیز اطلاع ملی مرحوم کی قانونی واقفیت، عدالتی مہارت، معاملہ فہمی، نکتہ سنجی، اور دقیقہ رسی محتاج تعارف نہیں، ایک عرصہ تک الہ آباد ہائی کورٹ میں چیف جج کے فرائض انجام دئیے، پھر دہلی کی وفاقی عدالت میں جج منتخب ہوئے، اور آخر تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ان سرکاری فرائض کے علاوہ قومی و ملی معاملات سے بھی دلچسپی تھی مسلم یونیورسٹی سے خاص تعلق تھا کئی برس تک اس کے وائس چانسلر رہے اور بڑی مستعدی و خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دئیے علمی مباحث کا بہت شوق تھا اس سلسلہ میں آئنسٹائن کے نظریۂ اضافت کی تردید ان کا خاص کارنامہ ہے ان خوبیوں کے ساتھ بیحد خلیق و متواضع تھے خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے اور قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا تھا اس کے بعد ملک میں حالات کی رفتار کچھ ایسی رہی کہ پھر کوئی جلسہ نہ ہو سکا اس عرصہ میں کئی بار کوششیں کی گئیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی اب ندوہ کے ہمدردوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اجلاس عام کے انعقاد کی پھر فکریں ہو رہی ہیں اس سلسلہ میں مجلس منتظمہ نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی، جناب منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا مسعود علی صاحب ندوی اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی پر مشتمل ہے ہمیں امید ہے کہ ملک کے علم دوست، صاحب اقتدار اور ذی حیثیت اصحاب اس مبارک کام میں کمیٹی کے ارکان کو مدد دیں گے۔

مجلس منتظمہ کے اس جلسہ میں نئے اور پرانے متعدد ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس موقع پر ندوہ کے پرانے

کارکنوں کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی ساری زندگیاں اس تحریک کو پروان چڑھانے میں بسر ہوئی ہیں البتہ ان بزرگوں اور دوستوں سے گزارش ہے جو پہلی مرتبہ اس منصب کے لئے منتخب ہوئے ہیں کہ وہ ندوہ کے کاموں کو اپنا کام سمجھیں اس کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیں اور جہاں تک بن پڑے اس تحریک کو آگے بڑھانے کی جد و جہد کریں ندوہ کے مقاصد کی صداقت اب روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے اب حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ دین و دنیا کی باہم آمیزی ہی سے وہ اکسیر تیار ہو سکتی ہے جس پر مسلمانوں کے امراض مزمن کی شفایابی منحصر ہے۔

ندوہ کی یہ اہمیت صرف مسلمانوں ہی کی نظر میں نہیں ہے بلکہ اغیار و اجانب بھی اس کی ان خصوصیات کے معترف ہیں ابھی کچھ عرصہ ہوا برسٹل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ولیس اولیری (RAIISO LLERI)

نے اسلام ایٹ دی کراس روڈز (ISLAM AT THE CROSS ROAD)

کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے مغربی خیالات و رجحانات کے خلاف ردِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے ندوۃ العلماء اور اس کے رسالہ کا بھی ذکر کیا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:-

۱۸۹۴ء میں اسی قسم کی ایک تبلیغی مجلس ندوۃ العلماء کے نام سے لکھنؤ میں قائم ہوئی اور اپنا تبلیغی رسالہ بھی نکالا ۱۸۹۸ء میں اس انجمن نے ایک متعین تعلیمی نظام اختیار کیا اور دار العلوم کے نام سے لکھنؤ میں ایک کالج کی بنیاد رکھی بعد کو مدراس اور شاہجہاں پور میں اس کی تعلیمی شاخیں قائم ہوئیں یہ کالج ایک طرف مغربی انداز اور جدید طرز کی بہترین خصوصیات کا حامل ہے اور دوسری طرف اپنی مذہبی تعلیمات میں پورا پورا اسلامی ہے یہ ادارہ اسلامی خیالات کی نشر و اشاعت کی غرض سے بہترین مبلغ تیار کرتا ہے جو مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں پر کافی اثر رکھتے ہیں

۱؎ غالباً اس سے مبین الندوہ کے طلبے مراد ہیں۔

میری محسن کتابیں

(از جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن مدیر ہمایوں)

یہ ایک بہت مشکل سوال ہے کہ کونسی کتابیں میری محسن ہیں!

کونسی کتاب ہے جو میں نے پڑھی اور جس کا احسان میرے سر پر نہیں۔ وہ بری ہو یا بھلی ہو لازم ہے کہ اُس نے مجھ پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑا ہو گا۔ پھر ایسی بھی بہت سی ہونگی جنھیں یاد کرنے پر اُن کے اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن میں یہاں صرف دو چار کتابوں کا ذکر کروں گا جو اس عنوان کو دیکھکر مجھے فوراً یاد آگئیں۔

وہ کتاب جس نے اوائل عمر میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا شبلی کی الفاروق تھی۔ اسلام تاریخ کہانی سیاست داستانبازی اس میں یہ سب کچھ تھا۔ گویا لڑکپن میں مجھے ایک ہنمال گیا جس نے جانا کہ یہ اسلام ہے۔ برسوں گزر گئے کئی مرتبہ الحاد نے کامیابی کے ساتھ میرے دماغ پر حملہ کیا لیکن دل جس الفاروقی رنگ میں پہلی عمر میں رنگا جا چکا تھا وہ رنگ کچھ نہ کچھ ہمیشہ باقی رہا۔ ایک تو عمر ایسی تھی کہ جو اثر پڑا وہ مٹ نہ سکا اور دوسرے کتاب ہی ایسی عظیم الشان تھی کہ جب میرے ایک دہلوی ادیب دوست نے اس پر دو سال ہوئے نکتہ چینی کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مجھ پر ذاتی حملہ کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی پڑھنے کے بعد بھی میری پسند کی کتاب الفاروق ہی رہی۔ حضرت عمرؓ کا وہ صحرا میں اپنے غلام کو اونٹ پر بٹھا کر اُس کے آگے آگے چلنا۔ وہ راتوں کو گشت کرنا۔ وہ ایک بڑھیا کا دلیری سے کہنا اتق اللہ یا عمرؓ، اسلام کا وہ دو بڑی سلطنتوں پر چھا جانا ان کا اثر آج تک طبیعت سے زائل نہیں ہوا۔

پھر انگلستان سے واپس آکر مجھے خوب یاد ہے کہ جتنا لا ادریت نے میرے دماغ پر قابو پایا اتنا ہی میرا یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز صبح کو قرآن مجید (عربی میں) دس منٹ اور دیوانِ حافظ دس منٹ پڑھا کرتا۔

کارلائل کی "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں "محمد" والا مضمون مجھے بے حد پسند تھا چنانچہ آکسفورڈ میں جب میں نے ایک تاریخی مقالہ لکھا اور اس میں کارلائل کے اس مقالے سے ایک اقتباس دیا تو میرے انگریز پروفیسر کو وہ اتنا پسند آیا کہ اس نے کہا کسی طرح اسے اپنے آخری امتحان میں بھی درج کرنا میں نے ایسا ہی کیا اس کے کئی جملے مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

میری ایک عجیب عادت تھی کہ جو کتاب مجھے بہت پسند آئی سے نا تمام چھوڑ دیتا۔ دیوان حافظ میں نے ایک ماہ میں آدھا پڑھا اتنا پسند آیا کہ اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ باقی ماندہ دیوان کا اکثر حصہ میں نے آج تک نہیں پڑھا میں نے بہت کم ناولیں پڑھی ہیں لیکن وکٹر ہوگو کی مشہور ناول "لے مزابل" (LES MISERABLES) مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے بار بار تھوڑا تھوڑا پڑھ کر چھوڑ دیا یہاں تک کہ شروع کرنے کے ستر سال بعد اسے ختم کیا۔ میں اسے دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔

حال میں میں نے ایک کتاب " iBELIVE "میرا عقیدہ" پڑھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اس میں دنیا کے چند بڑے مفکرین نے اپنے ذاتی عقیدے بیان کئے ہیں اکثر عقیدے لا ادریت یا دہریت سے ملتے جلتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کا ایمان الحاد کے حملوں کے بعد قائم نہیں رہ سکتا تو وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں۔

(نوٹ) رسالہ عموماً ہر مہینے کی ۲۰ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے، نہ پہونچنے کی صورت میں اسی مہینہ کی آخری تاریخ تک دفتر میں اطلاع دیکر منگالینا چاہئے ورنہ دفتر تعمیل سے قاصر رہے گا اور قیمت بھیجنے پر رسالہ روانہ کیا جاسکے گا،

"مینیجر"

شیراز ہند پورب

(۳)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

ملا قطب الدین سہالوی | یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر ہائے قصبات تک دار العلم تھے۔ ملا قطب الدین سہالوی نے سہالی میں اپنی درسگاہ ترتیب دی۔ درجوق جوق طلبہ دیار واطراف سے آنے لگے یہانتک کہ زمینداری کے جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور بیتے پور کے خانزادوں کے ہاتھوں سے شہادت پائی۔

ملا قطب الدین شمس آبادی | ملا صاحب کے مطلع درس سے ایک آفتاب چمکا جس کا نام سید قطب الدین شمس آبادی ہے۔ سید موصوف اصل میں امیٹھی کے رہنے والے تھے جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے تعلیم سے فراغت کے بعد اس قطب نے امیٹھی کے بجائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ شمس آباد قنوج کے پاس ہے آزاد لکھتے ہیں۔

در شمس آباد مسند افادہ گستر د و جم غفیر را بہ افاضۂ دانش و بخشش مرتبۂ کمال و تکمیل کرامت نمود۔ (ماثر الکرام صہ ۲۰۱)

شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہوگیا۔

ملا محب اللہ بہاری | اس جم غفیر میں جو ملا شمس آبادی کی دانشگاہ سے مرتبہ کمال کو پہونچے ایک نامور شمیمۂ پورب ہے آگر شامل ہوا یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑہ محب علی پور سے دنیا اس نامور کو قاضی محب اللہ بہاری مصنف سلم و مسلم کے نام سے پہچانتی ہے تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہ عالمگیر کا زمانہ تھا محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے۔ ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ اور شیخ فرید الدین طویلہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلہ چاند پورہ میں دفن ہوئے۔ بعض صاحبوں نے ملا محب اللہ کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا[۱] ہے۔

---

[۱] حاشیہ شرح ملاحسن از مولوی عبد الحکیم لکھنوی

حافظ امان اللہ بنارسی | قاضی محب اللہ بہاری کے ایک ہمعصر امام وقت تھے۔ ان کا نام حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین ہے۔ بنارس وطن تھا۔ ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیر زمانہ سے درس لیکر فارغ ہوئے تو عالمگیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا۔ حافظ صاحب کا یہ رتبہ تھا کہ ملا محمود جونپوری نے ملا باقر داماد استرآبادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہے۔ شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جس پر خود پیر کو فخر تھا۔ ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی۔ انکی خانقاہ مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے۔ اور میں نے انکی زیارت کی ہے۔

ملا نظام الدین فرنگی محلی | ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا۔ اور اسی نسبت سے وہ فرنگی محل کہلاتا تھا یہ وہی فرنگی محل ہے جو آگے چل کر پورب کا سب سے بڑا دار العلوم بنا۔

ملا قطب الدین کے کئی صاحبزادے تھے۔ مگر ان میں سب سے نامور ملا نظام الدین ہوئے جنکی نسبت سے عربی کا درس نظامی مشہور ہے۔ موصوف کا سب سے پہلا چشمۂ فیض خود انکے والد ماجد کا آغوش تربیت تھا۔ باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علماء کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اپنے والد کے شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی سے پھر حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا۔ اور آخری تکمیل شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے حاصل کی جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ملا نظام الدین کی ذات گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آکر جمع ہو گئے یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ انکے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا۔ میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے ہم عصر ہیں اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

"وتمام عمر بہ تدریس وتصنیف اشتغال ورزید۔ واعتبار واشتہار عظیم یافت
امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بمولوی دارند۔ وکلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند

دکسے کہ سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلاء علم امتیاز می افزود و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردہ اند۔ و برائے اعتبار خاتمۂ فراغ از مولوی

گرفتند

۱۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ آرامگاہ لکھنؤ ہے۔

مدرسین فرنگی محل

ملا نظام الدین کے زمانہ سے لیکر تقریباً سوڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتم العلماء مولانا عبدالحی فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا اور اب بھی اسکی برکتوں کا سلسلہ بحمد اللہ کہ قائم ہے۔

ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادے ملا عبد العلی ہیں۔ جنکے دم سے یہ چشمۂ فیض دریائے فیض بنگیا اور دنیا نے انکو بحر العلوم کہکر پکارا۔ یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رامپور سے ہوتا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہوکر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا۔ مدراس میں ۱۲۳۵ھ میں وفات پائی۔

ملا قطب الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نامور پیدا ہوئے جنکے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے ملا حسن۔ ملا مبین۔ ملا کمال الدین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں اور ان میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے۔

ملا کمال الدین اور ملا احمد اللہ

ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور با کمال شاگرد ہیں ایک ملا کمال الدین فرنگی محلی المتوفی ۱۱۷۵ھ اور دوسرے ملا احمد اللہ سندیلہ المتوفی ۱۱۶۰ھ یہ ملا حمد اللہ وہی ہیں جنکی کتاب حمد اللہ مشہور ہے۔ انھوں نے سندیلہ میں اپنی درسگاہ جمائی جس سے بہت سے نامور پیدا ہوئے۔

ملا باب اللہ جونپوری اور ملا غلام یحییٰ بہاری

ملا حمد اللہ کے ایک نامور شاگرد ملا باب اللہ جونپوری ہیں اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام یحییٰ بہاری ہیں جن کا حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد رسالہ قطبی

میں لیاقت کی آخری منزل ہے۔ اکبر نگر نہ ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اور بہار میں مخدوم شاہ شرف الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ ۱۱۲۵ھ[1] سال وفات ہے۔

سلسلۂ خیرآباد

ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلوی ہیں۔ فضل و کمال کا یہی وہ نخل بارآور ہے جس سے خیرآباد کی وہ شاخ نکلی ہے جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے۔ اور جو سلسلۂ خیرآباد کے نام سے مشہور ہے۔ ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخ فاروقی میں ہیں۔ ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کے دو شاگردوں ملا احمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی محلی سے کسب فیض کیا۔ اور طلبہ کو اپنی تصنیف و تدریس کی دولت سے مالا مال کیا اور بارھویں صدی کے اخیر میں اس دنیا کو الوداع کہا۔ ملا محمد اعلم کے شاگردوں میں انکے بھانجے مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی کامل ہوئے اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد اعظم کے شاگرد ملا ارشد تھے اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبدالواجد خیرآبادی۔ ملا عبدالواجد سے ملا نظام العالم اور ملا نظام العالم سے مولانا فضل امام خیرآبادی نے پڑھا۔ مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے۔ بچوں کا فارسی کا ابتدائی رسالہ آمدنامہ انہیں کی آمد طبع کا نتیجہ ہے۔ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی۔

مرحوم کے جانشین صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے۔ دیار و اطراف سے طلبہ نے انکی طرف رجوع کیا۔ اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ شرح و حواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائج طبع تھیں داخل درس ہوئیں۔ فلسفہ میں "ہدیہ سعیدیہ" نام ایک کتاب عربی طلبہ کی تعلیم کے لئے لکھی اور مقبول عام ہوئی۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان کو بھیجے گئے۔ اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی

---

[1] تاریخ علمائے ہند صفحہ ۱۵۹ میں ۱۱۲۸ھ لکھا ہے مگر عجب نہیں کہ یہ ۱۲۲۸ھ ہو۔

رونق دی۔ اور وہ بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔ ان بزرگوں میں سے جن ارباب کمال کی درسگاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی، مولانا عبدالحق خیرآبادی خلف الصدق مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا برکات احمد بہاری ٹونکی، مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری جونپوری، مولانا عبدالحق خیرآبادی نے رؤسائے رامپور کی قدردانی سے رامپور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا، مولانا برکات احمد صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے، انکے والد حکیم دائم علی صاحب ٹونک چلے آئے تھے، مولانا برکات احمد صاحب نے ریاست ٹونک کی قدر شناسی سے ٹونک کو علم و فن کا مرجع بنایا، مولانا ہدایت اللہ خاں رامپور سے جونپور آئے، اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلس آراستہ کی، ان میں سے ہر ایک کی درسگاہ سے سیکڑوں علما تعلیم پاکر نکلے۔

فرنگی محل کا آخری دور

اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دارالعلم میں فضل و کمال کی ہستیاں باقی رہی ہیں، انھیں میں سے مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کی درسگاہ ہے۔ مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحیم صاحب فرنگی محلی کے صاحبزادے اور جانشین تھے، انکے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحبزادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے، اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے روز و شب طلبہ کو درس و تدریس کے ساتھ ہی منصب افتا کی خدمت انجام دیتے، جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کی بساط الٹی تو علم کا مرکز جونپور کے مدرسہ امام بخش میں منتقل ہوگیا، یہاں سے وہ حج و زیارت کو حجاز تشریف لے گئے، اور وہیں سنہ ۱۲۸۶ھ میں ابدی نیند سو گئے۔

مفتی احمد ابوالرحیم کے دوسرے صاحبزادے کا نام مولوی اکبر تھا، انکے بیٹے مولوی امین اللہ اور انکے بیٹے مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی تھے۔ مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علما مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد اصغر، مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا، اور وہ شہرت حاصل کی کہ علما نے انکے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر نواب باندہ کی طلب پر باندہ گئے، اور کئی برس رہے، وہاں سے واپس آکر جونپور کے مدرسہ امام بخش میں مدرس ہوئے۔ اور نو سال تک

جونپور شمع وجود سے پر رونق رہا۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں ایک عالم کو شام غم سے معطر فرما کر حیدرآباد میں وفات پائی۔

انھیں کے صاحبزادے مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی لکھنوی ہیں۔ زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد ماجد سے وراثت پائی، باندہ میں سنہ ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جونپور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی، سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، اور درس و تدریس شروع کیا۔ کتابیں لکھیں، بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے، فقہ و حدیث و اصول کی نئی نئی کتابیں چھپوائیں، علماء سے مناظرے کئے۔ انکی شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی۔ اور سینکڑوں علماء اعلام انکے درس سے کامل ہو کر اُٹھے، اور ملک ملک میں پھیلے۔ سنہ ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالم جاودانی کا سفر کیا۔ علماء کو مولانا کی بیوقت وفات کا یہ صدمہ ہوا کہ شمس العلماء مولانا سعید عظیم آبادی نے یہ تاریخ وفات کہی۔

"شد فرنگی محل ز علم تہی"

مولانا عبدالحئی صاحب کے بعد فرنگی محل میں مولانا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگار سلف تھی۔ یہ ملا بحرالعلوم کے پوتے، اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔

اخیر زمانہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اسی محفل کے چراغ سحر تھے۔

علمائے جونپور لکھنؤ کے بعد سب سے دوسرے علمی مرکز جونپور کا نام بار بار آیا ہے۔ مگر ابھی تک وہاں کے ارباب کمال کی داستان تشنۂ بیان ہے۔ تیموری حملہ کے بعد سنہ ۸۰۰ھ میں جب جونپور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم و فضل کی مسند بھی بچھی۔ اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور ان کے معاصرین ہیں۔ لیکن اس سے چند سال پہلے جونپور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفرآباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا۔

علمائے ظفرآباد یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ظفرآباد شہزادہ ظفرخاں کے نام پر بسا تھا۔ مگر یہ اس قصبہ کی شاہانہ تاریخ ہے۔ اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ سلطان

شہاب الدین غوری نے ۵۹۰ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کے ساتھ ملا قرضی کوئی ایک مرد مجاہد بھی شریک تھا۔ اسوقت ظفرآباد کے مقام پر راجہ اودے پال نام ایک راجہ تھا اس مجاہد نے راجہ سے مقابلہ کیا۔ اور شہید ہوا۔ اور یہیں دفن ہوا۔ بعد کو ایک مسجد بن گئی۔ اور صحن شہیداں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اسوقت مزار موضع شمس خاں پور کے قصبہ میں داخل ہے[1]۔

مخدوم شیخ صدرالدین چراغ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں ۶۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے۔ پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہو کر ظفرآباد میں قیام پذیر ہوئے۔ شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کے ہر اشارہ کو عزت سمجھتے تھے[2]۔ مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق نے ان سے اپنی ایک بیٹی کا نکاح کر دیا تھا۔ اور ان کے لئے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا جو چراغ ہند کے نام سے ابتک مشہور ہے۔ اس عمارت پر فارسی کا یہ کتبہ منقوش ہے[3]۔

بعہد ملک ذوالقرنین ثانی — بنا شرع را از عدل بانی
غیاث الدین و دنیا بوالمظفر — سلیمان خاتم و جمشید افسر
شہ آفاق تغلق شاہ اعظم — کہ بر وی شد جہانداری مسلم
برآمد این حصار چرخ ایوان — کہ در رفعت گذشت از فرق کیوان
دو شستہ بست و ہشتم روز بود — ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں ساعت و در وقت مسعود — ز ہجرت سال ہفصد بست و یک بود (۷۲۱ھ)
مظفر شد چو شد معمور این شہر — ظفرآباد نامش بود در دہر

اس کتبہ سے یہ پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۸ ربیع الاول ۷۲۱ھ میں سلطان فیروز شاہ تغلق اسکو بسایا تھا

[1] تجلی نور تاریخ جونپور ص ۲۹ [2] فرشتہ۔ ذکر حضرت رکن الدین [3] شاہان شرقی کی یادگاریں (انگریزی) خان بہادر فصیح الدین مرحوم کلکٹر جونپور ص ۱۰۱

اخیر شعر کے اشارے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا نام ظفرآباد کسی شخص کے نام پر نہیں بلکہ بادشاہ کی کسی مہم کی فتح و ظفر کی یادگار میں رکھا گیا۔ اسی کے بعد سے ظفرآباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے۔ تاتاریوں کے حملے کے زمانہ میں ایک بزرگ مع اپنے صاحبزادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے جب [illegible] آئے۔ صاحبزادہ سید تاج الدین کڑہ کے ناظم مقرر ہوئے اور دوسرے صاحبزادہ مخدوم اسد الدین نے پورب میں ظفرآباد کو اپنے قدوم سے سرفراز کیا اور مخدوم آفتاب ہند ظفرآبادی کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ اور سنہ [illegible] ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار اور اولاد اب تک ظفرآباد میں ہے۔

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر [illegible] جاکر تغلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے پھر منشی مقرر ہوئے [illegible] آخر میں ترک منصب کر کے حضرت نظام الدین کے حلقہ میں آ گئے۔ دیوان فارسی اور تصنیفات میں [illegible] یادگار چھوڑا[2]

پورب میں علمی ترقی کے چار دور

پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں۔ ایک سلطنت شرقیہ کا عہد[3]

۱؎ اس مقام پر فرشتہ ص۱۳۰ اور مبارک شاہی ص[illegible] کی اس غلطی کو دور کرتا ہے کہ انھوں نے فیروز تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان سنہ ۷۵۲ھ لکھی ہے مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہے۔ اور صحیح وہ ہے جو فیروز شاہی میں ضیاء برنی اور تاریخ بدایونی ص۲۲۱ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے یعنی سنہ [illegible] ھ

۲؎ تجلی نور نور الدین ظفرآبادی جلد دوم ص۹

۳؎ سلاطین شرقی کے نام اور زمانے یہ ہیں۔

۱۔ سلطان الشرق خواجہ جہاں	سنہ ۷۹۶ھ	سنہ ۸۰۲ھ
۲۔ مبارک شاہ شرقی	سنہ ۸۰۱ھ	سنہ ۸۰۳ھ
۳۔ سلطان ابراہیم شرقی	سنہ ۸۰۳ھ	سنہ ۸۴۴ھ
۴۔ سلطان محمود شرقی	سنہ ۸۴۴ھ	سنہ ۸۶۲ھ
۵۔ سلطان محمد شاہ شرقی	سنہ ۸۶۲ھ	سنہ ۸۶۲ھ
۶۔ سلطان حسین شاہ شرقی	سنہ ۸۶۲ھ	سنہ ۸۸۱ھ

دوسرا لودیوں کا تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر۔

شرقی سلطنت کا دور | پہلا دور ۸۰۰ھ سے شروع ہو کر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اور اس دور کا طلائی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہے۔

یہ عہد حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا قنوج سے لیکر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفا کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں قصبوں میں۔ قاضیوں مفتیوں اور شیوخ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جا رہی تھیں۔ اور ہر جگہ علم و فن کی سندیں بچھی تھیں۔ اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آ جا رہے تھے آج بھی ان اطراف میں شرفا کے جو خاندان آباد ہیں انکے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں۔ اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ انھیں شرقی بادشاہوں کا فیض ہے۔ ا پھر آخر سلطان عالمگیر کے عہد میں سادات صدیقی۔ فاروقی اور انصاری شیوخ کی نو آبادیاں قنوج سے لیکر جونپور سے گذر کر غازی پور تک پھیلی تھیں۔ خانقاہیں خدا والوں سے۔ اور درسگاہیں علم کے طلبگاروں سے بھری پڑی تھیں شرقی سلطنت کے فروغ نے ظفرآباد اور جونپور کے در و دیوار کو پر نور بنا دیا تھا۔ علما، اور اہل ہنر دور دراز ملکوں سے کھنچے چلے آتے تھے۔ اون میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نورالدین ابی محمد بن مخدوم سید اسدالدین المتوفی سنہ ۸۲۶ھ

۲۔ قطب الدین ابوالغیب بن نورالدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی سنہ ۸۶۹ھ میں وفات پائی۔

۳۔ ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفرآباد المتوفی سنہ ۸۳۹ھ

۴۔ قاضی تاج الدین نامی ظفرآباد المتوفی سنہ ۸۳۱ھ

۵۔ قاضی نصیرالدین گنبدی قاضی جونپور شاگرد قاضی عبدالمقتدر دہلوی المتوفی سنہ ۸۱۰ھ

یادِ ایّام

از مولانا ضیاء الحسن صاحب ندوی ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات مشرقیہ الہ آباد

جہاں رہتے تھے کیسی بستیاں ہم کو دکھاتی تھیں
کہ جب انسان انساں تھے زمانہ بھی زمانہ تھا

ہمارے یہاں زندگی میں جدید تہذیب کی چاشنی جس سے تمام مدارس محروم تھے آگئی تھی بلکہ بہت سے دیسی انگریزی اسکول بھی اس سے ناواقف تھے۔ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ علیگڈھ کی تقلید تھی کیونکہ دارالعلوم اس وقت جن باتوں میں تھا اُن کی طبیعت علیگڈھ کے نام سے کرتی تھی۔ تبلیغ وعظ اور علمی مباحثوں کے خیال سے ہماری انجمن تقریر و تحریر قائم کی گئی تھی۔ اس میں طلبہ تحریر و تقریر کرتے کوئی استاد منتخب ہوتا وہ ہماری خامیوں کی اصلاح کرتا۔ ہر صوبے کے طلبہ جمع تھے۔ بہت سے اچھے خاندانوں کے تھے مستطیع اور غیر مستطیع کا کوئی فرق نہ تھا جو علیگڈھ بھی نواب وقار الملک مرحوم سے پہلے نہ مٹا سکا۔ سب طلبہ ایک جگہ ایک ہی قسم کا شریفانہ کھانا دال روٹی گوشت سر جوڑ کر کھاتے ایک ہی جگہ اساتذہ کی نگرانی میں مطالعہ کرتے اور شام کو ایک ہی جگہ ورزش کرتے لہذا اتحادِ سن و سال کی بدولت ہم لوگ شرارتیں بھی کرتے تھے۔ ہر طرح کی زندہ دلی ہم لوگوں میں پیدا ہو گئی تھی تقشف ہمارے پاس پھٹکنے نہ پاتا تھا انفیریارٹی یا سپیریارٹی یہ الفاظ تو ہمارے یہاں نہ تھے۔

ہر پنجشنبہ کو تعلیم کے اوقات میں ایک محفل مکالمہ برپا ہوتی اس میں طلبہ ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتے اس لئے نئے نئے مصادر لیکر مشکل سے مشکل صیغے تلاش کیے جاتے اور یہ جانچے جاتے بعد کو چل کر عربی اشعار کی بیت بازی بھی ہونے لگی اس طرح ہم لوگوں میں عربی اشعار کے یاد کرنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا کسی دن منطقی مسائل پر بھی بحث ہو جاتی یہ سب ہمارے مولانا کی ایجاد تھی۔ ہاں البتہ عربی مدرسہ تھا فارسی کا زور کم تھا پہلے تو اسی انجمن میں خال خال طلبہ عربی میں بھی مضمون سنا دیتے تھے مگر بعد کو ہم لوگوں نے صرف عربی

تقریر و تحریر کے لئے ایک انجمن لجنۃ الادب بھی قائم کرلی تھی یاسی انجمن کا طفیل تھا کہ ہمارے دوست کہ مصر اور یورپ میں عجمیت کے عیب سے پاک رہے اور میں نے علی گڈھ پہونچکر ایک ازہری کو نوکر کرلیا۔ اب بھی تقریر تو کافی نہ کرسکوں شاید لیکن عربی بے تکلف لکھ لیتا ہوں۔ اس ضرورت سے ہم کو عربی اخبارات اور رسائل سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ المنار خود دفتر ندوہ میں آتا تھا الہلال اور المقتطف کبھی کبھی مطبع البیان محمود نگر سے دستیاب ہوجاتے اللواء اس زمانہ میں اودھ پنچ کے مبادلہ میں آتا تھا منشی سجاد حسین صاحب میرے دوست صدیق حسن کا مجھکو ترجمہ کے لئے دیدیتے اس طرح اور اس ضرورت سے ہم کو جدید مصری سے بھی واقفیت ہوگئی حضرت الاستاذ علامہ نے سفرنامہ مصر و شام و روم کے آخر میں ایک فرہنگ عربی جدید الفاظ کی دیدی تھی اس سے بہت مدد ملی۔ عربی بول چال والے صاحب اسوقت لاپتہ تھے پھر تو پڑھتے پڑھتے مہارت ہوگئی۔ اکثر قوم کے اکابر دارالعلوم دیکھنے آتے کبھی کبھی انکے خیرمقدم ہم لوگ عربی میں لکھتے انکی تقریریں سنتے غرض مولویوں کے طبقہ میں ہمارا نقطۂ نظر بہت وسیع اور روشن قدرتی طور پر ہوگیا تھا یہی روایات اور رسوم تھے جنپر دارالعلوم کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔

سب کچھ لکھ گیا مگر اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ علامہ کا ذکر کہیں براہ راست نہیں آیا یہ ذکر خیر تو بعد کو اپنی جگہ پورا پورا ہوگا مگر اتنا تو سن ہی لیجئے علامہ کو ندوہ سے دلچسپی تھی مگر علما کو ان سے دلچسپی کم تھی اور انکے نزدیک وہ علی گڈھ ہوکر ساقط الاعتبار ہوچکے تھے تاہم حضرت مولنا محمد علی صاحبؒ ان سے برابر مشورے کرتے رہتے یہ تو کیسے کہوں کہ علامہ کے نام سے واقف کم سنی سے نہ تھا اول تو میرے گھر میں ان کا چرچا رہتا تھا سب سے پہلی کتاب انکی المامون پڑھی تھی یا نہیں مگر اس اڈیشن میں سرسید کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی تھا۔

علامہ ایک مرتبہ میری کمسنی ہی میں ندوہ میں چند روز آکر ٹھہرے میں شام کو عم محترم کے ساتھ ندوہ گیا تو وہ دفتر کے اوپر والے کمرے میں تھے انکے لئے میز کرسی کی نشست کا انتظام تھا۔ ڈاڑھی کھچڑی تھی سامنے میز پر چند مطبوعہ البم رکھے تھے اور کچھ کتابیں بھی بے ترتیب پڑی تھیں عم محترم سے باتیں ہوتی رہیں مجھکو انھوں نے

وہ ہم دیکھنے کو دیتے اس میں جانبین مصر و روم کی تصویریں تھیں جو میں دلچسپی سے دیکھتا رہا اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مصر و شام و روم کے سفر سے مراجعت کے بعد کا ہے۔ اس وقت تک غالباً ہمارے مولانا تشریف نہیں لائے تھے ہم محترم سے مصر و شام و روم کے علما اور ہندوستان کے متعلق کچھ گفتگو ہوتی رہی جو یاد نہیں آتی۔

اب میں پھر اپنے طرز تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ہدایۃ النحو ختم ہوئی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کون کتاب شروع کرائی جائے۔ اس کے بعد کافیہ پڑھائی جاتی تھی پھر شرح ملا جامی طریقہ درس نظامیہ کا تھا مگر حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کافیہ مرغوب نہ تھی اور سچ بھی تھا کیونکہ جمال الدین ابن حاجب صاحب کافیہ ایک بہت ذہین نحوی گذرے ہیں انکی ذہانت ضرب المثل ہے مگر انھوں نے رمزیوں کی بدعت جو نظم میں ظاہر ہوتی تھی کہ فن کو پہیلیاں اور الغاظ میں لکھنے لگے تھے نثر میں بھی بنانا چاہی اس گناہ کی نقل متاخرین کا سرمایہ ناز پھر ہر فن میں بن گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ فن کے مسائل اس طرح کافیہ کو زبانی یاد کرکے مستحضر رہتے ہیں مگر اس کی عبارت کی پیچیدگی کچھ اس سن کے طلبہ کے لئے مفید نہ تھی اس لئے طے ہوا کہ جمال الدین محمد بن مالک کی الفیہ کیا بری ہے نظم تو نثر سے زیادہ یاد ہو جاتی ہے پھر کافیہ سے مسائل بھی زیادہ ہیں اور عبارت میں وہ پیچیدگی بھی نہیں ہے اس فیصلہ کی قدر جب ہوگی کہ میں اس کے شارح ابن ہشام کی یہ عبارت نقل کردوں کتاب صغر حجما و غزر علما، چنانچہ ہم کو الفیہ بن مالک شروع کرا دی گئی ہزار شعر مع معنی و مطلب زبانی یاد کرنا پڑے اس کا دوسرا شعر یہ تھا۔

واحدہ کلمۃ والقول عم وکلمۃ بہا کلام قد یوم

اس شعر پر ہمارے مولانا نے ایک لطیفہ سنایا کہ غازیپور میں حنیفوں اور اہل حدیث میں ایک مناظرہ قرار پایا عوام کا مجمع کثیر تھا اہل حدیث کی ہوا بگڑ رہی تھی حضرت شاہ امانت اللہ صاحب نے کافیہ پڑھوں سے سوال کیا کہ لا الہ الا اللہ کو کلمہ کہنا جائز ہے کہ نہیں سب نے بالاتفاق کہا کہ نہیں اس پر شاہ صاحب نے مجمع کی طرف

متوجہ ہو کر کہا کہ دیکھو بھائیو ان کو لا الہ الا اللہ کے کلمہ ہونے سے انکار ہے ایسوں سے کون بحث کرے پھر کیا تھا بیچارے اہل حدیث اپنی جانیں بچا کر بھاگے۔

الکلم النوابغ زمخشری کی ترکیب اور جملوں کی اشکال کی بدولت ہم کو الفیہ کے مطالعہ میں آسانی معلوم ہوئی اور الفیہ سے ہماری عربی کی بیت بازی میں بھی مدد ملی ادب میں الکلم النوابغ کے بعد کسی اردو داں عبارت کی کتاب پڑھانا مقصود ہوئی اس کے لئے اخوان الصفا انسان اور حیوان کے بحث پر شروع کی عبارت کی روانی دیکھکر ہم کو اردو داں عربی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اب ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ الاہم کو اس طرح کراتے تھے کہ الف لیلہ کی کسی مختصر عبارت کا ترجمہ لکھا دیتے اور اسکی عربی کراتے بعد کو نحوی غلطیاں بتا کر اصل عبارت سے مقابلہ کراتے اور الفاظ کے تغیرات سے بحث کرتے اسطرح رفتہ رفتہ مجھکو الف لیلہ کے دیکھنے کا شوق ہوا ان کے پاس کلکتہ کا چھپا نسخہ تھا جہاں وہ سب سے پہلے چھپی تھی لہذا جب مولانا دوسرے درجہ میں مصروف ہوتے تو میں اس کو دیکھتا اور اس میں سے بیت بازی کے لئے جو اشعار سمجھ میں آجاتے یاد کر لیتا جب ہی کا شوق تھا جس نے مجھ سے اب الف لیلہ کا ترجمہ کرا دیا اور اسی کے نظم کے ترجمہ کے شوق سے شعر کہنا آگیا گو شاعر اب بھی نہیں ہوں۔

این ہمہ گفتہ شد در بحث نثر بود

اب نظم کی سنئے ہم کو سب سے پہلے نظم میں ناظم صاحب کے ایما رسے قصیدہ بردہ شریف جو صلحا کا ورد تھا شروع کرایا گیا جب قصیدہ بردہ شریف ختم کر لیا تو ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ادب جو کتاب سب سے آخر میں پڑھاتے ہیں یعنی سبعہ معلقہ پڑھا یا یہ نہ سمجھئے کہ ہماری استعداد سے اونچی کتاب تھی استاد تو بناعن ہوتا ہے پھر مولانا سا اور شناس اسکی برکت دیکھئے کہ میں نہ تو مصنف ہوں اور نہ مدرس مگر اس کے بہت سے شعر اب بھی یاد ہیں

فمثلک حبلی قد طرقت و مرضع فالھیتہا عن ذی تمائم محول

کا مفہوم اس وقت خاک کچھ سمجھ میں نہ آیا مگر بڑے ہو کر جب سمجھ میں آیا تو فالیقما کی بلاغت نے ایک خاص مزہ دیا اور ولا تلہکم عن ذکر اللہ کی تفسیر خوب ذہن نشین ہو گئی۔ یہ تھی اس تعلیم کی برکت اور قوت۔

ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اثر تمام مدرسین نے بجز ایک صاحب کے قبول کر لیا مفتی صاحب اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شاگرد کی طرح انکے ساتھ برتا ؤ کرتے مولانا بھی انکے ساتھ شفقت فرماتے صرف و نحو عملی کا اتنا چرچا ہوا کہ مدرس جدید قسم کے مصنف بن گئے مفتی صاحب نے شاید اردو میں پہلی مرتبہ صرف پر ایک کتاب جریف لکھی وہ خوب لکھی ندوہ نے اس کو طبع کرا دیا تھا اس کے کچھ نسخے اب بھی کتب خانہ میں ہوں گے اب سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت الاستاد علامہ کی یہ ترتیب ذہنی اسی ابتدائی اسکول میں مشق ہوئی تھی۔

ہماری انشا پردازی بہت بلند ہو گئی تھی روان دمقفی دونوں قسم کی عبارتیں لکھ لیتے تھے ہمارے دوست تو چھپے رستم نکلے نجانے وہ شاعر کیسے بن گئے انکی ثقاہت المعروف بجوداگرچہ اس کے منافی تھی مگر یہی برزخ ہمارے استاد حکیم سید عبد الحئی صاحبؒ کا بھی تھا حالانکہ وہ اردو تک کے ایک نقاد شاعر تھے عربی میں شعر کہنا ان کو غالباً اسی ترجمہ کی بدولت آگیا ہمارے مولانا کو اردو کے بکثرت اشعار یاد تھے اور اس زمانہ میں جبکہ لوگ میر کو کم پڑھتے ان کو میر کے چوٹی کے بہت سے اشعار یاد تھے اور اکثر میر کا کوئی شعر لکھ ترجمہ کراتے۔ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا زبانی یاد ہے وہ لکھے دیتا ہوں۔

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہا | کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہا

(۱) العین ترقرقت دعبرۃ وقفت | الطل طاسۃ نرجس وقعت

(۲) اغرورقت العین ودمعۃ رکدت | کاسۃ نرجس وفیہا الطل حلت

ممکن نہیں ہے اجتماع ضدین | تو رب ہے اور میں بندۂ خدا ہوں

ولیس الضد یجتمع بضد | انا عبد الودود وانت ود

ہ ظاہر ہے کہ شعر کہنے سے ترجمہ شعر میں کرنا بہت مشکل ہے ہمارے مولٰنا عربی فارسی اور اردو کے جید شاعر تھے۔ مئو کی ہندو مسلم جنگ پر بڑی پرجوش نظم لکھی تھی۔ ان کا فارسی کا مذاق بہت بلند تھا۔ مجھ کو مقامات حمیدی پڑھائی تھی مگر طلبہ کو اس وقت عربی چڑھی تھی عربی مدرسوں میں نورچشم رحمت غازی پور کے سوا فارسی کا زور کم تھا اس لئے انکی فارسیت سے کم لوگ متمتع ہوئے خود مجھکو بھی زیادہ اعتنا، اسطرف نہوا

ان کی بدولت عربی شاعری کا چرچا بہت رہتا تھا کوئی کتاب اٹھا لیتے تو اس کے اشعار اکثر پڑھواتے انکے پاس ابن حجۃ الحموی کی خزانۃ الادب تھی بیشتر اسی سے اشعار و قصائد لیتے خزانۃ الادب پر یاد آیا ایک مرتبہ ہمارے استاد ڈاکٹر ہورو ڈینسر مالک ابن ایب کے مرثیہ کی تصحیح و ترمیم و مقابلہ ایک ضرورت سے مجھ سے کرارہے تھے حوالوں کے لئے انھوں نے ایک پرزہ نکالا جس میں خزانۃ الادب بھی تھی اتفاق سے علی گڈھ میں اس کا کوئی نسخہ نہ تھا باہر سے منگانا پڑی جب وہ نسخہ آگیا تو ان کو حیرت یہ دیکھکر ہوئی کہ وہ کتاب میری جانی پہچانی اور برتی ہوئی تھی ایسے اپنجیے ڈاکٹر صاحب کو میرے ساتھ بہت پیش آئے اگر یاد ایام علی گڈھ تک پہونچے تو دیکھئے گا۔

جب ہم لوگ الفیہ ختم کر چکے تو اب درس نظامیہ کے سلسلہ میں شرح جامی ہونا چاہئے تھی مولنا جامی بڑے شاعر صوفی عالم تھے مگر کافیہ کی شرح کی اہلیت تو معلوم ہو گئی آخر رضی نے بھی تو شرح لکھی ہے گو وہ طویل مغنی سہی لبیب ابن ہشام طویل تھی مفصل زمخشری مختصر تھی گو اسکی شرح ابن یعیش یورپ میں طبع ہو چکی تھی شواہد کے لئے شرح ازبس ضروری ہے مگر یہاں اس کو کون جانتا تھا سنی مولویوں میں ادب کا مذاق کہاں تھا جو کوئی اس کی جستجو کرتا غرض ہر طرح الفیہ کی شرح اوضح المسالک پڑھانا تجویز ہوا اسکی شرح جرجاوی کی ندوہ کے کتب خانے میں موجود تھی۔ اوضح المسالک کا جو نسخہ کلکتہ کا چھپا تھا وہ حامل المتن تھا یعنی الفیہ کے اشعار بھی اس میں تھے مگر مصری نسخے میں خالی شرح تھی اس کتاب کے پڑھنے سے دو فائدے ہوئے اول تو صحیح عربی میں مسائل سمجھنے کی استعداد بڑھ گئی دوسرے شواہد یاد کرنے سے ایکطرف تو

اشعار یاد ہوئے دوسرے مسائل اچھی طرح ذہن نشین ہوگئے اس بیان سے کسی قدر بصیرت طلبہ کو تو ہوگی مگر مجھکو اپنے عہد طفلی کی یاد میں مزہ آرہا ہے اس لئے لکھ رہا ہوں۔ ادب کی تعلیم کا پرداز آپنے سمجھ لیا اس کے بعد مقامات بدیع اور کچھ مقامات حریری ہوئی تھی کہ ہمارے مولنا رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے۔ نظم میں ہم نے جس ذوق وشوق سے متنبی پڑھی تھی اس کا لطف کچھ ہمارے دوستوں کو یاد کرکے آسکتا ہے متنبی ہمارے مولنا کی [illegible] کتاب تھی حماسہ وہ کبھی نہ پڑھاتے بلکہ فرماتے اس کشکول میں کیا رکھا ہے [illegible] آپ [illegible] متنبی [illegible] ایک ایک لفظ مزہ لے لے کر پڑھاتے اس کو پیار کرتے اور پیار نہ کر چکتے اس کے اشعار کا دوسرے [illegible] اشعار سے مقابلہ کرتے انکے محاسن سمجھاتے اور سرقات المتنبی کے ذیل جیسے مصنف کے چونا لگاتے۔

انکی محنت اور شفقت کی داد انکے ایک انگریز شاگرد نے دی جس کو انھوں نے متنبی بنارس [illegible] زمانہ میں پڑھائی تھی یہ صاحب ڈڈہرسٹ ممالک متحدہ کے ایک سولین تھے انھوں نے [illegible] کا سب سے صحیح ترجمہ انگریزی میں شایع کیا ہے بات یہ ہے کہ مغربی مستشرق مولدین [illegible] اور ایسا ہونا قرین قیاس اور قابل معافی بھی ہے ورنہ انھوں نے ہم سے کہیں زیادہ عربی ادب کی خدمت کی ہے جس کا ہم کو مشکور ہونا چاہئے۔

ندوہ کے نصاب میں شروع سے اس کا خیال رکھا گیا کہ قرآن پاک کی تعلیم پر زور دیا جائے [illegible] ہم کو پارہ عم باترجمہ و ترکیب پڑھایا گیا اس کے بعد سورہ ق سے آخر تک خود ہمارے مولنا [illegible] ہم کو تفسیری مباحث پر نوٹ لکھا دیتے ادبیت سے خاص اعتنا تھی کبھی کبھی کسی آیت کی بلاغت پر [illegible] فرماتے جو غالبا طبع زاد ہوتی اس کے بعد جلالین جب شروع ہوئی تو تفسیر دل کھول کر ہوئی الحمد اللہ عربی سمجھنے کی استعداد ہماری اتنی ہوگئی تھی جتنی فارغ التحصیل مولویوں کی ہوتی جلالین کا صرفی ونحوی [illegible] حصہ آسان معلوم ہوا پھر اس میں رکھا ہی کیا تھا میں تو زیادہ وقت دوسری عربی اور اردو کی تفسیروں پر صرف کرتا اس زمانے میں ہمارے مولنا عبدالحق صاحب حقانی کی تفسیر حقانی سے بہت مدد ملی۔ اگر ہمارے

مولنا یہ بات سن پاتے تو برافروختہ ہوتے بڑے قصے ہمارے مولنا تفسیر خازن سے پڑھواتے کسی نحوی یا ادبی مسئلہ کی تحقیق کے لئے کشاف کھل جاتی اس طرح تفسیر تو جلالین ہی ہوئی مگر بڑی تفسیروں سے شناسائی ہوتی گئی۔

کچھ خاندانی احول میں سرسید کی تفسیر دیکھنے کو جی چاہا اصل نہ ملی تو حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تردید سے سید صاحب کے اقوال پڑھ لیتا اب جب نصف یا ایک پارہ جلالین شریف کا ہوگیا تو کتب خانے میں جاکر تفسیر حضرت محی الدین ابن عربی اور تفسیر رازی دیکھتا مگر بالاستیعاب محی الدین البغوی کی تفسیر پڑھتا رہا بلاغت میں ہم نے تلخیص المفتاح سب سے پہلے پڑھی مفتاح کی خشک بیانی اور اس پر سے اس کی تلخیص کڑوا کریلا نیم چڑھا اس کے شرح میں بھی مطول تک کہیں خشکی نہ دفع ہوئی معانی کی بحث میں تو منطق بھر کر اس کو معجون بنا دیا مگر بیان میں کیا کرتے اس چوب خشک کے بعد جب ہم نے شاخ شاداب یعنی حسن التوسل حلبی کی پڑھنا شروع کی تو رطب اللسان ہو گئے آپ اس بیان سے نہ سمجھئے کہ میں نصاب کی ہر ہر کتاب کا ذکر کروں اصول کتابیں تو بہت پڑھیں مگر تبدیلی نصاب اور طرز تعلیم میں جو اہم اختلافات مروجہ درس نظامیہ سے ہوئے انکی حقیقت بتانا منظور ہے تعلیم حدیث میں حنفیت کا لحاظ خاص طور پر تھا چنانچہ فقہ حدیث میں اول مراقی الفلاح دوسرے موطا امام محمد ہم کو پڑھائی گئی پھر تو متداول سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہمارے مولنا کو الفاظ اور ان کے معانی کے ادنیٰ اختلافات پر کافی عبور تھا ایک مرتبہ شعر کے لئے عربی میں جو الفاظ تھے وہ لکھائے تو آنکھیں کھل گئیں۔ لغات کے استشہاد پر بھی کافی عبور تھا خود اکولی الشعر پڑھ دیتے صحاح کے اشعار بکثرت یاد تھے۔ فقہ اللغۃ ثعالبی اور الالفاظ الکتابیہ عبدالرحمن ہم کو رٹا دی تھی اسکی مزاولت سے فقہ اللغۃ پر نظر ہوگی۔

معقولات کی تعلیم کی ترتیب سنئے درس نظامیہ کے مطابق شرح تہذیب پڑھانا چاہئے تھا مگر اس کے بجائے مرقات مولنا فضل امام کی پڑھائی اس میں مسائل شمسیہ سے بھی زیادہ ہیں حسب مغربی منطق پر نظر کی قوانین کی تعلیم کی قدر کھلی دلالت ہی کی بحث میں کثرت سے الفاظ کی مشق کرادی اسی طرح کلیات قضایا میں مختلطات نقیض

عکس نقیض عکس مستوی اشکال اربعہ سب باشتی پڑھاتے منطقی مسائل مستحضر ہو گئے تھے شمسیہ کی شروح بیں لوگ قلبی ہی پڑھاتے ہیں انھوں نے سعدیہ بھی پڑھائی یہی نہیں کیا شرح مطالع و شرح مواقف کے منطقیات بھی پڑھائے ب منطق میں یہ دیکھا گیا تھا اختلافی مسائل کے سمجھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک طالب علم کو رازی دوسرے کو طوسی بنا دیتے اور دونوں کی اختلافی تقریر مشق کراتے ہمارے ساتھیوں میں حافظ البشیر مرحوم اور شاہ مولوی فضل الرحمن مقیم خانقاہ مجددیہ بڑے ذہین اور سمجھدار تھے فلسفہ میں یہ حمد یہ میبذی سے پہلے پڑھادی تو میبذی کا اخلاق آسان ہو گیا تقریریں اکثر لکھا دیتے تھے۔

عقاید و فلسفہ آگے کے دور میں مذکور ہو گا مگر ابتدا میں صاحب تہذیب المنطق کی کتاب تہذیب الکلام زبانی یاد کرادی پھر شرح عقاید نسفی ہوئی۔ یہ بیان کتابوں کے ذکر سے کسی قدر غیر دلچسپ ہو گیا ناظرین معاف کریں۔ ہمارے مولانا جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہ تھے اور یہ پہلے سے سمجھ کر بلائے گئے اور یہ برتاؤ ان کے ساتھ نباہا گیا انکے یہاں اسباق اسطرح ہوتے کہ وہ لیٹے رہتے کبھی کوئی طالب علم سر میں تیل دباتا اور کوئی پاچپی کرتا۔ استاد کی خدمت کی عادت بھی خوب ہوتی ہے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں کسی مسلہ پر گفتگو کر رہا تھا اور پاؤں بھی داب رہا تھا کہ اتنے میں حضرت الاستاد علامہ جو حیدرآباد سے آئے تھے تشریف لے آئے انھوں نے بھی ایک پاؤں شانے پر رکھکر دبانا شروع کیا میں چارپائی سے اتر کر نیچے بیٹھنا چاہتا تھا مگر منع فرمایا ان سے صرف تنا کہا تے بے کب آیا کہا شب کو پھر سلسلہ تقریر جاری رکھا جب وہ تقریر ختم ہو گئی تو علامہ نے رازی اور طوسی کے اختلاف کے متعلق توضیح چاہی فوراً تقریر شروع ہو گئی آخر علامہ کو تشفی ہو گئی مجھے اس وقت یہ دلچسپی تھی کہ علامہ اپنی طالب علمانہ حالت میں نظر آتے تھے اور مجھ میں اور ان میں کوئی فرق نہ تھا اب کہاں وہ کیسے یہ مناظر نصیب ہوتے ہیں۔

حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ

(۴)

از عبدالسلام قدوائی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جلالت شان اور ان کا مرتبہ علم و فضل کسی سے پوشیدہ نہیں فقہاء صحابہ تک مسائل میں انکی طرف رجوع کرتے تھے قبیصہ ابن ذویب کا بیان ہے کہ:

كانت عائشة اعلم الناس يسألها اكابر الصحابة — حضرت عائشہؓ سب لوگوں سے زیادہ عالم تھیں اُن سے بڑے بڑے صحابہؓ دریافت کرتے تھے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انھیں جو قرب و اختصاص حاصل تھا وہ سب کو معلوم ہے حدیث کی کتابوں کے صفحات ان کی مرویات سے پر ہیں محدث ابن جوزی نے انکی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ بتائی ہے۔ یہ روایتیں حضرت عروہ اور حضرت عمرہ کے ذریعہ اسی زمانہ میں کتابی شکل میں مرتب ہوئی تھیں۔

حضرت عروہ حضرت عائشہ کے ہمشیر زادے تھے اس رشتہ سے انکی خدمت میں اکثر حاضری کا موقع ملتا تھا انھیں علم کا ذوق اور احادیث و سنن کی تلاش و جستجو کا بیحد شوق تھا کرید کرید کر حدیثیں پوچھتے مسائل کی تحقیق کرتے اور لوگوں میں انکی اشاعت کرتے انکے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ امام زہری جیسے عالم کا بیان ہے کہ میں نے انھیں ایسے سمندر کی طرح پایا جو کبھی خشک نہیں ہوتا[2]

حضرت عروہ کتابت حدیث کے قائل تھے خود بھی لکھتے تھے اور اپنے بیٹے ہشام کو بھی لکھاتے تھے اتکے پاس خود انکی لکھی ہوئی بھی متعدد کتابیں تھیں جو واقعہ حرہ تک موجود رہیں[3]۔

حضرت عمرہ کی روایتیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے انکے بھانجے ابوبکر ابن محمد نے قلمبند کیں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۲۴ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۵۴ [3] جامع ص ۳۷

قاضی مدینہ سعد بن ابراہیم کو بھی حکم تھا کہ وہ بھی حدیثیں جمع کریں چنانچہ انھوں نے دفتر کے دفتر لکھے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے تمام اسلامی ممالک میں شایع کئے گئے[۱] حضرت عائشہ کی مرویات ایک اور ذریعے سے بھی قلمبند ہوئیں ابو قلابہ ایک مشہور تابعی ہیں جو حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں یہ کتابت حدیث کو بہت ضروری سمجھتے تھے انتقال کے بعد انکی کتابیں ایک بار اونٹ پر لد کر ایوب سختیانی کو ملیں[۲]

مکثرین صحابہ میں حضرت ابوسعید خدری کا بھی شمار ہوتا ہے مرویات کی تعداد ۱۱۷۰ ہے یہ کتابت حدیث پسند نہ کرتے تھے، شاگرد آپ کے مرویات قلمبند کرنا چاہتے تھے، ان لوگوں نے اس کی اجازت چاہی لیکن حضرت ابوسعید نے اُسے منظور نہیں کیا البتہ یہ کہا کہ انھیں اچھی طرح یاد کرلو تاہم یہ روایتیں ان کے شاگردوں حضرت نافع کے ذریعہ احاطۂ تحریر میں آگئیں حضرت نافع کتابت حدیث کے قائل تھے اور انکی روائتیں انکے سامنے لکھی جاتی تھیں[۳] عطاء ابن ابی رباح ان کے ایک نامور شاگرد ہیں ان کا یہ حال تھا کہ انکی روائتیں انکے سامنے پوچھ پوچھ کر لکھی جاتی تھیں[۴]

حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت جابر اور مجاہد بھی ان سے روایت کرتے ہیں[۵] اور ان لوگوں کا مسلک کتابت حدیث کے بارہ میں اوپر کے صفحات میں گذر چکا ہے اس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری کی تمام مرویات عہد صحابہ ہی میں تحریری شکل میں جمع ہو گئی تھیں۔

صفحات بالا میں حضرت ابوہریرہ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت جابر ابن عبداللہ اور حضرت ابوسعید خدری سات کثیر الروایات صحابیوں کا ذکر ہو چکا ہے ان لوگوں کی مرویات کی تعداد (۵۳۷۴ + ۲۶۳۰ + ۲۲۸۶ + ۲۲۱۰ + ۲۶۶۰ + ۱۵۴۰ + ۱۱۷۰) ۱۷۸۷۰ ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن عاص کی مرویات کی تعداد حضرت ابوہریرہ سے بھی زیادہ ہے جسکا حضرت ابوہریرہ کو خود اعتراف ہے لہذا جب حضرت ابوہریرہ کی روایتیں

---

[۱] جامع ص ۳۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۸۲ [۳] داری ص ۶۹ [۴] تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۱۳

۵۳۷۴ ہیں تو حضرت عبد اللہ ابن عمرو ابن عاص کی روایت کردہ حدیثیں کسی طرح چھ ہزار سے کم نہ ہوں گی اس طرح صرف آٹھ صحابہ کی لکھی ہوئی روایتوں کی تعداد کم از کم (۱۷۸۷۰ + ۶۰۰۰) ۲۳۸۷۰ تک پہونچ جاتی ہے اس تعداد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لکھی ہوئی پانچ سو حدیثوں کا اضافہ کیا جائے تو یہ تعداد ۲۴ ہزار سے متجاوز ہو جاتی ہے

اس موقع پر اگر یہ پیش نظر رہے کہ صحیح بخاری کی دو ضخیم جلدوں میں جو بڑے سائز کے ۱۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہیں صرف ۹۰۸۲ ہزار حدیثیں درج ہیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ۲۴ ہزار سے متجاوز روایتوں کے لئے کتنی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوگی اس سلسلہ میں اگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام بخاری کا قاعدہ ہے کہ مختلف مسائل کے ثبوت اور استدلال کی غرض سے ایک ہی حدیث کو متعدد موقعوں پر نقل کرتے ہیں تو اندازہ اور بھی صحیح ہو سکتا ہے ان مکرر حدیثوں کی تعداد اتنی زائد ہے کہ ۹۰۸۲ میں سے حقیقۃً صرف ۲۶۰۲ روایتیں ہیں جو بار بار کی تکرار سے ۹۰۸۲ ہو گئی ہیں[1]۔

اب صحیح بخاری کی روایتوں کی اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مذکورہ بالا صرف آٹھ کثیر الروایات صحابہ کی بیان کردہ حدیثیں کم از کم بخاری جیسی چھ جلدوں میں آئیں گی جن کے صفحات کی تعداد پانچ ہزار سے متجاوز ہوگی۔

اب آئیے ذرا اور آگے بڑھئے صحابہ کرام میں ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب ایسے تھے جو حدیثیں خود بھی لکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی لکھاتے تھے ان صاحبوں میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود خاص طور سے قابل ذکر ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے انھیں تعلق خاص تھا آغاز اسلام سے آپکے ساتھ

---

[1] حافظ ابن صلاح نے صحیح بخاری کی کل روایتوں کی تعداد ۷۲۷۵ بتائی ہے ان میں سے ان کے نزدیک تقریباً چار ہزار غیر مکرر ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور شمار کرکے بتایا ہے کہ کل حدیثیں ۹۰۸۲ ہیں جن میں سے صرف ۲۶۰۲ غیر مکرر ہیں۔

زندگی بھر کی خدمت مبارک میں اس قدر آنا جانا ہوتا تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کوئی آنحضرت کے گھر کے آدمی ہیں یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ اور خلفاء راشدین کی نظر میں ان کی بڑی اہمیت تھی لوگ انھیں آنحضرتؐ سے بہت مشابہ سمجھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں ان کا یہ مرتبہ تھا کہ جب انھیں تعلیم و ارشاد کے لئے کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ میں عبداللہ ابن مسعود کو تمہارے پاس بھیجکر اپنے اوپر تمھیں ترجیح دے رہا ہوں[1]

حضرت عبداللہ شروع میں کچھ دن تک کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے اتنے مخالف تھے کہ لکھی ہوئی کتابوں کے حروف پانی سے دھلوا دیتے تھے اور روایتوں کے مجموعوں کو نذر آتش کر دیا کرتے تھے[2] لیکن جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس جانب ایسی توجہ کی کہ خود بھی حدیثیں کتابی شکل میں مرتب کیں اور اپنے شاگردوں کو بھی لکھائیں ان کے شاگرد ان کی روایتیں لکھ لیا کرتے تھے[3]۔ ان کے مشہور شاگرد علقمہ کاغذ پر لکھی ہوئی حدیثیں زبانی یاد کرتے تھے[4]

[1] حضرت عبداللہ ابن مسعود کے یہ مناقب تاریخی تذکروں کے علاوہ بخاری اور صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں [2] جامع بیان العلم ص ۶۳ [3] دارمی ص ۶۷ [4] جامع ص ۷۲

ضروری تصحیح

مارچ کے الندوہ میں سلسلہ یاد ایام ص ۲۳ پر مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی کی کتاب بشریٰ کے متعلق شایع ہوا تھا کہ یہ کتاب ابھی تک شایع نہیں ہوئی اس سلسلہ میں مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مطلع فرماتے ہیں کہ "یہ ضخیم کتاب گذشتہ سال شایع ہو گئی ہے پانچ سو صفحے کم و بیش ضخامت ہے" اسی طرح ص ۲۷ پر اسی مضمون کی عبارت کے متعلق کہ "منشی صدیق حسن مانکپوری فرزند جلیل مرحوم" فرماتے ہیں کہ جلیل جو مشہور شاعر اور استاد حضور نظام ہیں۔ بفضلہ زندہ ہیں۔ صدیق صاحب بھی واقف ہوں۔

حالات ندوہ

۲۰ مارچ کو ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کا جلسہ تھا جس کی کارروائی اگلے صفحات میں درج کی جا رہی ہے

اس موقع پر دارالعلوم میں کچھ بڑی چہل پہل رہی ۲۹ مارچ کو جبالیہ ہال میں جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری و معتمد مال ندوۃ العلماء کی صدارت میں ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دارالعلوم نے بہت ہی مفید و موثر اور ولولہ انگیز و وجد آفریں تقریریں فرمائیں جنھیں سنکر ایمان کو تازگی اور روح کو بالیدگی حاصل ہوئی مولانا شروانی نے طالب علموں کو ان کے بلند نصب العین اور اعلیٰ مقصد زندگی کی طرف توجہ دلائی اور اس راہ میں پوری جد و جہد اور ہر طرح کے ایثار و قربانی کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہا است بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی تقریر میں ندوہ کے اصلاحی مقاصد اسکی پچھلی تاریخ اور بزرگوں کی انتھک کوششوں کا ذکر فرمایا آپنے بتایا کہ ندوہ کے مقاصد سے اب ہر شخص متفق ہے ضرورت ہے کہ ہمارا قدم برابر آگے بڑھتا رہے اور زمانہ کے اس انقلاب انگیز دور میں رہنمائی کا فریضہ بدستور ادا ہوتا رہے۔

اس موقع پر عطاء اسناد اور تقسیم انعامات کی رسم بھی انجام پائی جناب منشی احتشام علی صاحب نے درجہ فضیلت کے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سندیں عطا فرمائیں سالانہ امتحان میں جو طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے تھے انھیں نواب صدر یار جنگ بہادر کی طرف سے انعامات دئے گئے اس سلسلہ میں الاصلاح کے مدیر محمد نواب خاں اور ناظم اقبال وارث انصاری کو صلاحیت و حسن خدمات کے تمغے دئے گئے اور محمد نعمان خاں، محمد اسحق لشاوری اور علی احمد کو تمغہ لیاقت عطا ہوئے۔

آخر میں جناب منشی احتشام علی صاحب نے ایک جامع اور پراثر تقریر میں ندوہ کے سابق کارناموں اور آئندہ عزائم کا ذکر فرمایا۔

مارچ میں معین الندوہ کی مجلس منتظمہ کے دو جلسے منعقد ہوئے جس میں پچھلے حسابات اور آئندہ بجٹ پر بحث ہوئی اور بنگال و بہار کی شاخوں کے قیام اور ان سے متعلق مسائل پر غور کیا گیا اس موقعہ پر خاص لکھنؤ میں معین الندوہ کے کام کو آگے بڑھانے کی راہیں سوچی گئیں مولانا محمد عمران خاں صاحب انچارج مہتمم دار العلوم کی صدارت میں ایک وفد مرتب ہوا جو عنقریب شہر اور اطراف و جوانب کا دورہ کرے گا۔

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں مجلس نقباء (مانیٹروں کی کمیٹی) کا ذکر آچکا ہے اس مجلس کا پہلا دور فروری میں ختم ہوگیا اور مارچ میں نیا انتخاب عمل میں آیا جسکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شبلی دار الاقامہ

نقیب عام (جنرل مانیٹر) اقبال وارث انصاری

نقیب ۔ ابو العرفان، محمد سابق پشاوری

نقیب دینیات ۔ عبد الغفار، نجم الدین برنی

نقیب تعلیم ۔ عبد الحفیظ قدوائی، عبد الحکیم

نقیب صحت ۔ نظام الدین، محمد زبیر

دار الاقامہ فوقانیہ و تحتانیہ

مسیح الزماں، عبد الجلیل، اسماعیل سورتی اور علی احمد بہاری کے بجائے احمد خالد، کلیم اللہ، احتشام علی اور واحد علی منتخب ہوئے تحتانیہ میں صلاح الدین کے بجائے عقیل احمد کا نقیب عام کے لئے انتخاب ہوا۔

جلسۂ انتظامیہ ندوۃ العلماء

(از مولانا عبدالغفور صاحب بشر ندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء)

۲۷ مارچ ۱۹۴۱ء کو ندوۃ العلماء کا انتظامی جلسہ جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس معتمد مال کی کوٹھی پر منعقد ہوا جس میں نواب صدر یار جنگ بہادر منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس معتمد مال ندوۃ العلماء مولانا محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دارالعلوم ندوۃ العلماء مولوی سید نواب علی صاحب ایم اے مولانا مسعود علی صاحب ندوی مولوی محمد منظور النبی صاحب مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لاء اور ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء شریک تھے بتحریک نواب صدر یار جنگ بہادر واتفاق جلسہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی جلسہ کے صدر منتخب ہوئے

(۱) کارروائی جلسۂ انتظامیہ ندوۃ العلماء منعقدہ ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء حسب دفعہ ۳۷ "ب" دستور العمل ندوۃ العلماء برائے تصدیق پیش کی گئی جسکی تصدیق کی گئی۔

(۲) (الف) مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ شفاء الملک مولوی حکیم عبد الحمید صاحب مولانا ابو بکر محمد شیث صاحب ندوی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ابوالمحاسن مولانا سید محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار نیابت العلوم مولوی مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے مشیر المہام ریاست بھوپال مولانا عبدالرزاق صاحب ناگپوری رکن انتظامیہ ندوۃ العلماء کے انتقال پر ملال پر اپنے دلی افسوس و رنج کا اظہار کرتا ہے اور انکے پسماندگان کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور ان سب کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

(ب) مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے

انتقال پُرملال پر اپنے دلی رنج و انسوس کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے

(۳) [illegible] ندوۃ العلماء کا جلسہ شمس العلماء [illegible] صاحب بہادر [illegible]

[illegible] تکمیل عمارت [illegible]

(۴) [illegible] ندوۃ العلماء بابتہ ۱۹۳۱ء [illegible] اور [illegible]

[illegible] منظور کیا گیا۔

(۵) نواب [illegible] یار جنگ بہادر کی مندرجہ ذیل تجویز پیش ہوئی

ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس یا اجلاس عام سال بسال سے نہیں ہوا ہے حالانکہ ملک میں اور کانفرنسیں اور مجلسیں اپنے اجلاس برابر کرتی رہتی ہیں سالانہ اجلاس ہونے سے ہماری تحریک کمزور ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے اس لئے ایک سب کمیٹی ضروری انتظام کیواسطے بنادی جائے اور ۱۳۵۰ھ میں کسی مناسب وقت میں اجلاس کا زمانہ معین کر دیا جائے

بعد مشورہ و بحث کے یہ قرار پایا کہ ایک سب کمیٹی مندرجہ ذیل [illegible] کی بنادی جائے۔

نواب [illegible] یار جنگ بہادر مولانا سید سلیمان ندوی معتمد [illegible] مسعود علی [illegible] صاحب [illegible] منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس معتمد مال ندوۃ العلماء اور یہ طے پایا کہ ابتدائی مصارف کے لئے پانچسو منظور کیا جاتا ہے۔

(۶) ظفر حسن خاں صاحب مرحوم رئیس ضلع علی گڈہ نے ایک وقف نامہ لکھا تھا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ دارالعلوم ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند و حمایت اسلام لاہور کے لئے اپنی جائداد وقف کی تھی [illegible] مقدمہ دائر کر دیا گیا ہے جس کے لئے پانچسو پچاس روپے منظور کئے گئے۔

(۷) حسب تجویز معتمد صاحب دارالعلوم مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی کی تنخواہ میں [illegible] روپیہ ماہوار کا اضافہ [illegible]

مولوی نورالحسن صاحب کی تنخواہ میں پانچ روپیہ ماہوار کا اضافہ مولوی مفتی محمد سعید صاحب کی تنخواہ میں پانچ روپیہ ماہوار کا اضافہ اور مولوی محمد ادریس صاحب کی تنخواہ میں تین روپیہ ماہوار کا اضافہ منظور کیا گیا۔

(۸) حسب تجویز معتمد صاحب دارالعلوم مولوی شاہ عزیزالدین صاحب کا تقرر بحیثیت ادیب کے للعہ ماہوار پر ایک سال کے لئے عارضی طور پر منظور کیا گیا۔

(۹) ارکان انتظامیہ ندوۃ العلماء اور معتمد دارالعلوم کے انتخاب کے متعلق جیسی رائیں آئی تھیں وہ سب جلسہ میں کھولی گئیں اور مندرجہ ذیل ارکان اور معتمد دارالعلوم کا انتخاب عمل میں آیا۔

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ۔ الف عالم۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ مولانا مسعود علی صاحب ندوی۔ مولوی احمد زماں خاں صاحب رئیس شاہجہانپور خان بہادر مولوی عبیدالرحمن خاں صاحب شروانی ایم ایل سی ٹرسٹی مسلم یونیورسٹی۔ مولوی عبدالمجید صاحب بی اے بنارسی مولانا عبدالباری صاحب ندوی۔ مولوی حکیم عبدالمجید صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ (انتخاب جدید)

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (ب) غیر عالم منشی محمد اطہر علی صاحب ایڈوکیٹ ایم ایل اے لکھنؤ۔ مولوی سید ظہور احمد صاحب ایڈوکیٹ منشی محمد احترام علی صاحب رئیس کاکوری (انتخاب جدید)۔ نواب زادہ سید شمس الحسن خاں صاحب بی اے ایل ایل بی، لکھنؤ۔ (انتخاب جدید)

پنجاب و صوبہ سرحد شمالی و مغربی۔ الف عالم مولوی ضیاء اللہ صاحب ندوی مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور
" " (ب) غیر عالم مولوی عبدالرب صاحب بی اے شملہ۔ مولوی حکیم عبدالعزیز صاحب پشاور

دہلی مولانا کفایت اللہ صاحب۔ سید مرتضیٰ علی صاحب

بہار مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ضلع پٹنہ۔ مولوی حاجی معین الدین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ مولانا شاہ حسین میاں صاحب (انتخاب جدید) پھلواری ضلع پٹنہ۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب بیرسٹر ایٹ لا چھپرہ۔

مدراس۔ مولانا محمد فضل اللہ صاحب۔

ممالک متوسط و برار۔ مولوی محمود سلیمان صاحب ندوی ہیڈ گورنمنٹ ہائی اسکول امراوتی۔ مولوی محمد اکبر خاں صاحب ندوی ایم اے اکسٹرا ضلع بلاسپور (انتخاب جدید)

سندھ و بلوچستان۔ مولانا محمد صادق صاحب مدرسہ مظہر العلوم کراچی، مولوی عبدالودود صاحب صدر المدرسین عالیہ ریاست رامپور۔ دبیر الملک مولوی قاضی ولی محمد صاحب بھوپال

معتمد دارالعلوم۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے

(۱۰) تخمینہ آمد و صرف ندوۃ العلماء بابتہ ۴۲-۱۹۴۱ء منظور کیا گیا۔

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۵

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپیہ

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر "مینیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ" کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

علمی اور واقف حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ سید عمر صاحب حسنی انجینیر ریاست جوناگڈھ نے اپریل کے پہلے ہفتہ میں انتقال کیا، مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجے مولوی سید محمد علی صاحب مؤلف مخزن احمدی کے پوتے تھے اور علمی اسلامی اخلاق اور انسانی فضائل وصفات کا نمونہ تھے، ایثار، صلاحیت اور غربا پروری میں آپکی نظیر مشکل سے ملیگی۔ انکے لئے یہ جملہ بالکل مطابق حال ہے کہ "رفتند و آدمیت بخاک بردند"

مرحوم ہندوستان کے ماہرین طبیعات میں سے تھے اور یورپ اور جاپان کے مشہور علمی حلقوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اعلیٰ علمی سوسائٹیوں کے اعزازی رکن تھے۔ آپکے سائنٹفک مضامین ہندوستان کے رسائل میں شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں، جن کا مجموعہ مشاہدات سائنس کے نام سے طبع ہوچکا ہے۔ ہمیں اس حادثہ پر حسنی خاندان سے بالعموم اور مرحوم کے فاضل بھائی مولانا سید طلحہ صاحب ندوی سے بالخصوص دلی ہمدردی ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انکے درجات بلند کرے

دارالعلوم اور اس سے متعلق عمارتوں کی تکمیل کا مسئلہ عرصہ سے زیر غور تھا، فراہمی سرمایہ کی غرض سے کئی بار کمیٹیاں بنیں لیکن کچھ حالات ایسے پیش آتے رہے کہ یہ کوششیں بار آور نہ ہوسکیں پچھلے سال صادق ایجرٹن کالج میں خطبہ تقسیم اسناد کی غرض سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بہاولپور تشریف لیگئے تھے اس موقع پر عالی مرتبت وزیر اعظم اور وزیر صاحب تعلیم کے توسط سے اعلیحضرت نواب صاحب بہاولپور کی خدمت میں امداد و اعانت کی درخواست پیش کیگئی جسے شرف قبولیت حاصل ہوا۔ اب قارئین الندوہ کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ سرکاری طور پر پندرہ ہزار روپیہ کی منظوری کی اطلاع آگئی ہے امید ہے کہ یہ رقم عنقریب وصول ہوجائیگی اور

حسب دلخواہ عمارت کی تکمیل ہوجائیگی۔

ریاست حیدرآباد میں بھی اس قسم کی کوششیں کیجارہی ہیں، گذشتہ سال مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ خود حیدرآباد تشریف لیگئے۔ اعلیٰحضرت شہریار دکن کی خدمتیں بار یابی کا موقع ملا تو ندوہ کی اعانت کی درخواست پیش کی۔ ہمیں اُمید ہو کہ یہ معروضہ جلد شرف قبول حاصل کریگا اور اعلیٰحضرت خسرو دکن کی علمی قدر دانیوں اور سرپرستیوں کی تاریخ میں ایک اور زرین باب کا اضافہ ہوگا

اس موقع پر ندوہ کے ہمدردوں کے لئے یہ اطلاع بھی باعث مسرت ہوگی کہ حکومت کشمیر نے بھی ندوہ کی جانب توجہ فرمائی ہے اور ڈائرکٹر تعلیمات جناب خواجہ غلام السیدین صاحب کی تحریک پر دس دس روپیہ ماہوار کے پانچ وظیفے کشمیری طالبعلموں کے لئے منظور فرمائے ہیں، ہمیں اُمید ہو کہ کشمیر کی طرح ہندوستان کی دوسری ریاستیں بھی اپنی ریاست کے ہونہار طلبہ کو وظیفے دیکر ندوہ میں تعلیم کا موقع دیں گی۔

بنگال و آسام کی شاخ معین الندوہ کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہی، ندوہ کے ہمدردوں کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ کچھ عرصہ ہوا صوبۂ بہار میں بھی ایک شاخ قائم ہوگئی ہی مسٹر جعفر امام صاحب ایڈوکیٹ اسکے صدر اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اسکے ناظم منتخب ہوئے ہیں، مولوی محی الدین صاحب ندوی مہتمم حلقہ مقرر ہوئے ہیں اور مولوی محمد زکریا صاحب کاظمی نشر و اشاعت کے فرائض انجام دیں گے۔ بہار و اہل بہار سے ندوہ کے تعلقات قدیم ہیں ہمیں اُمید ہو کہ وہ ان دیرینہ روابط کا خیال رکھیں گے اور معین الندوہ کے کارکنوں کی بیش از بیش امداد فرمائیں گے۔

الندوہ کے حلقہ میں مولانا محمد عمر صاحب نعمانی کی ذات محتاج تعارف نہیں، انھیں ندوے

والہانہ محبت ہو عرصہ سے انکی تجویز ہو کہ رسالہ کی ضخامت میں اضافہ کردیا جائے اور اسکے قیمت میں اضافہ کردیا جائے۔ ایک قریبی والانامہ میں فرماتے ہیں کہ۔

"الندوہ کا نقش ثانی ایک سال کے اندر نقش اوّلیں سے سبقت لیجارہا ہے اور بحمد اللہ اسپر صحیح معنوں میں "ہر چیز بہ قیمت کہتر بہ قیمت بہتر" کا اطلاق ہو رہا ہے۔ اسکے دلکش، دلآویز اور پُر معلومات مضامین سے رُوح بالیدہ ہو جاتی ہو۔ اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ؎

شورش عندلیب نے رُوح چمن میں پھونکدی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

رسالہ کے حجم کو مناسب صفحات تک بڑھا کر اسکی سابقہ قیمت میں بقدر ایک روپیہ اضافہ کردیا جائے مجھے امید ہو کہ قدردانان الندوہ کو ذرا اضافہ کی ترسیل میں کوئی عذر مانع نہ ہوگا۔"

معلوم نہیں اس بارے میں ہمارے دوسرے دوستوں کا کیا خیال ہے۔

الندوہ عموماً ہر مہینہ کی بیس تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ تاریخ تک اسے خریداروں کے پاس پہونچ جانا چاہئے، اگر خدانخواستہ کسی صاحب کو ان تاریخوں میں رسالہ نہ ملے تو اسی ماہ کی آخر تک دفتر کو اطلاع دیں تاکہ دوسرا پرچہ بھیجا جاسکے۔ اسکے ساتھ مناسب ہوگا کہ اپنے ڈاکخانہ سے بھی دریافت کریں تاکہ رسالہ وہاں ضائع نہ ہوسکے یہاں کے رسالہ احتیاط کے ساتھ ڈاکخانہ کی رسید لیکر روانہ کیا جاتا ہے

قرآن کی ایک پیشین گوئی

از سید ابوالحسن علی ندوی

مندرجۂ ذیل مضمون حقیقت میں درس کی ایک تقریر ہے جو مضامین قرآن کے سلسلہ میں (جسکا ذکر الندوہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء میں نکلا ہے) سال ششم کے طلبہ کے سامنے اعجاز القرآن کی بحث میں کی گئی۔

قرآن مجید کا ایک اعجاز اسکی پیشین گوئیاں ہیں۔ معجزہ اسی چیز کو کہتے ہیں جو خارق عادت طریقہ پر محض خدا کی قدرت سے کسی پیغمبر کی تصدیق کے لئے ظاہر ہو اور انسانی عقل اسکی ظاہری توجیہ و تعلیل سے قاصر ہو۔ جن حالات میں یہ پیشین گوئیاں کی گئی ہیں اور جس طرح انکا ظہور ہوا وہ ایک معجزہ ہے۔ ان پیشین گوئیوں میں اعجاز کے دو پہلو جمع ہیں۔ ایک ان بظاہر ناموافق حالات میں ان بعید از قیاس اور اہم واقعات کا محض علم و اطلاع، دوسرے اس اطلاع کے عین مطابق ان کا ظہور و وقوع۔

ان سب پیشین گوئیوں میں سب سے زیادہ صاف و صریح اور محیر العقول پیشین گوئی غلبۂ روم کی پیشین گوئی ہے۔ یہ پیشین گوئی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

الٓمّٓ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰہِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ	الٓمّٓ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور وہ اپنے مغلوب ہونیکے بعد چند سال میں غالب آجائیں گے۔ اس سے پہلے بھی اور اسکے بعد بھی اللہ ہی کو سب اختیار ہے، اور اس دن مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جسکی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ غالب اور رحم کرنے والا ہے یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدہ کا خلاف

وَعْدَهُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ	نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، یہ لوگ
لَا يَعْلَمُونَ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ	دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے
الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ	غافل ہیں۔ (الرّوم ع ۱)

اس پیشین گوئی کا اسلوب اور سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اسکو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ اور ان دونوں کی صداقت کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہ بالکل غیر معمولی اور غیر عادی واقعہ ہو اسلئے کہ رومیوں کا یہ غلبہ انکی انتہائی مغلوبیت کے بعد ہوا ہو اسلئے آیت کی ابتدا میں دو جگہ ان کی مغلوبیت کا ذکر کیا گیا ہو، اس واقعہ کی غرابت کا دوسرا پہلو یہ ہو کہ یہ واقعہ نو سال کے اندر اندر پیش آئے گا جو ایک برباد شدہ سلطنت اور ایک زوال پذیر قوم کے اُبھرنے اور فاتح کو مفتوح بنا لینے کیلئے ناکافی مدت ہو، آیت کے دوسرے حصے میں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہو کہ یہ واقعہ خارق عادت طریقہ پر ظاہری آثار و قرائن کے بالکل خلاف اور علم انسانی قیاسات و توقعات کے برعکس ظہور پذیر ہوگا، چنانچہ پہلے فرمایا۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ	اول و آخر اللہ ہی کو اختیار رہے۔

جسمیں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ کو ہر وقت اختیار رہا اسکو غالب کو مغلوب اور مغلوب کو غالب، مُردہ کو زندہ اور زندہ کو مُردہ کرتے کچھ دیر نہیں لگتی اسکے لئے کسی وقت کی کوئی قید اور سازگار حالات کا انتظار نہیں، وہ دن رات ایسے تصرفات کیا کرتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	کہو اے اللہ سلطنت کے مالک جس کو چاہے تو
مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ	سلطنت دے اور جس سے چاہے تو سلطنت
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ	چھین لے، جس کو چاہے تو عزت دے، جس کو
بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	چاہے تو ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ بھلائی ہے،

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آل عمران ع ۳)

بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے، رات کو دن میں داخل کرتا ہے، دن کو رات میں داخل کرتا ہے، زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے ، اور جس کو چاہتا ہے نو بے حساب بخشتا ہے

پھر آگے چلکر فرمایا کہ یہ واقعہ محض خدا کی مدد کا نتیجہ ہوگا اور مسلمان ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کے قریب تر ہونیکی وجہ سے اور کفار کے طنز و تعریض کی وجہ سے اسی درجہ بلکہ اس سے زیادہ مسرور ہوں گے جتنے رومیوں کی شکست سے وہ محزون ہوئے۔

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ   اور اس دن مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہونگے

ممکن ہے کہ اس سے خود مسلمانوں کی اس عظیم الشان اور فیصلہ کن فتح کی طرف اشارہ ہو جو بدر کے میدان میں ٹھیک اسی دن پیش آئی جس دن رومی ایرانیوں پر غالب ہوئے۔ (ابن کثیر بروایت ابن عباسؓ) اسپر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رُومی عیسائیوں کی مدد کیوں کریگا فرمایا (جسکی چاہے وہ مدد کرے) اور اپنی ان صفتوں کا ذکر کیا جنکا اس محیر العقول واقعہ سے خاص تعلق ہے اور اسکے امکان و ظہور کے لئے ایک دلیل کے طور پر ہیں

وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝   اور وہ غالب اور رحم والا ہے۔

اس واقعہ کے ظہور میں ان دونوں صفتوں کا ظہور رہوا، ایرانیوں کے لئے جو اپنی فتح کے نشہ میں سرشار تھے، عزت و غلبہ خداوندی کا اور رومیوں کے لئے جنکا جسم اور قلب زخموں سے چور چور تھا، اور انکی سلطنت عالم سکرات میں موت کی سسکیاں لے رہی تھی انکے بچاس ہزار آدمی قید اور انکی قوم طرح طرح سے ذلیل کیجارہی تھی، رحمت الٰہی کا ظہور تھا، پھر ان مسلمانوں کے لئے جن کو ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی

شکست سے طبعی طور پر رنج پہونچا تھا۔ شادمانی کا پیام تھا، اور خود ان کے آیندہ غلبہ کی پیشین گوئی اور اس کا اشارہ تھا۔ پھر اسکی اور تاکید فرمائی کہ اسمیں تخلف نہیں ہو سکتا۔

پھر آخری طور پر یہ بتا دیا کہ یہ واقعہ انسان کے ظاہری معلومات اور روزمرہ کے تجربات کے خلاف پیش آئیگا اسلئے بہت سے لوگ اسکے وقوع سے پہلے اسکی تصدیق کرنیسے عاجز ہوں گے اور اپنے ظاہری علم سے اسکا قیاس نہ کر سکیں گے۔

ولکن اکثر الناس لایعلمون ہ یعلمون ظاہراً من الحیوۃ الدنیا و ھم عن الاٰخرۃ ھم غٰفلون ہ — لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

اب ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو کہ وہ کیا ناموافق اور تاریک حالات تھے جنمیں رومیوں کا غلبہ ایسا مستبعد اور بعید از قیاس سمجھا گیا کہ قرآن نے اسکو اس اہمیت کے ساتھ بیان کیا اور اسکو قدرت خداوندی اور صداقت قرآنی کے ایک نشان کے طور پر پیش کیا۔ ایک غلام قوم کا آزاد ہو جانا، ایک دبی ہوئی قوم کا ابھر جانا اور ایک سلطنت کا دوسری سلطنت کو زیر کر لینا تاریخ کا کوئی نادر اور مستثنیٰ واقعہ نہیں ہے، لیکن قرآن نے اس واقعہ کو ایک غیر معمولی واقعہ کے طور پر بیان کیا ہو۔

اسلئے ہمیں سب سے پہلے اس ماحول کو دیکھنا ہو جسمیں اس واقعہ نے ایک معجزہ کی حیثیت اختیار کر لی، کیا واقعی رُومی اتنے مغلوب، درماندہ اور نیم جاں ہو رہے تھے اور ایرانیوں نے اتنی عظیم الشان فتح حاصل کر لی تھی اور رُومی علاقوں اور صوبوں میں اتنی مستحکم سلطنت قائم کر لی تھی کہ نو برس کے عرصہ میں پانسے کا پلٹ جانا، مفتوح کا فاتح بنجانا ایک نہایت غیر معمولی واقعہ ہو؟ واقعہ کے ظہور میں خدا کی قدرت کا ہاتھ کام کر رہا تھا، کیا اسکے سوا اسکی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہو سکتی؟ اس سوال کا جواب ہم یورپین مؤرخین کے بیانات سے دیں گے۔ اس بیان میں ہمارا بڑا ماخذ مشہور انگریز مؤرخ اور ادیب گبن کی تاریخ "زوال روما" ہے۔

ایرانی حملہ کے اسباب خسرو[1] نے (جو نوشیرواں کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا تھا) بہرام اگور سے بھاگ کر جو ہرمز کو اتار کر ساسانی تخت پر قابض ہو گیا تھا، روم میں پناہ لی[2]۔ یہ شہنشاہ مارس[3] کی حکومت کا زمانہ تھا، اسنے ایرانی شہزادہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور شاہانہ اکرام سے پیش آیا، اور اپنا بیٹا بنا لیا[4] اور مشہور رومی جنرل نرسی کی ماتحتی میں ایک فوج بھیجی جسنے خود ایرانیوں کی مدد سے ۵۹۰ء میں خسرو کو اسکے آبائی تخت سلطنت پر بٹھا دیا، خسرو مارس کے اس احسان کا ممنون رہا اور اسکو اپنا محسن باپ سمجھتا رہا، شہنشاہ مارس کی زندگی تک ایرانی اور رومی سلطنتوں میں دوستانہ تعلقات رہے اور اس احسان کی وجہ سے رومی سلطنت کو سیاسی اور مادی فوائد حاصل ہوئے۔ ۶۰۲ء میں فاکس (PHOCAS) نامی ایک فوجی سردار نے شہنشاہ کے خلاف بغاوت کی اور اسکو اور اسکے خاندان کو نہایت سنگدلی اور بیدردی سے قتل کرکے قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھا، بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کے دوستانہ تعلقات اور مراسم کے مطابق نئے رومی بادشاہ نے شہنشاہ ایران کو اپنی تخت نشینی کی اطلاع کی اور خسرو کے دربار میں اپنا سفیر لیلیس (LILIUS) نامی کو بنا کر بھیجا یہ وہ شخص تھا جسنے شہنشاہ ایران کے محسن مارس اور اسکی اولاد کے سر فاکس کے سامنے پیش کئے تھے۔ جب یہ رومی سفیر شہنشاہ ایران کے دربار میں حاضر ہوا اور خسرو کو واقعہ کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ سخت برافروختہ ہوا، سفیر کو قید کر دیا، اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور اعلان کیا کہ وہ اپنے "باپ" اور محسن کا انتقام لیگا، اس شریفانہ جذبۂ انتقام کو ناگہانی اور صوبجات کے ایرانی گورنروں کے مذہبی اور قومی تعصبات نے اور مشتعل کیا اور خسرو نے ۶۰۳ء[5] میں روم پر حملہ کیا۔

---

[1] عربی تاریخوں میں کسریٰ ابرویز اور انگریزی تاریخوں میں (CHOSROES)

[2] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں عربی اور فارسی تاریخیں

[3] عربی کتابوں میں موریقس اور انگریزی میں (MAURICE)

[4] مسعودی وغیرہ کے بیان کے مطابق اسکے ساتھ اپنی بیٹی ماریہ کی شادی کر دی

[5] بعثت نبوی سے سات سال قبل

ایرانی فتوحات کی وسعت فاکس نے نارسیس اعلیٰ رومی جنرل کو قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلا دیا تھا۔ رومی سلطنت میں اسوقت اس سے بہتر فوجی قائد موجود نہ تھا۔ اسکے نام سے اسیرانی مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں۔ اسکے قتل کے بعد رومی فوجیں ہاتھیوں کے پاؤں سے روندی گئیں خسرو نے رومیوں کی سرحدی قلعہ بندیوں کو پہلے ہی مسمار کر دیا تھا۔ اسنے دریائے فرات عبور کر کے شام کے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ہیرو پلیس، چالسس اور حلب (شام کے شہر) پر قبضہ کرتے ہوئے اسنے بازنطینی سلطنت کا مشرقی دار السلطنت انطاکیہ فتح کر لیا۔

ایرانی فتوحات کا یہ تیز سیلاب رومی سلطنت کے زوال و انحطاط اور فاکس کی نا قابلیت کی دلیل تھی۔ ایرانیوں نے اسکے بعد کیپے دوشیا[۱] (CAPPADOCIA) کا دار السلطنت قیساریہ بآسانی فتح کر لیا۔ اسکے بعد دمشق، الخلیل، شرق اردن کی فتح کے بعد یروشلم پر قبضہ ہوا۔ "مدفن مسیح" (عیسائی عقیدہ کے مطابق) ہیلینا اور قسطنطین کے شاندار کلیسا نذر آتش ہوئے۔ تین سو برس کی مذہبی نذریں ایک دن میں وقف عام ہوئیں۔ اصلی صلیب ایران کو منتقل ہو گئی اور نوے ہزار مسیحیوں کا قتل عمل میں آیا۔

شام کے بعد مصر پر ایرانی قبضہ ہوا، اور حبش اور طرابلس (المغرب) تک ایرانی مملکت کی سرحدیں پہنچ گئیں، رومی نوآبادیاں اور افریقہ کے مقبوضات بھی ایرانیوں کے ہاتھ آئے، ایرانی فاتح سکندر کے نقش قدم پر صحرائے لیبیا کے راستے واپس آیا۔ ایرانی فوج کے ایک حصہ نے فرات سے باسفورس اور چالسیڈن[۲] تک قبضہ کر لیا، اور قسطنطنیہ کے بالکل سامنے دس برس تک ایرانی کیمپ

[۱] ایشیائے کوچک کا ۲۵۰ میل لمبا اور کچھ کم ۱۵۰ میل چوڑا مرتفع علاقہ جسکے مشرق میں کوہ ٹارس (کا پہاڑی سلسلہ) اور دریائے فرات، مغرب میں گلیشیا اور لائے کونیا شمال میں پانٹس اور جنوب میں کوہ ٹارس کا سلسلہ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

[۲] دریائے فرات اور ساجر کے سنگم سے ۱۶ میل جنوب مغرب اس شاہراہ پر واقع تھا جو شمالی سیریا اور میسوپوٹیمیا کو ملاتی تھی۔ (حوالہ سابق)

نصب ہا، اگر خسرو کے پاس بحری طاقت ہوتی تو وہ یورپ کے صوبوں کو اپنی حکومت میں لے سکتا تھا۔

ہرقل کی تخت نشینی عین جس وقت رومی سلطنت زندگی اور موت کی اس کشمکش میں مبتلا تھی افریقہ کے گورنر ہرقل (HERACLIUS) نے فاکس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ۶۱۰ء[1] میں فاکس کو قتل کر کے گرتی ہوئی سلطنت روما کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، حکومت سنبھالتے ہی پہلی اطلاع جو ملی وہ انطاکیہ کا سقوط تھا۔

فاکس کے قتل سے خسرو کی آتش انتقام بجھ جانی چاہیے تھی اور اس کو ہرقل کا ممنون ہونا چاہیے تھا جس نے اُسکے محسن کے قاتل اور سلطنت کے غاصب کو قتل کر دیا تھا، مگر ایرانی شہنشاہ کی نیت بدل چکی تھی، اس نے اپنی جارحانہ کارروائیاں جاری رکھیں اور اپنی فتوحات کے سلسلہ کی تکمیل کی۔

رومیوں کی مشکلات ۶۱۵ء میں رومی پوری طور پر مغلوب ہو گئے اور انھوں نے اپنی عظیم الشان سلطنت روما ایرانیوں کے ہاتھ کھو دی۔ ان مشرقی نقصانات کے علاوہ جو ایرانیوں کے ہاتھوں اسکو ہو چکے تھے، پوری یورپ میں غدر مچا ہوا تھا، اسٹریا (ISTRIA) کی سرحد سے تھریس کی دیوار تک آوارس (AVARS) مظالم ڈھا رہے تھے، جنگ اطالیہ میں جن معصوم انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا وہ بھی ابھی خشک نہیں ہوا تھا۔ اوارس نے پنونیا (PANNONIA) کے مقدس میدان میں مرد قیدیوں کو قتل کر دیا عورتیں اور بچے غلام بنا لئے گئے، رومی سلطنت قسطنطنیہ کی دیواروں یونان، اٹلی اور افریقہ کے کچھ بقیہ حصوں اور ایشیائی ساحل کے چند بحری مقامات میں صور سے طرابزون تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، مصر کے سقوط کے بعد غلہ کی درآمد بند ہو گئی، قسطنطین کے زمانہ ۳۳۰ء سے قسطنطنیہ میں غلہ کی عام تقسیم ہوتی تھی تاکہ لوگوں کے لئے قسطنطنیہ میں رہنے کی کشش پیدا ہو۔

* ۶۱۵ء سلطنت بڑی نازک حالت میں تھی اور ایرانیوں کا قسطنطنیہ پر محاصرہ ایک عرصہ تک قائم رہا

---

[1] ۱۰ نبوت (سال بعثت نبوی)

۶۱۶ء میں پہلی مرتبہ غلہ کی بندش کی وجہ سے مجبوراً اس تقسیم کو بند کرنا پڑا۔

ہرقل کا طرز عمل ہرقل کے سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ہرقل میں ان اہم حوادث کے باوجود کوئی جوش عمل اور کوئی زندگی نہیں تھی اور وہ اپنی آنکھوں سے دولت روما کے اس خاتمہ کو دیکھ رہا تھا۔ گبن لکھتا ہے کہ "ہرقل اپنی حکومت کے ابتدائی اور آخری دور میں نہایت سست و کاہل عیش کا بندہ وہم پرست اور اپنی قوم کے مصائب کا ایک بے حمیت اور نامرد تماشائی تھا۔"

قرآن کی پیشین گوئی ۶۱۶ء میں رومۃ الکبریٰ کے عین اس حالت نزع میں قرآن نے پیشین گوئی کی کہ رومی نو سال کے اندر غالب ہو جائیں گے۔ گبن لکھتا ہے۔

> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی، اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔"

یہ ۵ بعثت کا واقعہ ہے، مکہ کے کفار ایرانیوں کی اس عظیم الشان فتح اور رومیوں کی اس ذلت انگیز شکست پر مسرت کے شادیانے بجا رہے تھے! اور ایرانیوں کی فتح کو اپنے دوستوں کی فتح اور اپنے لئے فال نیک سمجھتے تھے، کیونکہ ان دونوں قوموں میں شرک کا رشتہ تھا۔ جب سورۂ روم کی یہ ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اور کفار مکہ کو اسکا علم ہوا تو انھوں نے اسکو بالکل مستبعد واقعہ سمجھکر مسلمانوں کے ساتھ شرط کی کہ اگر رومی واقعی غالب آ گئے تو وہ مسلمانوں کو کئی اونٹ دیں گے اور اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوا تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو شرط میں شریک تھے اسکے لئے ۵ سال کی مدت مقرر کی۔ آنحضرتؐ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ "بضع" کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے

اسلئے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہئے۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ۹ سال کی شرط کی۔[1]

پیشین گوئی کا ظہور ان دقتوں اور مصیبتوں میں گھر کر (جنکا ذکر اوپر آ چکا ہے) ہرقل نے ارادہ کیا کہ قسطنطنیہ کو چھوڑ کر کارتھیج کے محفوظ مقام میں منتقل ہو جائے۔ اور اسکو اپنا مرکز بنائے۔ اسکے جہاز شاہی محل کی دولتوں اور جواہرات سے لدے ہوئے روانہ ہونیکے لئے تیار کھڑے تھے کہ اسکو بطریق نے لڑنے پر مجبور کیا اور بہت ولائی وہ سینٹ صوفیا میں آیا اور اسنے قسم کھائی کہ اسکی زندگی اور موت انھیں لوگوں کے ساتھ ہے جنکو خدا نے اسکے سپرد کیا ہے۔

رومی شہنشاہ کی مغلوبیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسنے ایک ایرانی قائد اور چند ذمہ دار رومی عہدہ داروں کے ذریعہ شاہ ایران کی خدمت میں عفو و امن کا پیغام بھیجا۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ کوئی سفارت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ خود ہرقل ہے جو پابجولاں میرے تخت کے سامنے حاضر ہوا ہے میں اسوقت تک رومی شہنشاہ کو امن نہیں دیگا جبتک وہ اپنے "مصلوب خدا" کو چھوڑ کر سورج کی پرستش اختیار نہ کرے۔

لیکن چھ سال کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسنے قسطنطنیہ کی فتح سے ہاتھ اٹھالیا اور ان شرائط پر رومیوں کو امان دی کہ ہر سال ایک ہزار سونے کے ٹالنٹ ایک ہزار چاندی کے ایک ہزار ریشمی حلے، ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار دوشیزہ عورتیں شاہ ایران کو خراج کے طور پر بھیجیں یہ شرائط رومیوں میں اشتعال انگیزی اور غیرت وحمیت پیدا کرنے کیلئے ہرقل کو بہت مفید ثابت ہوئے۔ ہرقل نے ایک مذہبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ جنگی مصارف کیلئے اپنے کلیساؤں کی موقوفہ جائدادوں اور آمدنیوں سے اس شرط پر قرض لیا کہ وہ مع سود کے یہ سب رقم واپس کر دیگا۔

ہرقل میں تبدیلی ہرقل کی افسردہ طبیعت، پست عزائم، اور مردہ جسم میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی، اور اسکی زندگی سراسر تبدیل ہو گئی، اب وہ سست اور عیاش بادشاہ نہ تھا بلکہ جراءت

[1] ترمذی کتاب التفسیر

بیدار مغز، بلند حوصلہ فاتح اور پرجوش سپہ سالار تھا، جو اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر لے اور اپنی مُردہ قوم کو زندہ کرنے کیلئے بیچین تھا۔ مؤرخ گبن لکھتا ہے۔

"جس طرح صبح و شام کا کہرا آفتاب نصف النہار کی روشنی سے پھٹ جاتا ہے دفعتًا محلوں کا ارکاڈیوس میدان کا ہیرو بنگیا، ہرقل اور روم کی عزت نہایت شاندار طریقہ سے بچا لیگئی۔"

ہرقل کی فوجکشی اور فتوحات ہرقل نے ایشیاء کوچک کے مغربی اور جنوبی ساحل کو اپنے بائیں طرف چھوڑتے ہوئے خلیج اسکندرونہ میں اپنی فوجیں اُتاریں، بحری شہروں کے قلعوں کی مرمت کی، نئے رنگروٹوں کی فوجی تربیت کی، حضرت مسیح کی معجزانہ شبیہ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اُسنے رومیوں سے آتش پرستوں سے انتقام لینے کی اپیل کی اور ایک پُر زور ولولہ انگیز تقریر کرکے انتقام و عداوت کی روح پھونکدی، سلیشیا فتح کرنیکے بعد ہرقل نے کپےڈوشیا کا رُخ کیا۔ بحر اسود اور آرمینیا کے پہاڑوں کو عبور کرکے ہرقل ایران کے قلب میں گھس گیا، پانچ ہزار منتخب سپاہیوں کے ساتھ قسطنطنیہ سے چلکر طرابزون پہونچا، شہر طورس اور گندزا کا اور موگان کے علاقے فتح کر لئے عیسائیوں نے ماگی کے معبد ڈھادیے، خسرو کی مورتیں حوالۂ آتش کی گئیں، "مدفن مسیح" کے مقابلہ میں زراشتر کا مولد بیحرمت کیا گیا، پچاس ہزار عیسائی قیدی چھڑائے گئے، ہرقل میں داخل ہوا پھر قزوین اور اصفہان کے شہروں تک آیا، ایرانی سلطنت خطرہ میں پڑگئی، ایرانی فوجیں وادی نیل اور باسفورس سے طلب کیگئیں، ہرقل نے اس لشکر جرار کو بھی شکست دی۔ کردستان کے پہاڑوں کو طے کرنیکے بعد اسنے دجلہ کو عبور کیا، اور ایک خونیں جنگ کے بعد ساباط میں آیا، نینوا کے میدان میں فیصلہ کن جنگ ہوئی جسکے بعد وہ دستجرد میں داخل ہوا، اور مدائن سے چند میل کے فاصلہ پر پہونچکر وہ فاتحانہ قسطنطنیہ واپس ہوا۔

پیشین گوئی کی تکمیل ایرانی سلطنت زیر و زبر ہوگئی، رومیوں نے اپنے قدیم تاریخی حدود سے بھی آگے بڑھکر ایرانیوں کو پامال کردیا، اور سلطنت ایران کے قلب میں رومی جھنڈا نصب کردیا، اور اسطرح ۶۲۵ء میں یعنی ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر کے موقع پر ٹھیک نو برس کے اندر قرآن مجید کی عظیم الشان پیشین گوئی پوری ہوئی جسکی تکمیل کے کوئی ظاہری آثار و قرائن نہ تھے۔

ہرقل کی دوبارہ افسردگی یورپ کے مؤرخ او مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ ہرقل کا بہترین اور سب سے زیادہ شاندار دور وہی ہے جسمیں اُسنے ایرانیوں سے مقابلہ کیا اور روما کی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لی، ہرقل کے ابتدائی اور آخری دور کو اس درمیانی دور سے کچھ مناسبت نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ قدرت نے اسکو صرف اسی ایک کام کے لئے زندہ اور بیدار کیا تھا، اس مہم کی تکمیل کے بعد پھر وہ پہلے کی طرح عیاشی اور سست مزاج بنگیا، گبن کے بقول اُسنے وہ صوبے جو بڑی قربانیوں اور خونریزیوں سے ایرانیوں کے ہاتھوں سے واپس لئے تھے اپنی آنکھوں کے سامنے عربوں کے حوالے کردیے۔

مؤرخ حیران ہیں کہ اس عجیب و غریب تبدیلی اور درمیان کی بیداری اور اہلیت اور آغاز و اختتام کی اس غفلت و نااہلیت کی کیا تاویل کریں۔ انھوں نے واقعات کے اس عدم تناسب اور مختلف دوروں کے اس عجیب تعارض کی مختلف تاویلیں کرنیکی کوشش کی ہو، گبن لکھتا ہے۔

"یہ بازنطینی مؤرخوں کا فرض تھا کہ ہرقل کی اس نیند اور بیداری کے اسباب بیان کریں اتنے زمانے کے فاصلے سے ہم صرف یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ اسکو شخصی جرأت کا حصہ سیاسی عزم سے زیادہ ملا تھا، اور یہ کہ وہ اپنی بھتیجی مارٹینا کے فسوں انگیز جمال سے مسحور ہورہا تھا جس سے اُسنے ناجائز طور پر شادی کرلی تھی اور یہ کہ اُسنے اپنے مشیروں کے اس احمقانہ مشورہ پر عمل کیا تھا کہ ایک بادشاہ کی زندگی میدان جنگ میں صرف نہیں ہونی چاہئے، غالبًا وہ ایرانی فاتح کے اہانت آمیز مطالبات سے مشتعل ہوگیا تھا"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"ہرقل کا کیرکٹر ایک عجیب و غریب پہیلی ہے جس کا بوجھنا آسان نہیں، شخصی طور پر بہادر، سیاسی حیثیت سے تجربہ کار، اور لائق سپہ سالار ہونیکے باوجود وہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھتا رہا، اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں اسکی حیثیتیں اور قابلیتیں نہ صرف ایک دوسرے کے مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہیں، لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسکی خانگی زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہیں، ممکن ہے کہ اس تضاد کا کوئی اور حقیقی سبب ہو، اگرچہ اسکے عمل کے لئے وہ صحیح عذر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسکی شہرت کی بقا کے لئے یہ بہتر ہوتا کہ وہ ایرانی مقابلہ کے فوراً بعد مرجاتا۔" (ان۔ ج۔ ۱۱ ص ۴۰۲ اشاعت نہم)

ان تمام بیانات میں یورپین مورخین نے صاف طور پر تسلیم کیا ہے کہ ایرانی مقابلہ کے وقت ہرقل میں عارضی طور پر عجیب و غریب انقلاب ہوگیا تھا اور ایسی روح پیدا ہوگئی تھی جو اسکے بعد باقی نہیں رہی، اور جو کچھ اسنے ایرانیوں سے حاصل کیا تھا اپنی غفلت اور کاہلی سے عربوں کے ہاتھ کھو دیا، اس آخری چیز کی ہمارے نزدیک کوئی مسلم حیثیت نہیں۔ ہمیں اسمیں کلام ہے کہ ہرقل نے اسلامی حملوں کا پورے طور پر مقابلہ نہیں کیا اور رومیوں کی شکست میں اسلام کی طاقت اور مسلمانوں کے کیرکٹر سے زیادہ ہرقل کی غفلت و نااہلی یا رومی سلطنت کے ضعف کو دخل تھا۔ لیکن اس حصہ پر بحث کرنا اسوقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

میری محسن کتابیں

مولانا بدرالدین صاحب علوی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

میری والدہ مرحومہ ایک زندہ دل اہل علم والی خاتون تھیں اللہ تعالیٰ نے تربیت کا سلیقہ ان کو ایسا عطا فرمایا تھا کہ بایدوشاید۔ والد مرحوم کو تربیت اور تعلیم سے بچوں کے بڑے ہونے تک بہت کم سروکار نہ تھا تمام امور کی ذمہ داری والدہ مرحومہ پر تھی۔ مروجہ طریقہ پر ابتداً مجھے کلام اللہ پڑھایا گیا پھر مولوی اسمعیل میرٹھی کی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سیرت نبوی اور تاریخ عرب سے دلچسپی والدہ مرحومہ پیدا کر چکی تھیں۔ وہ پڑھنے کی لیاقت آتے ہی سیرت کی ایک بڑی ضخیم کتاب شمس التواریخ ہاتھ لگی ایک کتب فروش اتفاق سے دروازہ پر یہ کتاب لیکر آیا والدہ مرحومہ نے میری طبیعت کی مناسبت سے خرید لی اور مجھے دی جب وہ جلد بندھنے کیلئے گئی تو مجھے خوب یاد ہے کہ کس بے چینی کے ساتھ میں اس کی واپسی کا منتظر رہا میرے ایک ہمسن چچازاد بھائی ان دنوں آئے ہوئے تھے تقاضے کے لئے بار بار وہ جلد ساز کے پاس بھیجے جاتے جب وہ آگئی تو میں تھا اور وہ۔ قرآن مجید کے دو دو ورق کے بعد سارا وقت شمس التواریخ کے پڑھنے میں گذرتا اس وقت نو دس سال سے زیادہ عمر نہ تھی بیسوں باتیں سمجھ میں نہ آتیں لیکن کتاب کو نہ چھوڑتا بالآخر اس کو ختم کر ڈالا اب والدہ مرحومہ کو سنانے کی ٹھہری۔ بغرض کسی نہ کسی بہانے سے اس کے ساتھ مشغولیت اسکی محبت کا تقاضا تھی برادر موصوف نے جو ایک معزز عہدہ پر فائز ہوکر اب رحلت کر چکے ہیں میرا شغف دیکھکر یہ معمول قرار دے لیا تھا کہ ہر خط میں عزیزوں کے ساتھ شمس التواریخ کو بھی سلام لکھتے۔ اس زمانہ میں امرتسر سے اخبار وکیل نکلتا تھا والد مرحوم نے اس کو میرے نام پر جاری کرا لیا تھا۔ اس میں بلاد اسلامیہ کی خبروں سے خاص ذوق تھا۔ ایک پرچہ میں شمس التواریخ کے حصہ دوم کا اشتہار نظر پڑا عرض کرتے ہی کتاب منگوا دی گئی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں تھی اور حصہ اول کی ایک تہائی ضخامت رہی ہوگی چند دنوں میں پڑھ لی اب کچھ لکھنے کا شوق بھی پیدا ہو چکا تھا لاوت

اور دور کے لئے جو نسخہ قرآن مجید کا میں نے خود پسند کر کے منگوایا تھا اس میں شاہ عبد القادر صاحبؒ کا ترجمہ اور ابن عباسؓ کی تفسیر کا ترجمہ حاشیہ پر چھپا ہوا تھا۔ پہلا شوق اس تفسیر کو بصورت کتاب علیحدہ نقل کر لینے کا ہوا چنانچہ کچھ لکھ ڈالا پھر شمس التواریخ سے انتخاب کر کے ایک تاریخ عرب لکھنی شروع کی۔ شمس التواریخ حصہ دوم کے ساتھ مولوی عبد الرحمٰن امرتسری کا سفرنامہ بلاد اسلامیہ بھی آیا تھا اس میں قسطنطنیہ کا ذکر بڑی دلچسپی سے پڑھا اسی سے مولنا شبلی نعمانی کے سفرنامہ کا شوق ہوا وہ منگوا دیا گیا۔ بہت دلچسپ معلوم ہوا اُسی زمانہ میں مجھکو فارسی اور انگریزی پڑھائی جارہی تھی پڑھانے کا ذوق بھی اُسی وقت سے ہے جو لڑکے ساتھ کھیلنے کو آتے انکو نیچی جگہ بٹھا کر خود اونچی جگہ بیٹھتا اور جو خود پڑھا ہوتا وہ انکو پڑھاتا۔ انہیں دنوں ایک ملازم نے مجھسے تواریخ حبیب الہ پڑھی والدہ مرحومہ نے جو فارسی اور اس کے متعلقہ مضامین کی کتابیں ناناصاحب مرحوم سے پڑھی تھیں ان میں قواعد کی ایک کتاب اصول عجیبہ تھی۔ یہ کتاب مجھے نہیں پڑھائی گئی تھی مگر میں نے جب اس کو دیکھا تو بہت پسند آئی اور اپنے چھوٹے بھائی مرحوم کو وہ پڑھا کر اپنے نہ پڑھنے کی تلافی کرلی۔ فارسی کے بعد عربی شروع کرائی گئی اور الندوہ اور البیان (عربی اردو کا رسالہ) میرے نام پر جاری ہوئے اسی دوران میں مولنا شبلی نعمانی کی دیگر تصانیف بھی دلچسپی سے پڑھیں شمس التواریخ حصہ سوم کا چھپنا شروع ہوا اور ماہ بماہ جس قدر چھپ جاتا آتا رہتا تا آنکہ کئی سال میں تکمیل کو پہونچکر پوری کتاب حاصل ہوئی پھر حصہ چہارم بھی مطبع پر حاصل کیا گیا مگر افسوس ہے کہ پہلا حصہ جو ایک زمانہ میں میرے لئے عزیز ترین تھا ضائع ہوگیا ایک مہربان مستعار لے گئے پھر واپس نہ دیا۔

عربی کی تعلیم شروع کرتے ہی عربی کے جملے بنانے کا شوق غالب ہوا۔ پڑھانے والے صاحب اگرگریز بھی کرتے تو میں نہ چھوڑتا عربی کی مشق کے لئے ارشاد الطلب زیر استعمال رہتا۔ مولوی امجد علی صاحب بہاری کا الانتخاب الجدید بھی اُسی زمانہ میں ابتدائی مراحل کے لئے بہت نافع ہوا۔ اب بھی میں مبتدیوں کے لئے اس کو تجویز کیا کرتا ہوں۔ عربی بول چال مصنفہ عبد الرحمٰن امرتسری سے کچھ دنوں خود والد مرحوم نے مشق کرائی مگر یہ مشق کچھ

زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ درس عربی کے متوسطات میں مشغول تھا۔ استاذ العلماء کی خدمت میں باریابی ہوئی سب سے پہلی کتاب جو شروع کی میبذی تھی۔ اس ذات بابرکات کی کفش برداری کا یہ فیض ہوا کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی الفیض بخش اور محسن تھی۔ درس نظامی کی کتابوں کے نام گنوانا بیکار ہے۔ سب ایک ایک کرکے پڑھیں اور سب نے ایسا رنگ جمایا کہ کوئی دوسرا ذکر اچھا نہ لگتا۔ درس نظامی کے ساتھ ساتھ ادب کی کتابیں پڑھنا اور عربی تحریر کی مشق برابر جاری رہی اور بعض رسائل بھی عربی میں تالیف کئے۔

انگریزی تعلیم کا سلسلہ عربی کے ساتھ کچھ عرصہ تک چلتا رہا۔ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کا انٹرنس کا امتحان دیا۔ کامیابی پر کالج میں داخلہ کا خیال تھا مگر خدا کو منظور تو کچھ اور ہی تھا۔ ناکام رہا اور انگریزی یک لخت چھوٹ گئی۔ تمام وقت عربی پر صرف ہونے لگا بجز اس کے کہ کبھی کبھی والد مرحوم انگریزی املا کرا دیا کرتے۔ بس دو کام تھے پڑھنا اور پڑھانا۔ اپنی پڑھنے سے فراغت پائی تو صرف پڑھانا رہ گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انٹرمیڈیٹ کالج میں عربی کا معلم مقرر ہوا اور چھوٹی ہوئی انگریزی سے پھر سابقہ پڑا۔ پہلے سال کورس کو اردو ترجمہ سے پڑھایا۔ لڑکوں نے انگریزی میں ترجمہ کی خواہش کی۔ اس سلسلہ سے انگریزی زبان اور گرامر کا مطالعہ ناگزیر ہوا اور دوسرے سال ہی سے بذریعہ زبان انگریزی تعلیم دینا شروع کر دیا۔ انگریزی میں نکلسن کی لٹریری ہسٹری، چارلس لائل کی عربین پوئٹری اور مقدمہ مفضلیات، کلاوسٹن کی عربین پوئٹری اور ہوارٹ کی عرب لٹریچر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن سے فائدہ اٹھایا۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ عربی تحریر کا سلسلہ ہمیشہ جاری تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج کے زمانہ میں عربی کے مضامین مصر و شام کے رسائل میں نکلا کئے۔ ذوق تحریر و تالیف نے ابن درید اور بشار پر کام کرنے کے لئے مستعد کر دیا۔ ان کاموں کا ایک حصہ (یعنی شرح المختار) مصر سے شائع ہوا۔ ان کاموں کے سلسلہ سے عربی لٹریچر کی تمام کتابیں جو دستیاب ہوئیں چھان ماریں۔ میرے کرم دوست مولانا عبد العزیز میمن کا چھوٹا کتب خانہ گرانقدر کا مجموعہ ان کی عنایت سے استعمال میں رہا اور ہر کتاب محسن بنی۔ ان کتابوں کی فہرست جزءاً شرح المختار میں شائع ہو چکی ہے۔ محسن کتابوں کی فہرست میں تفسیر خازن، حاشیہ جمل، حدیث میں فتح الباری و عمدۃ القاری، اللمعات، مرقاۃ المفاتیح، رجال میں تہذیب التہذیب، فقہ میں فتح القدیر، عینی، عنایہ، لغت میں قاموس، نظم میں مشاہیر شعراء کے دواوین، نثر میں قالی کی امالی اور الکامل، متعلقات تصوف میں اخبار الاخیار اور اصول المقصود وغیرہا کا نام خصوصیت سے لینا ضروری ہے

شیراز ہندپورب

از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

۶۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی۔ دنیا بادشاہان اسلام کی اس علمی قدردانی کو یاد رکھے تو اچھا ہے کہ ملک العلماء جب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی اونکی عیادت کو آیا۔ مزاج پرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لیکر مولانا کے سر پر پھرا کر یہ دعا مانگی کہ خداوندا یہ بلاان سے دور کرکے اس کے بدلہ میں میری جان صدقہ میں قبول فرما۔ آخر دونوں آگے پیچھے ۸۴۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

۷۔ ملا شیخ عبد الملک عادل فاروقی بن نواب عماد الملک وزیر سلطنت شرقی۔ شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی ۹۰۷ھ۔

۸۔ ملا علاء الدین عطا الملک برادر شیخ عبد الملک شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی قاضی صاحب نے اپنی فارسی شرح کافیہ میں اپنے اس شاگرد کا ذکر کیا ہے۔ کہ اوسی کے پاس خاطر سے لکھی گئی۔

۹۔ شاہ ابو الفتح جونپوری نبیرہ قاضی عبد المقتدر دہلوی المتوفی ۸۵۰ھ

۱۰۔ شیخ محمد عیسیٰ جونپوری شاگرد قاضی دولت آبادی۔

۱۱۔ قاضی سماء الدین قتلغ خاں وزیر سلطان شرقی المتوفی ۸۰۳ھ

یہی وہ زمانہ ہے جب ظفر آباد اور جونپور کے بعد فیض آباد کے اطراف اور لکھنؤ میں علماء اور مشائخ دینی درگاہیں اور خانقاہیں۔ اور شرفا اپنے گھرانے آباد کر رہے تھے چنانچہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ فراز کندوری المتوفی ۸۲۹ھ شیخ قوام الدین المتوفی ۸۴۰ھ شیخ سارنگ المتوفی ۸۴۲ھ شیخ محمد اعظم لکھنوی۔ شیخ سعد الدین لکھنوی المتوفی ۸۵۱ھ شیخ ضیا لکھنوی۔ شاہ ضیا المتوفی ۸۴۲ھ خیر آباد میں شیخ سعد الدین المتوفی ۸۵۳ھ۔ رودولی میں مخدوم احمد عبد الحق المتوفی ۸۳۷ھ شیخ امین الدین المتوفی ۸۳۶ھ شیخ

صفی الدین اونکے بھائی قاضی رضی الدین اور بیٹے شیخ ابوالمکارم اسماعیل المتوفی سنہ ۸۰۶ھ کچھوچھہ (فیض آباد) میں مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی سنہ ۸۰۸ھ ، ردولی میں شیخ محمد مخدوم آکش المتوفی سنہ ۸۱۶ھ اور اودھیا میں شیخ سراج الدین چشتی المتوفی سنہ ۸۹۹ھ تعلیم وارشاد کی مسندوں پر جلوہ آرا تھے۔

مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے مکتوبات میں ایک خط قاضی شہاب دولت آبادی کے نام ملتا ہے جسمیں سلطان ابراہیم شرقی سے کسی سفارش خیر کا تذکرہ ہے[1]۔ شیخ سعدالدین لکھنوی اور سلطان شرقی کے وزیر سماء الدین قتلغ خاں کے درمیان دوستی کے تعلقات مستحکم تھے۔ شیخ کے صاحبزادہ شیخ امین الدین لکھنوی کے مکتوبات[2] میں ایک خط وزیر موصوف کے نام موجود ہے جس میں شیخ سعدالدین لکھنوی کی وفات کا پورا حال ہے سماء الدین قتلغ خاں گو وزیر تھے مگر اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں تھے۔

لودیوں کا زمانہ اگرچہ سلطان حسین شرقی کی نالائقی اور غرور ونخوت سے سنہ ۸۸۳ھ میں سلطان بہلول لودی کے ہاتھ سے شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت لودیوں[3] کا جو خاندان دلی کے تخت پر فرمانروا تھا وہ علم وفن اور فضل وکمال کا پورا قدر شناس تھا، ان کے زمانہ میں شرقیوں نے علم وتہذیب وتمدن کے جو پودے لگائے تھے۔ وہ لودیوں کے عہد میں پوری طرح بار آور ہوئے۔

غازی پور میں پھول اور پھل لگائے گئے، سکندرپور (بلیا) سلطان سکندر لودی کی آبیاری سے

---

[1] اخبار الاخیار ص۱۵۷ [2] نسخہ دار المصنفین۔

[3] لودی پٹھانوں کی سلطنت سنہ ۸۵۵ھ سے سنہ ۹۳۲ھ تک دلی میں قائم رہی۔ سنہ ۹۳۲ھ میں بابر نے آکر لودیوں کا خاتمہ کیا۔ اور تیموری سلطنت کی بنیاد کھڑی کی۔ لودی سلطانوں کے نام اور زمانے یہ ہیں۔

۱۔ سلطان بہلول لودی	سنہ ۸۵۵ھ	سنہ ۸۹۴ھ
۲۔ سلطان سکندر لودی	سنہ ۸۹۴ھ	سنہ ۹۲۳ھ
۳۔ سلطان ابراہیم لودی	سنہ ۹۲۳ھ	سنہ ۹۳۲ھ

گلابوں کا تختہ بن گیا جونپور ان پھولوں کے تیلوں اور عطروں سے مشام جان کو معطر کرنے لگا یہی عطر بیزی علمی میدانوں میں بھی ہوئی یعنی علم وفن کے گلستانوں میں نئے سرے سے بہار آئی تیموری باد صرصر نے جن پودوں کو بالکل مرجھا دیا تھا۔ ان میں دوبارہ جان پڑی۔ اور دلی سے لیکر جونپور تک علم کے قافلے پھر آنے جانے لگے ہندوستان میں فارسی تعلیم کا رواج اسی زمانہ سے شروع ہوا۔

لودیوں کے خاندان میں سکندر لودی کا زمانہ سب سے بہتر تھا۔ اس نے اطراف و دیار سے علماء کو جمع کیا۔ اور نئے سرے سے علم کو فروغ دیا۔ خود شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا۔ اس کے عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی ہیں جنھوں نے ملکوں کی سیاحت کی تھی۔ اور ملا جامی کی صحبت سے جام فیض پیا تھا۔ اسی زمانہ میں دو بھائی ملتان سے ادھر آنکلے۔ شیخ عبداللہ تلنبی[1]۔ اور شیخ عزیز اللہ تلنبی۔ پہلے نے دلی کو اور دوسرے نے سنبھل (مراد آباد) کو اپنا مرکز بنایا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں۔

واز جملہ علما یکبار در زمان سلطان سکندر شیخ عبداللہ تلنبی در دہلی و شیخ عزیز اللہ تلنبی در سنبھل بودند۔ وایں ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان بہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند۔ قبل ازیں غیر از شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہندشائع نبود[2]

ملا بدایونی اپنے بزرگوں سے سنکر کہتے ہیں۔ کہ ایک شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے میاں دون جمال خاں دہلوی میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدایونی وغیرہ جیسے چالیس علماء متبحر پڑھ کر نکلے[3]۔ سلطان لودی خود درس میں شریک ہوتا۔ اور اس خیال سے کہ سلسلۂ درس میں شاہی آداب و تکلفات سے خلل نہ پڑے چپکے پائیں میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ اور آخر میں سلام مسنون کرکے رخصت ہو جاتا تھا[4]۔

شیخ عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی۔

---

[1] تلنبہ ہندوستان میں ایک گاؤں تھا۔ [2] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی

[3] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [4] ایضاً

پورب میں ان دونوں عزیزوں کی درسگاہ سے دو کامل نکلے ایک میاں حاتم سنبھلی المتوفی ۹۶۸ھ اور دوسرے ملا اللہ داد جونپوری المتوفی ۹۶۲ھ پہلے کی نسبت ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ انھوں نے عمر میں تیس دفعہ سے زیادہ مفتاح کا اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا۔ اور دوسرے کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے فقہ میں ہدایہ کی نحو میں کافیہ کی شرحیں اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا۔

مولانا الہ داد جونپوری اس عہد میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو شرقیوں کے زمانہ میں قاضی دولت آبادی کی تھی۔ پورب مولانا الہ داد کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں سے معمور ہو رہا تھا جونپور کے محلہ رضوی خاں میں مولانا کی درسگاہ تھی۔ مگر اب نشان تک نہیں ۹۲۳ھ میں وفات پائی۔ انکے صاحبزادے شیخ بھکاری جونپوری تھے سلطان سکندر کا عہد پایا تھا۔

سکندر لودی کے زمانہ میں ایک اور شخص طریقت کا وارد ہندوستان میں ہوا۔ یہ رفیع الدین محدث شیرازی ہیں۔ یہ معقولات میں محقق جلال الدین دوانی کے اور حدیث میں حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد تھے۔ ۹۵۴ھ میں وفات پائی۔ انکی ذات معقول و منقول دونوں کا مرجع البحرین تھی۔

ان بزرگوں کے علاوہ پورب کی زمین اس زمانہ میں حسب ذیل اکابر کے وجود سے فیضیاب تھی۔

۱۔ شیخ معروف چشتی جونپوری۔ مرید مولانا الہ داد جونپوری

۲۔ شیخ دانیال جونپوری۔ استاد سید محمد جونپوری

۳۔ شاہ نصن غازیپوری۔ میر عدل غازیپور المتوفی ۹۰۵ھ

۴۔ سید محمد جونپوری المتوفی ۹۱۰ھ

۵۔ شیخ حسن بن طاہر بہاری جونپوری المتوفی ۹۰۹ھ دہلی میں مزار ہے

۶۔ شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جونپوری المتوفی ۹۴۴ھ دہلی میں دفن ہوئے

۷۔ قاضی صلاح الدین خلیل جونپوری نبیرہ قاضی نظام الدین کیکلانی۔

تیموریوں کا زمانہ

سنہ ۹۲۳ھ سے تیموری سلاطین کا دور شروع ہوا علم و فن نے ملک میں وسعت پائی۔ سلاطین و امرا کی قدر دانیوں نے ہر جگہ علم کے بازار کو رونق پر رونق دی! عہد میں سید عبدالاوّل جونپوری ذکر کے قابل ہیں جو شاید ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی قاضی صلاح الدین مخلّص کے شاگرد تھے۔ اور غالباً حدیث کا فیض گجرات اور عرب کے سفر سے لائے بیرم خانخاناں کی دعوت پر دہلی آئے۔ اور آخر وہیں کی خاک انکی ابدی خوابگاہ ہوئی سنہ ۹۶۸ھ وفات کی تاریخ ہے[1]۔

دوسرے بزرگ ملا یوسف مشہور بہ قاضی خاں ظفرآبادی ہیں۔ شیخ حسن بن طاہر سے فیض علم پایا ہمایوں نے ہر چند چاہا کہ وہ اسکی نذر قبول فرمائیں۔ مگر دست قناعت شرمندۂ احسان نہ ہوسکا۔ سنہ ۹۷۰ھ وفات کی تاریخ ہے۔

تیموری عہد کا شباب شاہجہاں کا زمانہ ہے۔ پورب کی سرزمین اوس زمانہ میں علم و فن کے ستارونکی کثرت سے آسمان بنی ہوئی تھی! ان ستاروں میں آفتاب کی حیثیت اوستاد الملک ملا محمد افضل جونپوری کو حاصل تھی۔ ان کے پدر بزرگوار ماژندر سے چل کر ہندوستان آئے۔ اور ہندوستان میں بھی یہ سعادت خطۂ پورب کو حاصل ہوئی۔ وہ ردولی میں مفتی مقرر ہوئے سنہ ۹۸۰ھ میں یہیں ملا محمد افضل کی پیدائش ہوئی اپنے والد ماجد سے ابتدائی کتابیں پڑھکر پچھم کا رخ کیا۔ دہلی پہونچکر ملا شیخ حسین شاکر۔ ملا طاہر لاہوری سے فن کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کا درس ملا ابو حنیفہ شاگرد مخدوم الملک و حکیم ابو گیلانی سے لیا علوم و فنون کی تکمیل کے بعد جونپور کو اپنے فیض و برکات کا مرکز بنایا۔ اس درسگاہ کے فیض نے جونپور کو دارالعلم بنا دیا۔ اور شاہجہاں کی زبان سے وہ فقرہ کہلوا دیا جو ابد تک یادگار رہیگا۔

"پورب شیراز ما"

---

[1] تجلی نور صـ ۲۳

اس مطلع سے جو علمائے وقت چمکے ان میں دو آفتاب و ماہتاب ایسے ہیں جن کے علم کی روشنی کبھی ماند نہ ہوگی، ایک دیوان عبدالرشید المتوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ۔ اساتذہ اکثر کہا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علماء ایک وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے[1]۔ دیوان عبدالرشید وہ ہیں جنھوں نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصاب درس میں داخل ہے۔ شاہجہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانۂ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ملا محمود نے دنیا کو فلسفہ میں شمس بازغہ اور بلاغت میں فرائد جیسی کتابیں دیں۔ پہلے شاہجہاں کے دربار میں تھے پھر ایک درویش (ملا میر لاہوری) کا طعنہ سنکر جونپور میں درسگاہ جاکر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے۔

استاد الملک کے دوسرے شاگرد ملا ضیاء الدین محدث شیخ خیدن محدث اور ملا شیخ احمد زین الزاہد المتوفی ۹۶۳ھ ہیں۔ استاد الملک کی نسبی نسل آگے نہیں چلی، البتہ انکے بھائی شیخ محمود، ان کے بیٹے شیخ حامد، انکے بیٹے ملا محمد یوسف انکے پوتے شیخ احمد اور انکے بیٹے قاضی سلطان قلی خاں قاضی کوڑہ جہان آباد وغیرہ ایک دوسرے کے بعد دیئے سے دیا جلاتے رہے۔

عہد شاہجہانی و عالمگیری میں قاضی محمد حسین جونپوری (جو فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں سے ایک تھے) ملا محمود ثانی جونپوری شاگرد دانشمند خاں شیخ محمد ماہ جونپوری شیخ شمس الدین جونپوری، ملا نور الدین جونپوری اور آخری دور میں ملا بابا اللہ جونپوری، شیخ محمد افضل سید پوری (غازیپوری) الہ آبادی علم و فن کے نامور فرمانروا گذرے۔

عالمگیر کے زمانہ میں سہالی کا آفتاب بلند ہوا یعنی ملا قطب الدین، ملا نظام الدین، ملا کمال الدین اور ان کے اساتذہ اور معاصرین شیخ محب اللہ صدر پوری الہ آبادی، قاضی آصف الہ آبادی، ملا امان اللہ بنارسی، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا محب اللہ بہاری، ملا حمد اللہ سندیلوی وغیرہ ممتاز ہوئے۔ جنکی بدولت اودھ کے حدود سے لیکر بہار کی آخری سرحد تک علم و فن اور فضل و کمال کی بہار پر بہار تھی۔

[1] تجلی نور ص۴۹

یادِ ایام

(۵)

از مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ رجسٹرار امتحانات شرقیہ

یہ زمانہ وہ زمانہ ہو کہ جناب مولٰنا محمد علی صاحب ندوہ سے کنارہ کش بعذرات ہو چکے ہیں اور مونگیر میں گوشہ نشین ہیں مگر کبھی کبھی تشریف لاتے ہیں۔ نظامت اول بدل کر مختلف علماء مثلاً مولانا مسیح الزمان خاں صاحب استاد حضور نظام مرحوم اور مولانا خلیل الرحمٰن بن مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے ہاتھوں میں رہی علامہ ایک مدت ہوئی علی گڈھ سے کنارہ کش ہو چکے ہیں اور حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون کے عہدے پر فائز ہیں اس سلسلہ میں علم الکلام اور الغزالی شایع ہو چکی ہیں۔ بہتوں کا اصرار ہے کہ وہ ندوہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں علماء ایسی مقدس چیز کو اپنے خیال میں انکے ہاتھوں میں دیتے ہچکچاتے ہیں خود علامہ کو بھی خواہش کام کرنے کی ہے حیدر آباد کی فضا راس نہیں آتی ہے آب و ہوا موافق نہیں ہے ابھی حیدر آباد میں قیام ہے ندوہ آنا بڑھ گیا ہے ہم چند طلبہ کو خاص دلچسپی ہے آخر انتظار کے بعد اجراء وظیفہ کے متعلق معروضہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا ہے حکم خداوندی کے منتظر ہیں اس طرف جلسہ انتظامیہ نے معتمد تعلیم کا عہدہ اور دار العلوم انکے سپرد کر ناطے کر لیا اب نظامت کا کام اتنا وسیع ہے کہ تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا نظامت ہمارے مولٰنا حکیم سید عبد الحی صاحب رحمۃ کے سپرد ہوئی کیا نیک ہستی تھی ظاہر و باطن کے شب چراغ خاموش مگر سراپا عمل اردو فارسی عربی کے خاموش شاعر نقاد اور مورخ ان کے گل رعنا نے تو آب حیات کی حیثیت ہی نہیں بگاڑ دی بلکہ اردو ادبیات کی ترقی کا دروازہ کھول دیا عربی خوب لکھتے تھے سلسلہ اور نسبت میں بھی خوب تھے اسپر ساری عمر ندوہ کی خدمت اور تجربہ۔ معتمد مال جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ ہوئے میں نے عمداً برسوں کے ذکر میں تاکہ اپنے خاندان کی بڑائی ہانکنا نہ سمجھا جائے اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا مگر حقیقت حال بتاتے ہوئے یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ وہ خان بہادر منشی اطہر علی صاحب کے شریک کار ندوہ کے ابتدا سے خزانچی اور خاموشی سے مالیہ کے ہر طرح نگراں رہے

جوانی سے لیکر بڑھاپے تک ایک طرح کے شغف کے ساتھ ندوہ کا کام کیا ہر مزاج اور کیش کے معتمد اور ناظم کے ساتھ خوش گذرانی کے ساتھ برتاؤ کیا مقصد خلوص سے ندوہ کی خدمت تھی ترفع یا انفرادیت سے ہمیشہ گریز رہا اور باوجود اپنی معذوریوں کے اس خدمت کیلئے جوانوں کی طرح اب بھی مستعد ہیں! انتخاب کے بعد ندوہ کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے کھانے کے دانت اگرچہ اپنا کام کرتے رہے مگر دکھانے کے دانت بڑھ گئے۔

ہمارے مولٰنا کو جب اس انقلاب کی خبر ہوئی تو وہ اب یہاں ٹھہرتے ہوئے گھبرائے اور آخر کار نئے خیر اندیشوں کے مشورہ سے خدمت سے سبکدوش ہو گئے! استاد شاگرد کی ہتک نہیں کرسکتا علامہ نے جب سنا تو انکو اس کا بیحد قلق ہوا۔ مگر میری رائے میں بہتر ہی ہوا ورنہ نظم تب فتور آتا مجھکو تو یہ معلوم ہوا کہ دل پر ایک چوٹ لگی سارے سہارے ہٹ گئے اب تک تعلیم دیے پراندش تھی کوئی ذوق نہ ہر چیز کا تکملہ کرا رہا تھا مگر اب شوق اور ذاتی بھروسہ زیادہ پیدا ہوگیا تعلیم تو اچھے اساتذہ سے جاری ہے مگر دل کو نہیں بھاتی یہاں آٹھ ورکا سہ انکا پڑا یا طالب علم کس کی مانے کا چونکہ کتب درسیہ کا مطالعہ اگلی تعلیم کی بدولت اب آسان تھا اس میں وقت کم لگتا درجہ میں استاد کی تقریر کافی ہو جاتی اب اپنے ذوق کا مطالعہ شروع ہوا میرے عم زاد بھائی اور بعد کو خسر منشی واحد علی صاحب مرحوم بڑے ذہین اور طباع تھے درسیات تو ختم نہ کئے تھے مگر مطالعہ اور نظر وسیع تھی انھوں نے ایک مدت حیدر آباد میں گذاری تھی اچھی صحبتیں علمی تماشے اور بڑی آنکھیں دیکھیں امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں تھے بسمل تخلص کرتے عجیب باغ و بہار آدمی تھے بیکاری میں بڑا وقت مطالعہ میں صرف کرتے حیدر آباد سے ایک اچھا کتب خانہ ساتھ لائے تھے انکی صحبت میں جی لگتا اور فائدہ بھی ہوتا۔ ان سے لیکر اب وہ کتاب شروع کرتا ہوں جو میرے لئے دوسری مولٰنا فاروق بنی اور میری محسن کتاب ہے وہ مقدمہ ابن خلدون تھا مقدمہ کا مطالعہ بکثرت کرتا اور ایک ایک لفظ اس کا عقیدت مندانہ پڑھتا فلسفہ تاریخ کے مطالعہ کے شوق کا ذکر بعد کو کبھی آجائے گا۔ اگر موقع ہوا مگر اس کتاب نے تاریخ علوم کی طرف رہبری کی اس وقت جو سرمایہ نظر سے گذرا وہ ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں، مدینۃ العلوم اپنی اور کشف الظنون تھیں ہر فن کی تاریخ پر نظر کرنے کا شوق ہوگیا اپنے مذاق کے

موافق جو جو کتابیں کسی سلسلہ کی ملجاتیں ان سے مستفید ہوتا کتب خانوں میں خود ندوہ کا کتب خانہ اپنا اور سب سے بڑھ کر نواب صدیق خاں صاحب مرحوم کا کتب خانہ جو انکے صاحبزادوں کے ساتھ لکھنؤ آگیا تھا بہت کام آئے۔ اسطرح طالب علمی ہی میں علامہ کے ورود مسعود سے پہلے میری نظر کافی وسیع ہو چکی تھی۔ اب سن رشد کو پہونچ چکا تھا میری نقل و حرکت پر وہ تقیدات نہ تھے جو پہلے تھے میرے ایک عزیز بھائی مرحوم وصی حسن صاحب علوی ریڈ کرسچین کالج میں پڑھتے تھے انکی وساطت سے جناب مرزا ہادی صاحب مرزا رسوا سے ملاقات ہو گئی اُن سے کیوں نہ واقف ہوتا انکی سب تصانیف پڑھی تھیں خصوصاً امراؤ جان ادا اس کتاب پر یاد آیا کہ ایک مرتبہ علامہ الاستاد کے سامنے اس کا ذکر آگیا فرمایا بھائی میں نے ناول کبھی نہیں پڑھا لاؤ ذرا دیکھوں تو تعریف بہت سُنی ہے کتاب لاکر دیدی صبح کو جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ آج شب کی نیند گئی اس کمبخت نے سونے نہ دیا جب تک پورا نہ کرالیا۔ اب مرزا صاحب چولا بدل چکے تھے اپنا رنگ چھوڑ کر تائب ہو چکے تھے اب حتی خانم کی قسم نہ تھی مذہبی رنگ تھا علم کلام کا ذوق بڑھا ہوا تھا۔ الحکم رسالہ نکالتے تھے مجھے عقیدت مندی تھی اور ان کو ایک اچھا طالب علم پاکر مجھ سے انس ہو گیا ان کے الحکم میں مضامین لکھتا تھا میرے ان سے علاوہ علمی استفادہ کے یہ بات بھی طے ہو گئی کہ جب میری زبان میں نقص یا تعقید ان کو نظر آئے تو ٹوک دیں کبھی کبھی کوئی نثر لکھکر ان سے اصلاح بھی لے لیتا۔

مرزا صاحب کا کیا کہنا اردو کے مستند امام جدید و قدیم ریاضی کے ماہر فلسفہ سے خاص مناسبت تھی کیننگ کالج کے وائٹ صاحب ان کے گرویدہ تھے۔ فارسی کا مذاق بہت عمدہ، رواں نثر خوب لکھتے اور ستھری فارسی بول لیتے انکی عربیت بھی اچھی خاصی تھی انگریزی میں نام نہاد گریجویٹ تھے بعد کو کسی امریکن یونیورسٹی نے انکو ڈاکٹریٹ بھی عطا کی تھی۔ ان سے شرح چغمینی علمی طور پر پڑھی مگر اصلی چاٹ اُن سے جدید فلسفہ حاصل کرنے کی تھی۔ کچھ انگریزی تو ندوہ میں اور اپنے گھر کی فضا میں ہو گئی تھی مگر ان سے انگریزی میں فلسفہ کے ابتدائی چند رسالے پڑھے اور اصطلاحات گڑھنے کا قدرتاً موقع ہاتھ لگا مجھکو مفرس اور معرب الفاظ ہمیشہ ناپسند تھے کیونکہ عربی میں بعض رسائل جو سائنس کے پڑھے تھے اس میں عبارت کی تعقید اور بھونڈا پن ناگوار گزرا تھا مرزا صاحب نے میری خاطر سے

فارسی میں نفسیات پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا اِس فن سے دلچسپی زیادہ ہوگئی تھی جب علی گڈھ پہونچا تو وہاں ڈیوڈ مکڈوگل آنجہانی جو پروفیسر اسٹاوٹ کے شاگرد رشید اور بقول سیڈ زلبشن تجربی نفسیات کے اکیلے ماہر ہندوستان میں تھے ان سے برابر استفادہ کرتا رہا۔ ہمارے مولنا سیکالوجی خفا نہ ہوں اِیتوں اس کو ایک سہل فن سمجھتا ہوں مگر شاید سی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ میرے صوبے کے مدارس میں یہ جدید فن عربی میں پڑھایا جاتا ہے اور علما اِس کا لطف اٹھانے میں بعضوں نے تو یہ کہا کہ علم کی بحث پہلے یہاں جو ناقص تھی اس کو پڑھ کر اب سمجھ میں آئی۔

مرزا صاحب کے شعر و سخن اپنے مذاق شاعری ختم ہو گیا مرزا اوج مرحوم کے شاگرد تھے دبیر کے تھے مگر اس کے ساتھ انصاف پسندی میں کبھی کمی نہ کی۔ ان کے ساتھ لکھنؤ کی اونچی و نیچی صحبتوں اور مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا ہے متعلق مرزا صاحب ہمیشہ یہ فرمادیتے کہ یہ طالب علم ہیں اسی زمانہ میں عزیز لکھنوی سے اکثر ملاقات رہتی ان کا عنفوان تھا مگر سب سے زیادہ مرحوم ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ کا ساتھ رہا کیا زندہ دل بیدار مغز انسان تھا۔ اِس مرزا صاحب کے نادل ذات شریف کے پسر نواب حسین مرزا محسن الدولہ کے پوتے بھی حاضر باشوں میں تھے، اب یہاں کیا تھا بجز جنی خانم کے مگر اسکی بھی جسکی ان کو غنیمت تھی، مرزا صاحب کو مذہبی دیکھکر حیرت ہوتی مغرب میں اکثر میرے سامنے ادا ہوتیں بڑا خضوع خشوع تھا جو امامت سے غالباً خالی نہ تھا۔ چونکہ ان کو اپنے مذاق کے مطابق علم کلام سے زیادہ شوق تھا اس لئے مسائل کلامیہ پر خوب گفتگو رہتی۔ جدید فلسفہ کے مسائل کی بھی چاشنی آجاتی اس صحبت میں شیعہ دینیات اور کلام پر بھی سرسری نظر ہوگئی جو اب کام آئی۔ بغرض مرزا صاحب عجب متبحر شخص تھے قلم نہیں رکتا مگر گنجائش کم ہے لہذا مجبوری ہے آگے پھر کہیں ذکر آجائے گا۔ اُن کا ایک شعر لکھتا ہوں مزہ لیجئے۔

نہ سہی عشق مروت بھی ہے آخر کوئی شئے
رسم بڑھ جائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر

حالات ندوہ

اپریل کے پہلے ہفتہ میں محب گرامی مولوی ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت میں دارالعلوم کے طلبہ کی ایک جماعت سہارنپور گئی، یہ سفر مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی کی طلب پر اختیار کیا گیا تھا، جنکی ہدایت اور اصول کے مطابق کچھ عرصہ سے دارالعلوم کے طلبہ نے لکھنؤ کے اطراف وقصبات میں تبلیغی کام شروع کیا ہے حسن اتفاق سے انھیں تاریخوں میں مدرسۂ مظاہر العلوم کا سالانہ جلسہ تھا۔ جسکے سلسلہ میں علماء اور صلحاء کی ایک بڑی جماعت سہارنپور آئی ہوئی تھی طلبہ نے مدرسہ کی زیارت اور اسباق میں شرکت کی۔ بڑی سعادت مولانا محمد الیاس صاحب مدظلہ اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی صحبت اور انکی مبارک مجلسوں میں شرکت تھی۔ طلبہ ان حضرات کی عنایت اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے لطف ومحبت کا گہرا نقش لیکر آئے۔ مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مولانا عبدالرحمن صاحب صدر مدرس اور مولانا اسعد اللہ صاحب نائب مہتمم نے بھی بزرگانہ اخلاق اور عنایتوں سے سرفراز فرمایا۔

سہارنپور سے یہ قافلہ دیوبند گیا، وہاں اساتذہ کے درس میں شرکت کے علاوہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا ادریس صاحب کاندھلوی کی مفید اور علمی صحبتوں میں شرکت کا موقع ملا، مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب نے حسب معمول اپنے کرم اور بزرگانہ شفقت سے ممنون فرمایا۔ دارالعلوم کے طلبہ کو بے تکلف گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور دلچسپ مجلسیں رہیں، ندوی بھائیوں سے ملکر سفر کی مسرت میں اور اضافہ ہوا۔

اسلامی ہند کی پچھلی پچیس تیس برس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محتاج ثبوت نہیں

نہیں رہتی کہ نوجوانوں کی تعمیر نو میں مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال کے خیالات و افکار کو کافی دخل رہا ہے! الہلال والبلاغ کے پرجوش مقالے، ہمدرد و کامریڈ کے ولولہ انگیز مضامین، زبورعجم و بانگ درا کے سحر آفریں نغمے، پیام مشرق اور جاوید نامے ہمت افزا ترانے، اسرار و رموز کے انقلاب انگیز اشارے، بال جبریل اور ضرب کلیم کے حکیمانہ نکتے لاکھوں بلکہ کروروں انسانوں کی بیداری و ہشیاری کا باعث ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ کشاکش حیات کے اس دور میں کبھی کبھی فکر و خیال کی یہ محفلیں آراستہ کیجائیں تاکہ ان کے کلام کی گرمی دلوں میں حرارت پیدا کرے، بجھی ہوئی طبعیتیں جوش و ولولہ سے معمور ہوجائیں اور نوجوانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا ہوجائے۔ اس خیال کے ماتحت دارالعلوم میں وقتاً فوقتاً مختلف جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی ۲۱ اپریل کو جمعیۃ الاصلاح کے ماتحت یوم اقبال منایا گیا، جسمیں ڈاکٹر اقبال اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی گئیں۔ اس موقع پر طلبہ کی متعدد تقریروں اور تحریروں کے علاوہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کی زندگی، ان کے اسلامی رجحانات اور اصلاحی خیالات پر ایک مفید و جامع تقریر فرمائی۔

الاصلاح ہی کے ماتحت بزم رحمانی و بزم ادب کے بھی اجتماعات ہوئے۔ بزم رحمانی کے جلسے میں تاریخ اور ادب سے متعلق دو پرمغز مقالے پڑھے گئے، اور بزم ادب کی جانب سے وسیع پیمانے پر ایک مشاعرہ ہوا جسمیں طلباء کے علاوہ شہر کے کئی شعراء بھی مدعو تھے۔ مشاعرہ کے سلسلہ میں بزم ادب کے ارکان کی تجویز ہے کہ طرحی شاعروں کے بجائے مختلف اساتذۂ فن کو وقتاً فوقتاً دعوت دیجائے کہ وہ اپنا منتخب کلام سنائیں۔ کبھی کبھی پرانے اساتذہ کے کلام پر بحث و تنقید کی مجلسیں بھی منعقد ہوں۔ کسی حد تک تجویز پر عمل شروع ہوگیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ اس سے اچھے ادبی نتائج برآمد ہوں گے۔

چند نایاب کتب

اور انکی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

مقدمۂ ابن خلدون (مکمل تین جلدوں میں) مشہور عرب مؤرخ ابن خلدون کی بہترین تاریخی تصنیف کا اردو ترجمہ۔ رعایتی قیمت مجلد، پانچ روپیہ ۵؎

تفسیر القرآن (مکمل آٹھ جلدوں میں) قرآن پاک کی مکمل تفسیر، آجتک دنیائے اسلامی کے کسی حصہ سے ایسی نایاب اور قابل قدر تفسیر شائع نہیں ہوئی۔

مکمل سٹ، اصلی قیمت۔ بائیس روپیہ۔ رعایتی قیمت صرف۔ دس روپیہ

انجیل برنباس۔ اُس مقدس انجیل کا اُردو ترجمہ جسکو حاملان دین عیسوی نے عہد تاریک میں بالکل نابود کر دیا تھا کیونکہ اسمیں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی صریح خبر موجود ہے۔

نہایت قابل قدر تاریخی تحفہ ہو۔ اصلی قیمت۔ تین روپیہ۔ رعایتی۔ ڈیڑھ روپیہ

جواہر قرآنی۔ علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور تصنیف کا اُردو ترجمہ۔ اصلی قیمت ۳؎ رعایتی صرف ۱؎

تزک تیموری۔ امیر تیمور کی خود نوشت سوانح حیات کا اُردو ترجمہ۔ مجلد قیمت رعایتی۔ ۱۲؎

تفسیر کبیر۔ فاتح العلوم، امام فخر الدین رازیؒ کی مشہور تصنیف کا اُردو ترجمہ۔ سورۂ الحمد کی مکمل تفسیر۔ کاغذ قدرے بوسیدہ۔ اصلی قیمت تین روپیہ۔ رعایتی قیمت صرف ایک روپیہ۔

المشتہر: منیجر ایشیا بکڈپو۔ ڈاکخانہ وطن لاہور

ضروری نوٹ۔ محصولڈاک ہرحالت میں بذمہ خریدار ہوگا۔ مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ — جمادی الاول ۱۳۶۰ھ مطابق جون ۱۹۴۱ء — نمبر ۶

قیمت فی پرچہ تین آنے — سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

الندوہ کے حلقہ میں یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سُنی جائیگی کہ پچھلے مہینے مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی ہیڈ الاساتذہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے ایک مختصر علالت کے بعد اس جہان فانی سے انتقال فرمایا مرحوم ندوہ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں تھے اور یہاں کی تعلیم و تربیت کا بہت عمدہ نمونہ تھے تصنیف و تالیف کا ذوق شروع ہی سے تھا ادبیات کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں دار المصنفین میں قیام رہا خلفاء راشدین اور مہاجرین حصہ اول اسی زمانہ کی یادگار ہیں تصنیف و تالیف کے ذوق نے کتب خانوں سے تعلق پیدا کیا اور یہ کام ایسا بھایا کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی میں صرف ہوا کتب خانۂ ندوۃ العلماء کی ترتیب و تہذیب کے علاوہ بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ اورنٹیل لائبریری پٹنہ اور اسسٹنٹ لائبریری رامپور میں مدتوں یہ خدمت انجام دی آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک درس و تدریس کے مبارک مشغلے میں مصروف رہے خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی یہ خدمتیں قبول فرمائے اور انھیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے (آمین)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی تھی جس میں مسلم یونیورسٹی سے درخواست کی گئی تھی کہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح عربی و فارسی کے امتحانات کا سلسلہ یہاں بھی جاری کیا جائے اور جو لوگ ان امتحانوں کو پاس کرلیں انھیں انگریزی زبان میں بی اے تک امتحان کی اجازت دی جائے یہ تجویز اکیڈمک کونسل کے سامنے پیش ہوئی اور اس نے غور و خوض کے لئے ایک کمیٹی مقرر کردی ہے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی کے ارکان اور مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو اس تجویز کی جانب بھی توجہ دلائی جائے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شعبۂ مدارس اسلامیہ کے اجلاس میں منظور ہوئی تھی اس تجویز میں مسلم یونیورسٹی سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مشہور عربی مدارس کے فارغ طلبہ کو اس کی اجازت دے کہ وہ

مسلم یونیورسٹی کے ماتحت صرف انگریزی زبان میں میٹرک سے بی اے تک امتحان دے سکیں نہیں ایسد ہے کہ یہ تجویز کمیٹی کے ارکان کے پیشِ نظر ہوگی اور وہ اپنی رپورٹ میں اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے کوئی ایسی صورت پیدا کی جاتی کہ ان طلبہ کو صرف زبان میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ایف اے میں باضابطہ شرکت کی اجازت مل جاتی تعلیمی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، منطق، عربی، فارسی وغیرہ مختلف ایسے مضامین ہیں جنکی تعلیم میٹرک کے لازمی مضامین پر منحصر نہیں ہے، اس طرح ہندوستان کے اسلامی مدارس اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان خاص ربط و اتحاد پیدا ہو جاتا اور جدید و قدیم کے وہ اختلافات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے جنھوں نے صدیوں سے ملت کو دو نیم کر رکھا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ عربی مدارس میں اصلاح نصاب کا خیال روز بروز عام ہوتا جا رہا ہے یہ خیالات اب صرف جدید درسگاہوں ہی تک محدود نہیں بلکہ اسلامی تعلیم کے قدیم مرکزوں میں بھی جنبش نظر آ رہی ہے دارالعلوم دیوبند میں عرصہ سے اس قسم کی تحریک تھی جن لوگوں کو مولانا حسین احمد صاحب کے خیالات معلوم ہیں یا جنھوں نے مولانا اعزاز علی صاحب کا مقدمہ حماسہ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کو اصلاح نصاب کا کس درجہ احساس ہے اس سلسلہ میں پچھلے دنوں دیوبند کے متعدد فضلاء نے پرزور مضامین لکھے جن میں ہمارے لائق دوست جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کو خاص امتیاز حاصل ہے طلباء دارالعلوم کے سامنے ان کا مدلل اور انقلاب انگیز خطبہ عرصہ تک یادگار رہیگا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اب یہ کوششیں بار آور ہو رہی ہیں محرم کے مہینے میں دیوبند جانا ہوا تو مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مجلس شوریٰ نے اصلاح نصاب کیلئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے جس میں موصوف کے علاوہ مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی شامل ہیں خدا کرے یہ کمیٹی جلد اپنے کام سے فارغ ہو جائے اور آئندہ سال سے نیا نصاب رائج ہو جائے۔

اس موقع پر قارئین الندوہ کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ صوبہ بنگال میں بھی ترمیم نصاب کا مسئلہ زیر غور ہے اس سلسلہ میں جمعیۃ المدرسین بنگال کے سکریٹری کا ایک خط ہمارے پاس آیا ہے اس موقع پر وہ ایک رپورٹ بھی مرتب کر رہے ہیں جس میں ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہوں کے حالات درج ہوں گے ہمیں امید ہے کہ اسلامی مدارس کے منتظمین انھیں فینی ضلع نواکھالی کے پتہ سے اپنی درسگاہوں کے حالات سے مطلع فرمائیں گے۔

اردو کے خلاف عرصہ سے فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں تب شد ومد سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ کی بہت کثرت ہے لیکن ابھی حال میں اردو کے مشہور ادیب و محقق جناب پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی نے بڑی قوت سے اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا ہے انھوں نے شمار کر کے بتایا کہ اردو کے ۵۳۹۶۰ الفاظ میں سے اکیس ہزار چھ سو ہندی کے الفاظ ہیں سترہ ہزار پانچ سو خالص اردو کے اور صرف تیرہ ہزار چھ سو پچیس عربی فارسی کے الفاظ ہیں امید ہے کہ اس اظہار حقیقت کے بعد اردو کو محض عربی فارسی کا مرکب کہنے کی جرأت نہ کی جائے گی۔

عرصہ سے بعض دوستوں کی تجویز یہ ہے کہ الندوہ کے ساتھ ایک دار الاشاعت بھی قایم کیا جائے جسکے ماتحت مفید علمی اور دینی کتابیں شایع ہوں اس مناسب مشورہ پر ہم اپنے دوستوں کے شکر گذار ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ جوں ہی حالات سازگار ہوئے اس بارہ میں عملی کام شروع کر دیں گے لیکن اس سے پہلے ضرورت ہے کہ خود الندوہ اس قابل ہو جائے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے ہمیں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے اور کم از کم رسالہ کا ایک ایک خریدار بنا دیں گے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا سید طلحہ صاحب ایم اے پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور

ذیل میں ہم اپنے محترم مولانا سید طلحہ صاحب کا مضمون شائع کر رہے ہیں مولانا کا یہ مقالہ ایک ذاتی خط کی شکل میں ہے جس میں موصوف نے مجھے مخاطب کیا ہے اس مضمون سے ایک فاضل استاد کا نقطۂ نظر، اس کے ذہنی تاثرات اور تعلیمی تجربات معلوم ہوتے ہیں جو اہل علم اور بالخصوص حضرات مدرسین کے لئے خاص طور پر دلچسپ اور مفید ہوں گے

(ابو الحسن علی)

عربیت اور اس کے متعلقات

ابتدائی تعلیم جیسا کہ عموماً قاعدہ ہے بزرگوں کے جبر و قہر کے ماتحت رہی سب سے اول شوق و ذوق سے جو کتاب پڑھی وہ مقامات حریری تھی اس کا اسلوب قافیہ بندی اور سجع نہایت مرغوب تھا انشا نویسی بھی اسی طرز کی پسند آئی۔ یہ اثر مدتوں قائم رہا۔ بعد میں جاحظ کی انشا اور تیسری صدی کی عام کتب تاریخ پسند آئیں۔ اغانی الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ کے سیاسی خطوط اور نہج البلاغہ نے نہایت متأثر کیا۔ نظم میں معلقات، حماسہ، قصائد متنبی پسند آئے لیکن مضمون آفرینی کی نسبت شوکت الفاظ، جزالت اسلوب زیادہ پسند آئی آج کل عربی نثر خصوصاً بعض مصری جرائد کے مقالات افتتاحیہ دل کو بہت بھاتے۔

صرف و نحو

صرف میں شافیہ اور رضی اچھی معلوم ہوئیں۔ ان کتابوں کا ذوق ایک زمانہ میں اتنا تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے تفریح طبع کے لئے کبھی کبھی شافیہ سامنے رکھی ہوتی۔ نحو میں مفصل اور اوضح المسالک اور مغنی اللبیب منتخب کتابیں ہیں سب سے گہرا نقش سیبویہ کی الکتاب کا ہے جو دماغ پر اب بھی ثبت ہے۔ بعض لوگوں کو

شاید گراں گذرے کافیہ اور شرح جامی نے کبھی کوئی اثر نہ پیدا کیا۔ اس کو چاہے ہماری کم لیاقتی سمجھو۔ متعلقات لغت اور عربیت میں المزہر للسیوطی بہت پسند آئی۔ ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین عربی اشعار کا مجموعہ ہے اور کامل مبرد جو عربیت کا خزانہ ہے مجھے بہت پسند ہیں۔

علم حدیث

دل چاہتا ہے کہ اس موضوع پر صفحہ کا صفحہ رنگ ڈالوں لیکن ڈر ہے کہ تم اور تمہارے قارئین اکتا جائیں گے عربیت کے شوق سے حدیث کے شوق کو ترقی ہوئی سب سے بڑھ کر ماحول اور خاندانی روایات معاون تھیں بھلا حضرت سید عرفان مرحوم اور حضرت سید مصطفٰی[۱] مرحوم جس ماحول میں ہوں وہاں حدیث کا شوق کیونکر نہ ہوگا سب سے زائد محبوب اور مرغوب کتاب امام بخاری کی جامع صحیح ہے جس کی محبت اور شیفتگی عشق کے درجہ کو پہونچ گئی اس کتاب کی محبت کے لئے میں الفاظ نہیں پاتا تمہیں یاد ہوگا کبھی کبھی بے اختیاری میں تمہارے سامنے اس کی کسی حدیث کی اسناد ہی پڑھنے لگتا اور کبھی ترجمۃ الباب اور قال الحسن قال ابن سیرین قال فلاں زبان سے شوق میں نکلتا اس کتاب کی عظمت اور محبت پیدا کرنے میں میرے فاضل استاد مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر کابل کو بڑا دخل ہے اس کتاب کے پڑھنے کے زمانہ میں فتح الباری سے قدرے مطالعہ شدہ۔ اسماء الرجال کا شوق اور صحابہ اور طبقات صحابہ کے حالات کی جستجو ہوئی۔ اکثر خیال ہوتا کہ صحابہ کے حالات اس قدر معلوم ہوں کہ گویا ان کو دیکھا ہے کس صحابی کا کس سے کیا رشتہ ہے آنحضرت سے کیا تعلق تھا اور اسی قسم کی دوسری جزئیات معلوم کرنے کا شوق تھا۔

پھر اسی طرح تابعین کے حالات پھر دیگر ائمہ و اکابر اور رواۃ حدیث کے حالات کا شوق ہوا۔ انکی وفیات اور عمریں یاد رکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ طالب علمی ہی میں مسند دارمی اور پوری مسند ابن حنبل

[۱] مولانا سید عرفان اور مولانا سید مصطفٰی حضرت سید احمد شہید کے واسطے اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر علماء سنت میں تھے اتباع نبوی تورع اور تقوی اور کتاب و سنت کے شغف اور عمل میں دور دور اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

دیکھی موطا امام مالک نے بھی خوب متأثر کیا ان کتب حدیث اور مصنفین کے دماغ پر جو مخلوط اثرات پڑے انکا اگر تجزیہ اور وضاحت کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں کہ امام مالک کی عظمت اور انکی موطا کی محبت بھی ہے اور امام بخاری کی ذات کے مقابلہ میں صحیح بخاری سے زیادہ تعلق اور گرویدگی ہے لیکن مسند احمد بن حنبل کے مقابلہ میں امام احمد بن حنبل کی ذات سے زیادہ محبت اور تعلق معلوم ہوتا ہے اسکی وجہ نہیں بتلا سکتا۔

افسوس صحیح مسلم کا کوئی اثر دماغ پر نہیں رہا یوں حدیث کی تقریباً سب کتابیں اساتذہ سے پڑھیں میرے تمام تر اساتذہ حنفی تھے اور میں حنفیت کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ انکی شاگردی نے ایک قسم کا اعتدال پیدا کر دیا ورنہ میں سخت جامد غیر مقلد ہوتا۔ زاد المعاد بظاہر سیرت کی کتاب ہے لیکن میرے نزدیک حدیث کے اہم مسائل کا ایک مختصر کتبخانہ ہے۔

قرآن و تفسیر

تم تفسیر کے معلم ہو قرآن و تفسیر کے متعلق سننا چاہتے ہوگے۔ بھائی بناوٹ سے کچھ لکھ دینا یہ تاریبا ہے باعتبار عربیت کے قرآن کے اسلوب اور جزالت کا اثر اس وقت سے قایم ہوا جب عربیت کی ایک حد تک تحصیل کر لی اور اسی بات نے حفظ کا شوق دلایا معانی بیان کی درسی کتابوں سے یہ اثر اور گہرا ہوا اور قرآن پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی احکام فقہیہ یا دیگر مسائل کا استنباط۔ دوسرے عربیت کے نکات اور لغوی مسائل۔ چنانچہ الاکلیل فی استنباط التنزیل للسیوطی اور تفسیر احمدی بہت پسند تھی۔ ابو بکر ابن العربی اور جصاص کی احکام القرآن اس وقت تک مجھے نہیں ملی تھی۔ استنباط مسائل کا اسقدر شوق تھا کہ آیت ما دمت علیہ قائما سے دیوانی کے قیدی کا محبوس کرنا استنباط کیا اور پھر کتاب سے اسکی تائید ہوئی کبھی استدارہ ارض کی دلیل ڈھونڈھی غرض یہ بے اعتدالیاں سمجھو یا ماحول اور نصاب کا اثر بہرحال ایک عرصہ تک یہ شوق رہا قرآن کے محاسن لفظی کے سلسلہ میں کشاف پوری مطالعہ کی اسی سلسلہ میں مفتاح العلوم للسکاکی الطراز اور دلائل الاعجاز مطالعہ کیں بعض چیزوں کی تحقیق میں تفسیر کبیر کی طرف بھی رجوع کرتا عجیب بات ہے کہ

قصص بنی اسرائیل اور حضرت داؤد وغیرہ کے قصہ کا اشکال کبھی محسوس نہیں ہوا، قصۂ غرانیق قصۂ صواع الملک کی تحقیق کا شوق بھی کبھی نہیں ہوا، نہ ربط آیات اور قسم اور جواب قسم کے متعلق کے مسائل سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوئی، قرآن کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ کتاب عزیز جلیل القدر کتاب آسمانی صحیفۂ ربانی علوم و معارف کا گنجینہ ہے جو ابد الآباد تک سیرابی کے لئے کافی ہے خشیت الٰہی ایمان بالآخرت ایمان بالقیامت جسقدر اس کی تلاوت سے پیدا ہوسکتا ہے دنیا کی کسی تحریر و تقریر اور کسی انشاء سے نہیں ہوسکتا لیکن اس دنیا ناپائدار کی جو مزرعۃ الآخرہ ہے تفاصیل انسان ضعیف البنیان کی سمجھ میں اس کتاب سے نہیں آسکتیں یہ کمزوری انسان کی ہے نہ کہ کتاب عزیز کی مثال کے لئے ایک آیت پیش کرتا ہوں وعاشروھن بالمعروف ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف کیا انسان اس سے وہ تمام تر تفصیلات و تعلقات زناشوئی سمجھ سکتا ہے جو کسی حدیث کی کتاب کی تفصیلات سے سمجھ سکے گا جناٹیل[۱] ان تفصیلات کو تقدس کے دامن پر دھبہ سمجھتے ہیں جنکی ساری عمر خباثت اور خبیثات کے ذکر میں گذر گئی ہے اسی مسئلہ پر عبادات آداب طعام و آداب شرب کو قیاس کرلو۔ ایک اور نظریہ قرآن کے متعلق ہے اور وہ پہلے کی تفصیل ہے وہ یہ کہ بغیر احادیث کی روشنی کے کوئی نو مسلم راسخ الایمان محض قرآن کو عقیدت سے پڑھے تو دنیا کی کسی چیز میں اس کو لطف نہ آئیگا اور وہ محض آخرت کا آدمی ہوجائے گا یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے یہ اعتدال حدیث سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے آنحضرتؐ کی ذات اور آپ کا اسوہ ہے جنھوں نے قرآن پر عمل کرنے کا صحیح ترین و معتدل نمونہ پیش کیا اس عملی تفسیر کو الگ کرکے آدمی اس بے اعتدالی سے بچ نہیں سکتا۔

علم تصوف

احیاء العلوم اور مثنوی مولانا روم خود دیکھیں اور پسند آئیں تمہارے والد ماجد مرحوم[۲] ارے کیا آدمی تھے انکی کون کون سی باتیں یاد کروں، ان کے مشورہ سے رسالہ قشیریہ عوارف للسہروردی اور فتوح الغیب

۱؎ جنٹلمین کی جمع اور مولانا کی مخصوص اصطلاح ہے ۲؎ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

کا مطالعہ کیا فتوح الغیب نے اس قدر دل و دماغ پر اثر کیا تھا کہ کسی انسان کی تصنیف نے وہ اثر نہ کیا ہوگا حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کا ایک اثر انتہا درجہ کا ہوا اور وہ یہ کہ تصوف کے مقابلہ میں شریعت کی عظمت دل پر نقش ہوگئی اور یہ اسی کتاب کا فیض ہے مثنوی اس لئے بھی پسند آئی کہ علم کلام اور تصوف کے مسائل نہایت خوش اسلوبی سے خلط کئے ہیں غزالی کی تصنیفات اکثر پسند آئیں فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ خاص اچھی معلوم ہوئی شیخ اکبر کی فتوحات کبھی طائرانہ نظر سے دیکھی کبھی کوئی نکتہ پسند آیا لیکن نہ اس کتاب کا شوق نہ اس سے بدشوقی کا افسوس ہے۔

معقولات اور علم کلام

تمھیں تعجب ہوگا کہ ایام خواندگی میں جس قدر شوق سے دو کتابیں پڑھیں کوئی کتاب نہیں ایک بخاری دوسری حمد اللہ میں مجبوراً یہ لکھ رہا ہوں صدرا کی بحث جزء لایتجزیٰ بھی شوق سے پڑھی شرح مواقف کا طرز پسندیدہ ہے شمس بازغہ بھی پسند آتی ہے۔

اصول فقہ اور فقہ

فقہ حنبلی کی کتاب المغنی نہایت پسند ہے لیکن مطالعہ میں نہیں رہی فقہ حنفی میں ہدایہ کو ایسی کتاب سمجھتا ہوں کہ آدمی کو اہل عراق کی فقہ سے اس کے ذریعہ سے کامل مناسبت پیدا ہوجاتی ہے اصول فقہ میں تحریر ابن الہمام اور توضیح و تلویح مجھے پسند ہے اجماع کی بحث جیسی تم توضیح میں دیکھو گے کہیں اور نہ ملے گی اں ایک بات لکھتا ہوں وہ میرا نظریہ بلکہ عقیدہ ہے غالباً شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی کہیں اشارہ کیا ہے اصول فقہ مجتہد فیہ فقہی مسائل کی ایک توجیہ ہے جیسے نکات بعد الوقوع ہوتے ہیں اس کے باوجود اس فن سے مجھے طبعی ذوق ہے۔

امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات

شیخ الاسلام کی کتابوں میں سب سے پہلی کتاب ان کے فتاویٰ دیکھے اس کا نہایت اچھا اثر پڑا اور

ان سے انتہائی عقیدت پیدا ہوگئی پھر تو ہر کتاب انکی پسند آئی اور معلوم ہوا کہ متاخرین میں سے اگر کسی نے برائے اسلام کی طرف دعوت دی تو وہ یہ دونوں بزرگ ہیں شیخ الاسلام کی کتابوں میں مضامین کی ترتیب و تہذیب (عربی معنی میں) نہیں ہے انکی پرآزمصائب زندگی کا یہی مقتضیٰ تھا الغرض نیلت درجہ عقیدت ان صاحبوں سے ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ بعض مسائل میں انکی ہم آہنگی نہ کی مثلاً طلاق ثلاث فی مجلس واحد یا عصمت انبیا کے متعلق انکی رائے سے اختلاف ہے حافظ ابن قیمؒ کی تصانیف میں سے زاد المعاد خاص طور سے قابل ذکر ہے میں لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک وہ احادیث کا بہترین مختصر کتب خانہ ہے تم کو تعجب ہوگا مولانا سید عرفان رحمۃ اللہ علیہ (میرے رشتہ کے ماموں اور حضرت سید شہیدؒ کے حقیقی نواسہ) کبھی کبھی تشریف لاکر زاد المعاد جو ہمارے یہاں تھی مانگ کر دیکھنے لے جاتے ان کے بعد میں دیکھتا تو نہ لطف آتا نہ قدر معلوم ہوتی آج میں اسکی قدر سمجھتا ہوں حافظ ابن قیمؒ کی شفاء العلیل بھی مجھے بہت پسند آئی نہایت عمدہ کتاب ہے اس میں قضاء و قدر کے مسائل میں ضمناً خیر و شر پر خوب بحث ہے۔

شعر فہمی

اس عنوان سے تم کو تعجب ہوگا میرا عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ رائج الوقت نصاب درس سے یہ ذوق لطیف نہیں پیدا ہوتا ہے میں اس کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں لوگوں کو کہتے سنا کرتا تھا کہ مولوی شعر کیا جانیں "شعر من بہ مدرسہ کہ برد" مشہور بات ہے نصاب درس کے اس نقص کی تلافی کتب ذیل سے کی اور انھوں نے مجھے فائدہ پہونچایا۔

آبحیات۔ تذکرہ گلشن بے خار۔ گل رعنا۔ مقدمہ دیوان حالی۔ شعر العجم۔ سب سے زیادہ فائدہ موخر الذکر نے پہونچایا واقعی یہ کتاب مجتہدانہ طرز کی ہے مصنف کے مخالف بھی اس کتاب کے معترف ہیں گل رعنا کے نام پر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جس کو سنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا میں لاہور سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا تمھارے

والد مرحوم اور میں دوپہر کے وقت ہمارے موجودہ لکھنؤ کے گھر کے مشرقی شمالی کمرہ میں سونے کے لئے لیٹے تھے مرحوم فرماتے ہیں کہ ہم نے ہلکا کام سمجھ کر ان دو مہینوں میں ایک کام کیا ہے اور شعرائے اردو کا تذکرہ گل رعنا کے نام سے مرتب کر دیا ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ مرزا صاحب کا کلام جہاں تک مل سکا ہے جمع کر دیا ہے ایک مصنف خود اپنی تصنیف اور ریسرچ ورک سنا رہا ہے لیکن ہم دوپہر کے سونے کے بیمار بدمذاقی سے نیند کو ترجیح دے رہے ہیں اور یہ نہیں معلوم کہ یکایک اس مخلص بزرگ کے انتقال کی خبر پہونچے گی۔

مختلطات

مندرجہ ذیل کتابوں میں سے ہر ایک مستقل کتب خانہ اور معلومات کا خزانہ ہے: زاد المعاد، حجۃ اللہ اور مقدمہ ابن خلدون آخر میں ایک بات لکھ کر ختم کرتا ہوں طالب علم کے لئے جب کچھ استعداد ہو جائے ایک مجموعہ کتب ضرور اسکی مرضی پر چھوڑا جائے لیکن کبھی کبھی مشورہ بھی دیا جائے اس بات نے تم کو بھی فائدہ پہونچایا ہے اور مجھے بھی لیکن تمہارا مکتبہ ایک صدی سے اوپر زمانہ کا مجموعہ تھا اور علماء کا جمع کیا ہوا میرے یہاں کا مجموعہ محض نستعلیقی اور خوش سلیقگی کی تکمیل کے لئے جمع ہوا تھا۔

ضمیمہ میری محسن کتابیں

از جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خانصاحب شروانی

عنوان بالا پر جو مقالہ میں نے لکھا اُس میں سوئے اتفاق سے دو کتابوں کا ذکر رہ گیا۔ حالانکہ ان کا احسان عظیم تھا۔ دل محسوس کرتا رہا ہے کہ اونکا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی ہے۔ اس لئے ضمیمہ ہذا پیش ہو وہ دونوں کتابیں یہ ہیں۔

(۱) بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی محدثین کی تصانیف کے بیان میں تصنیف کے ذکر کے ضمن میں مصنف کا ذکر بھی تفصیل و تحقیق سے فرمایا ہے۔ یہ کتاب عرصے تک مطالعہ میں رہی بزرگوں کے کتابخانے سے اتفاقاً پرانا مطبوعہ نسخہ مل گیا تھا۔ شوق سے برابر پڑھا۔ صاف و سنجیدہ عبارت میں حالات و واقعات تحقیق کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ علمائے سلف وغیرہ رسائل کی تالیف میں جو تھوڑی بہت کامیابی مجھکو ہوئی اوسکی اصل وہ ذوق ہے جو اس کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔[لہ] رحم اللہ تعالےٰ مصنفہ۔

(۲) دو رسالے تصوف کے۔ ایک حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے حالات میں مولفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ دوسرا حضرت شاہ غلام علی کے حالات میں۔ نوشتہ شاہ عبدالغنی صاحب مجددی۔ یہ رسالے بھی اتفاقاً بزرگوں کی کتابوں میں سے ہاتھ آگئے تھے۔ سعادت تھی کہ دیکھکر شوق پیدا ہوا بستان المحدثین کی طرح عرصے تک مطالعہ کیا۔ یہ رسالے بھی مطبوعہ قدیم ہیں۔ حالات صاف اور سنجیدہ عبارت میں مبالغہ اور اغراق سے پاک محققانہ وچشم دیدہ بیان فرمائے ہیں۔ ان رسالوں کے مطالعہ سے یہ ذوق پیدا ہوا کہ تصوف کو بجائے مباحث کے حالات و واقعات کے آئینے میں دیکھا جائے۔ الحمد اللہ یہی ذوق ابتک کارفرما ہے۔ بزرگان وقت سے ملنے اور ان کے متعلق خیال و عقیدت کے پیدا ہونے میں بھی یہی ذوق کارفرما رہا رضی اللہ تعالےٰ عن مصنفیہا۔

لہ علماء سلف کی تالیف میں بستان المحدثین سے بھی مدد لی گئی ہے

حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ

از عبدالسلام قدوائی

(۴)

حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایتیں یہی نہیں کہ صرف چند آدمی ان کے سامنے بیٹھ کر لکھتے ہوں بلکہ بہت سے ایسے بھی لوگ تھے جو ان کے پاس سے حدیثیں سن کر گھروں میں جاکر لکھتے تھے[۱]۔ یہ طریقہ خاص طور سے لوگوں نے اس زمانہ میں اختیار کیا تھا جب حضرت عبداللہ حدیثوں کو قید تحریر میں لانے کے مخالف تھے اس ترکیب سے ان کی ابتدائی زمانہ کی مرویات بھی کتابی شکل میں مرتب ہوگئی تھیں۔ تلامذہ اور عقیدت مندوں کی ان کوششوں کے علاوہ خود حضرت عبداللہ نے بھی کافی حدیثیں جمع کی تھیں جو ایک کتاب کے برابر ہوگئی تھیں انتقال کے بعد یہ مجموعہ ان کے گھر سے برآمد ہوا ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے قسمیں کھا کھا کر لوگوں سے کہا کہ یہ کتاب خود حضرت عبداللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی[۲]۔

حضرت ابن مسعود کی روایات علماء کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اول تو انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضری کا کافی شرف حاصل رہا ہے اس کے علاوہ احادیث کی روایت میں الفاظ کی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اسکی تاکید کرتے تھے[۳] ان تمام خوبیوں کے ساتھ فہم و بصیرت اور علم و تفقہ میں بہت ممتاز تھے اور تبلا فقہاء میں شمار ہوتے تھے[۴]۔

صحابہ میں حضرت زید ابن ثابت بھی بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں انھیں اتنا تقرب حاصل تھا کہ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے آپ کے حسب ارشاد عبرانی زبان سیکھی تھی اور اس میں آپ کی ترجمانی کرتے تھے صحابہ کی نظر میں بھی ان کی بہت اہمیت تھی حضرت

---

۱ دارمی ص۶۸ ۲ جامع ص۳۷ ۳ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۲ ۴ ایضاً تذکرہ ص۱۲

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں جمع قرآن کی خدمت انھیں کے سپرد کی تھی پھر حضرت عثمانؓ نے جب عہد صدیقی کے مرتب شدہ مصحف کی نقل دیار و امصار میں بھیجوائی تو نقل و کتابت کا کام انھیں زید ابن ثابت کے سپرد کیا[1] حضرت عبداللہ ابن عباس کے جیسے کثیر العلم صحابی انھیں راسخین فی العلم میں شمار کرتے تھے حضرت ابوہریرہ جو اپنی کثرت روایت اور ذوق علم میں مشہور ہیں وہ بھی حضرت زید کی وسعت علم کے قائل ہیں چنانچہ جب انکی وفات ہوئی تو فرمایا کہ مات حبر الامۃ اس امت کا غیر معمولی عالم وفات پا گیا[2]۔

ان خصوصیات کی بنا پر لوگوں کو خیال تھا کہ کسی طرح حضرت زید کی روایات بھی کتابی شکل میں مرتب ہو جائیں لیکن یہ مشکل یہ تھی کہ وہ کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان کی بیان کردہ حدیثیں قلمبند کرائیں لیکن جب انھیں معلوم ہوا تو مٹادیں[3] بالآخر مروان نے خاص ترکیب سے انکی روایتیں قلمبند کرائیں اس نے ایک پردہ ڈلوا دیا اور اس کے پیچھے ایک آدمی کو بٹھا دیا پھر حضرت زید کو بلا کر ان سے حدیثیں دریافت کرنے لگا وہ حدیثیں بیان کرتے اور پس پردہ مقرر شدہ آدمی انھیں لکھتا جاتا[4]۔ مروان کے علاوہ حضرت زید کے ایک اور نامور شاگرد جناب عروہ بن زبیرؒ بھی ہیں انھیں اور ان کے صاحبزادے ہشام کو کتابت حدیث کا جس قدر خیال اور اس جانب جتنی توجہ تھی اس کا ذکر پچھلی اشاعت میں ہو چکا ہے۔

آنحضرت کے خادم حضرت ابو رافع کی روایتیں حضرت عبداللہ ابن عباس نے جمع کر لی تھیں[5] حضرت سمرہ ابن جندب ایک اور مشہور صحابی ہیں انکی روایتیں بھی انکی زندگی ہی میں مرتب ہو گئی تھیں یہ مجموعہ عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا انکے پوتے حبیب نے اس سے دیکھ کر روایتیں لکھیں[6]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۱ [2] تذکرہ جلد اول ص ۱۷ [3] جامع بیان العلم ص ۱۲ [4] دارمی ص ۶۶ [5] خطبات مدراس بحوالہ طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم ۲ ص ۱۲۳ [6] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۹۸

حضرت رافع ابن خدیج کے پاس آنحضرتؐ کے بعض اقوال تحریری شکل میں موجود تھے[1]

حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے بھی بعض حدیثیں قلمبند کیں ایک مرتبہ حضرت معاویہ نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد کیا پڑھا کرتے تھے اس کے جواب میں انہوں نے وہ دعا لکھکر بھیجی[2]۔

حضرت براء ابن عازب ایک اور نامور صحابی ہیں انکی روایتیں بھی انکی زندگی ہی میں تحریری شکل میں مرتب ہوگئی تھیں ان کے شاگردوں کے شوق کتابت کا یہ حال تھا کہ کاغذ موجود نہ ہوتا تو ہتھیلیوں ہی پر لکھتے[3] جنھیں پھر صاف کر لیتے حضرت سعد ابن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے انہوں نے بھی حدیثیں کتابی شکل میں جمع کی تھیں جو ان کے بیٹے کے پاس بعد کو بھی موجود رہیں اور جنھیں انہوں نے اپنے شاگردوں تک پہونچایا[4]۔

حضرت عبداللہ ابن ابی اوفی ایک خاص صحابی ہیں انہوں نے بھی حدیثیں لکھی تھیں ان کے شاگردوں نے ان کی تحریری روایتیں بعد کے لوگوں سے بیان کیں چنانچہ بخاری کی ایک روایت کے سلسلہ میں ایک صاحب سالم ابو النضر کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن ابی اوفی نے لکھا جسے میں نے پڑھا[5]۔

حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کی اہمیت محتاج تشریح نہیں آپ کو بھی جمع و تحریر احادیث سے خاص دلچسپی تھی وہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو نصیحت کرتے تھے کہ

تعلموا العلم فانکم ان تکونوا صغار قوم تکونوا کبار ھم غدا فمن لم یحفظ فلیکتب[6]	علم حاصل کرو کیوں کہ اگر آج تم قوم میں چھوٹے ہو تو کل ان کے بڑے ہوگے جو یاد نہ کر سکے اسے چاہئے کہ لکھ لے۔

---

[1] مسند احمد ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۴۱ [2] ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب ما یقول الرجل اذا سلم [3] دارمی صفحہ ۶۹ [4] ترمذی جلد اول باب القضاء بالیمین مع الشاہد [5] بخاری جلد اول کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [6] جامع بیان العلم صفحہ ۸۲

حضرت معاویہؓ حضرت ثوبان اور حضرت ابو امامہ کی مرویات ان کے شاگرد خالد ابن سعد ان کے ذریعہ تحریری شکل میں مرتب ہوئیں انھوں نے ستر صحابہؓ سے ملاقات کی تھی تحریر و تدوین کی جانب اتنی توجہ تھی ان کے پاس ایک خاصی باقاعدہ کتاب مرتب ہوگئی تھی[1]۔

مکثرین کی صحابہ کی تقریباً پچیس ہزار روایتوں کا ذکر گذشتہ اشاعت میں ہوچکا ہے جو ان کے سامنے ہی تحریر کا قالب اختیار کرچکی تھیں۔ آج کی صحبت میں چند اور مشہور صحابہ کے تحریری مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً ہزارہا حدیثوں پر مشتمل تھے لیکن یہ تعداد یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام کے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں خطوط کو بھی شامل کرنا چاہئے جو انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمال، فوجی افسران اور معلمین و محصلین کے نام لکھے اور ان افسروں اور عاملوں کی جانب سے جو احکام و فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی روشنی میں لکھے گئے اس طرح صحابہ کرام کے زمانہ ہی میں احادیث کے بہت سے مستقل اور بڑے بڑے کتابی مجموعوں کے علاوہ سارے اسلامی ممالک میں بے شمار تحریری روایتیں پھیلی ہوئی تھیں

[1] تذکرہ ص۵۱ جلد اول و تہذیب جلد ۳ ص۱۱۹

یادِ ایام

شب بود و صد ہزار تماشائے دلفریب
(شبلی)
صبح از کرانہ سر زدہ دیدم کہ خواب بود

معتمد تعلیم کا اصلی کام تو تعلیم کی نگرانی تھی مگر کام چلانے کے لئے بڑی چیز روپیہ ہے اسکی فراہمی چلت پھرت والے شخص پر پڑجاتی ہے ہمارے علامہ کی شخصیت نے خود ان سب کاموں کا ذمہ لے لیا لینا ایک سر ہزار سودا ہوگیا دار العلوم کی نگرانی ملک میں اسکی تبلیغ، روپیہ فراہم کرنا رسالۂ الندوہ جو خود انکی ایجاد تھا چلانا اور ابتدا میں اس کو خود ہی بھرنا طباعت کی فکر اور نگرانی شعر العجم کی تصنیف یہ کیا کچھ کم شامل تھے۔

علامہ کا معمول یہ تھا کہ شب کو ۹ بجتے بجتے سو جاتے کھانا عموماً بعد مغرب تناول فرما لیتے کھانے میں گوشت اور وہ بھی بھنے ہوئے تار پر مصالحہ دار کا شوق تھا خود بھی کھانا عمدہ پکا لیتے چار بجے صبح سے اٹھ بیٹھتے لیمپ کے چولھے پر چاء کی کیتلی رکھدیتے شب کو خدمتگار سب سامان قرینے سے رکھکر چلا جاتا آپ ہی چاء بنا کر پیتے شاعری کا یہی وقت تھا اول نماز سے فراغت کرکے کچھ تلاوت بھی کرلیتے پھر میز پر اور کبھی فرش پر بیٹھکر تصنیف شروع ہوجاتی اور یہ شغل صبح کو آٹھ بجے تک ختم ہوجاتا فرماتے تھے کہ بھائی یہ وقت اپنا ہوتا ہے بلا مداخلت غیرے جو چاہو کرو۔ پھر تو جناب دن بھر کے مشغلے چھڑ جاتے لوگ آنیوالے کیا کم تھے میرے لئے کوئی پابندی نہ تھی کیونکہ اگر بے وقت بھی چلا جاتا تو چپ چاپ ایک کونے میں انکو مشغول پاکر بیٹھا رہتا جب وہ خود مخاطب ہوتے تو چونکتا مجھکو اس علم کے دیوتا کیساتھ محویت تھی اگر کوئی فکر کلام کرتے یا کوئی نئی تحقیق ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی سن لیتا جس زمانہ میں کسی تصنیف کو تیز رفتاری سے ختم کرتا ہوتا یا الندوہ بھرنا ہوتا تو اس زمانہ میں

اس وقت میں توسیع ہو جاتی دس بجے تک میں نے ایک مرتبہ عرض کیا یہ بات نوٹس چاہتی ہے لہذا دروازہ پر لکھ کر کہہ دیتے کہ احباب معاف فرمائیں میں دس بجے تک مصروف رہوں گا۔ دس گیارہ بجے کے درمیان کھانا کھاتے اس وقت بھی وہی ایک مرغوب غذا ہوتی دو قسم کے کھانے کم ہوتے تھے اس کے بعد اگر کوئی بے وقت آنے والا نہ آ دھمکا تو دارالعلوم میں اتر کر آتے اور تعلیم کی نگرانی فرماتے یا مدرسین خالی اوقات مدرسہ میں خود انکے پاس چلے جاتے ہر فن کی تعلیم کے بابت ان کو ہدایتیں فرماتے اور کبھی کتاب منگا کر خود پڑھ کر ان کو پڑھانا بتاتے۔ شروع میں بعد فراغت کچھ درسیات کی تعلیم دی تھی فرماتے تھے کہ میری صرف و نحو کمزور تھی وہ پڑھانے سے درست ہو گئی اس کے بعد تو علی گڑھ میں عربی فارسی کے درجوں کے کھلنے اور امتحان پاس کرنے کے متوالے طلبہ کا رڑخا نارہ گیا تھا مگر اب بھی درسی علم حاضر تھا۔

یہ بھی ان پر خدا کی رحمت تھی کہ باوجود صحت کی اتنی خرابی کے دماغ صاف رہتا کہ سخت بخار کی حالت میں بھی وہ ساہی القوا کبھی نہ ہوتے فرماتے تھے کہ اس قدر سخت قبض اور باسور کی تکالیف کے اثرات حلق تک رہتے ہیں دماغ کیطرف صعود نہیں کرتے لہذا بخار میں اور بخار تو کشمیری تحفہ تھا اکثر آ جاتا تصنیف کا کام نہ رکتا البتہ کتب بینی بند ہو جاتی مگر باتیں کرنے کا شوق تھا اس میں کوئی کمی نہ ہوتی شدت تکلیف میں چند منٹ کراہ لیتے پھر ہلکے ہو جاتے ملیریا کا بخار تھا سردی بھی لگتی تھی اس لئے لحاف یا کمل بستر سے کم ہٹتا۔ الکلام تو ساری کی ساری شدت بخار میں تصنیف کی مگر اس کی ٹھنڈک تو دیکھئے کہ کسی پر بھی بخار نہ نکالا حتیٰ کہ ملاحدہ کے اعتراضات کے جواب میں بھی ان کا وہی اعتدال قائم رہا اور کہیں قلم نہ تیز ہوا ۱۲ سے ۴ تک کا وقت عموماً مطالعہ اور فراہمی مواد میں صرف فرماتے اس کے بعد اگر احباب آ جاتے تو خیر نہیں تو ٹہلنے کو نکل جاتے اور دور دور تک چلے جاتے میں اکثر ساتھ ہوتا دنیا بھر کے اگلے پچھلے عام دلچسپی کے واقعات کا ذکر رہتا علامہ حقہ اور پان کے تکلف سے بری تھے انکا حقہ پان صرف شکر دان اور چمچہ تھا مگر وہ بھی لکھتے وقت جب کوئی طبیب ٹوک دیتا تو

دو چار دن اس میں تساہل فرماتے مگر پھر وہ سامنے آجاتا تیز مٹھائی کا بیحد شوق تھا گنی کے چاولوں میں شکر ملا کر کھاتے انھیں کو دیکھا مزاج میں اضطراب ہمیشہ کا تھا لکھتے وقت بھی اعضا وجوارح متحرک ہو ہو جاتے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک ڈاڑھ گر گئی فرمایا بھائی ایک حصہ بہ جسم خاکی کا ختم ہوا میں نے عرض کیا کہ بنوا لیجئے راضی ہو گئے جب ٹہلنے نکلے تو ڈاکٹر کرم حسین بہتوں کو یاد ہوں گے جنکی دوکان امین آباد کے چوراہے پر تھی اور بڑے جوشیلے مسلمان تھے ان کے یہاں پہونچے ڈاکٹر صاحب فخر کے ساتھ خدمت کو مستعد ہو گئے چربہ لیا دوسرے دن شام کو دانت تیار تھا اس کو نصب کر دیا ٹہلنے چلے گئے، بعد خلش رہی اور خلش تو ہوتی ہی ہے غرض گھر پہونچتے پہونچتے اس کو نکال کر الماری میں ڈال دیا اور فرمایا بھائی یہ دوسری کون مول لے اصل نقل میں بڑا فرق ہے مگر اسی شخص کی ہمت کی داد دیجئے کہ جب پاؤں کٹا تو مصنوعی پاؤں اور اسکی بندشوں کو برداشت کر کے تمام قومی تحریکوں میں حصہ لیتے دور دراز کے سفر کرتے اور گھنٹوں کھڑے کھڑے تقریریں فرماتے علامہ کو میرے ساتھ بڑی محبت اور خصوصیت تھی میں انکی صحبتوں سے بہت کم جدا ہوتا خواہ علماء کا مجمع ہوتا یا بے تکلف احباب او طلبہ کا جمگھٹ اسی وجہ سے انکے ہر قسم کے حالات پر میری نظر رہی جیسے وہ آئے تھے پھر آزاد ہو کر ندوہ کا پبلک کام کر کے اس کے مشکلات دیکھکر رفتار زمانہ پہچانکر انکے اگلے خیالات میں جو جو انقلاب اور جن جن وجوہ سے وہ پیدا ہوئے سب آئینے کی طرح میرے سامنے ہیں اپنی اپنی جگہ انکی جھلک نظر آتی جائیگی اور جو کچھ لکھوں گا وہ صاف صاف بلا رو رعایت۔ انسان ایک تغیر پذیر مخلوق ہے اور تغیرات عالم سے جو سمجھکر متغیر ہو وہی کامل انسان ہے۔ ہوا سے لڑنا سرہنگی ہے انسانیت یا شجاعت نہیں ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک دارالعلوم قدیم رنگ کے جدت پسند بزرگوں کے ہاتھوں میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ تقشف اور قدامت پرستی کے اثرات کافی موجود تھے۔ مگر ہم سب نوجوان تھے جوانی کے ولولوں سے بھرے حدیث پڑھتے تو تقلید کے جامے سے باہر ہو جاتے علم کلام دیکھتے تو عقلیت

کی طرف رجحان زیادہ ہوجاتا ادب کے متعلق باوجود ادبی قابلیت کے لطافت شعری کا لطف اٹھاتے مگر تنقید سے نابلد تھے تاریخ تو ایک ادبی مشغلہ سمجھتے نفح الطیب اس لئے دیکھتے کہ اس کے کثیر اشعار کا لطف اٹھائیں مگر کبھی یہ خیال اپنا یا اٹھا لیتے تو اس کے شعر پہلے پڑھ لیتے ابن خلکان میں مشہور ادیبوں کے حالات اور کلام کا مزہ لیتے مگر تاریخ پر نظر مورخانہ نہ کرتے ابن خلدون نے سب سے پہلے میری آنکھیں کھولیں جسلم کا قاعدہ ہے کہ جب طالب علم کی گرہ کا کچھ ہو تو یہ خوب رہتا ہے ورنہ بزاخفش دیکھو لعد رسول اور اپنے شیوخ سے ہزاروں کی تعداد میں نکلتے ہیں مگر اس میں اخفش کی کیا خطا ہے!

اب جب ہمارے علامہ دارالعلوم میں قدم رنجہ فرما چکے تو میری وہ تکلیف جو ہمارے مولانا کے تشریف لیجانے سے تھی رفع ہونے لگی اور نعم البدل پاکر یہ پژمردہ دل شباب علم کے ولولوں سے لبریز ہوکر چھلکنے لگا ہر مشکل کا حل سامنے تھا ہر گتھی سلجھانے والی انگلیاں چلنے لگتی تھیں نہ دے ہوئے عقدے ایک ادنیٰ سے اشارہ میں کھل کھل جاتے اس منزل علم کے لئے ایسے ہی رہبر کی ضرورت تھی مجھکو حیدرآباد سے لکھ چکے تھے میں آؤں تو تمھاری تعلیم اپنے ہاتھ میں لوں۔ مینے حماسہ شروع کیا تھا فرمایا کہ بھائی جب ہم حماسہ پڑھتے تھے اور اس کے بعد بھی مدتوں یہ معمول رہا کہ فجر کو تلاوت کے بعد اس کا بھی ایک دور کرلیتے تھے شاگرد نے استاد کی یہ بات گرہ باندھی اور اس پر عمل شروع کردیا یہ پہلا سبق تھا جو علامہ سے مجھکو ملا۔

اب دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی کی تعلیم لازمی ہوجاتی ہے جس کو یہاں کے اہل حل و عقد اختیاری کئے ہوئے تھے اور ایک حد تک وہ حق بجانب بھی تھے کیونکہ اب بھی ایسے طلبہ آجاتے تھے جن کے والدین انگریزی پڑھانا مکروہ سمجھتے تھے لیکن پتا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بہت سے طلبہ یاد جہ بھی دم چراتے تھے پڑھنے والے چند ہی طلبہ تھے اور مدرسین دو دو۔

اب نصاب کی کایا پلٹ تنقیدی اور تاریخی پہلو کو لئے ہوتی ہے مجھکو یہ بتانا ہے کہ اب

ہم نے کیا سیکھنا شروع کیا فن شعر سے مجھکو ہمیشہ دلچسپی تھی لہذا اب جب ہم کو نقد الشعر ابن قدامہ پڑھائی گئی تو کتنہ نظر کیا سے کیا ہوگیا۔ یہ کتاب مصر کے مطبع الجوائب میں صاف ستھرے ٹائپ اور اچھے کاغذ پر چھپی تھی مگر جیسا عموماً مصری مطبوعات میں ہوتا ہے بیا ز خوشخط دبیا ر غلط۔ یہ زحمت جو پیش آئی تو ہمارے علامہ کو اس پر مستقل محنت کرنا پڑی سیکڑوں شعرا کا کلام اور وہ بھی متفرق اس کی صحت کے لئے ہمارے استاد مولوی سید علی صاحب قبلہ اور خود علامہ دونوں کو بڑی جانکاہی کرنا اور جوئے شیر لانا پڑا یہ طریقہ جستجو خود سبق آموز تھا الحمد للہ اس وقت جو محنت ہو چکی تھی وہ بہت کام آئی میں نے اپنے صوبے کے فاضل لوب میں جب اس کو رکھنا چاہا تو اسی نسخہ کو کچھ مزید صحت کے بعد مولانا سید علی صاحب کی تعلیقات کے ساتھ طبع کرادیا اس کتاب سے فن بدیع کی حقیقت ہی اکیلی نہیں کھلی بلکہ اشعار کی تنقید ہر پہلو سے کرنے کا سلیقہ آگیا عرب جاہلیت کی نازک خیالی کے سیکڑوں نمونے پیش ہو سکتے ہیں مگر حادرہ کا ایک شعر اسی کتاب میں پڑھا ہوا تفنن طبع کے لئے پیشکش ہے۔

جری بینامنا رسیس یزیدنا
سقاما اذا ما استقیۃ المسامع

اب نوبت فن بلاغت کی طرف توجہ کی آئی ادبیات تو ختم کر لئے تھے مطول بحث ماانا قلت تک چاٹ چکے تھے شیخ عبد القاہر کے نام آشنا تھے قال الشیخ فی دلائل الاعجاز بھی پڑھا تھا مگر اب علامہ نے دلائل الاعجاز پڑھانا چاہی مجھکو اول چند سبق خود پڑھائے غنیمت یہ تھا کہ امام رازی کی نہایت الایجاز جو اس کا خلاصہ ہے پہلے پڑھ چکے تھے اس لئے مفہوم ذہن نشیں ہو چکا تھا ورنہ یہ بے قابو پانی اپنی رو میں کہیں کنارے سے ٹکراتا اور پھر نہ جانے کدھر کو نکل جاتا عبارت وہ جو دیکھنے میں ہیرے کی آب کبھی نظر پڑھی اور کبھی ڈوب گئی۔ جو اس کی نقل اتارے تو بات کا بتنگڑ بنا نا سیکھے ایک ہی بات کہتے ہیں۔ اور کہ نہیں سکتے دوسرے حصہ اسرار البلاغت میں جہاں اشعار پر کچھ لکھا ہے وہ صاحب ذوق کا مقام ہے

ایسے ویسے کی سمجھ سے باہر ہے غرض اس کے اسباق میں علامہ نے ایک ایک لفظ کا حسن کھول کھول کر بتایا اور واقعی بڑا لطف آیا اس درمیان میں ان کو باہر جانا پڑا وہ سلسلہ افسوس ہے کہ رک گیا پھر تو کتاب اپنے استاد سے ختم کر ہی لی۔

اعجاز القرآن پہلے دیکھے ایک ہی کتاب ابوبکر باقلانی کی دستیاب تھی ان کے مذاہب شرح مواقف کے مطالعہ میں علم کلام کے متعلق پڑھے تھے یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت ادیب بھی تھے جیسے کچھ بے ظاہر ہے پڑھی بھی مولانا حفیظ اللہ صاحب سے جو ایک بڑے ادیب کے شاگرد تھے مگر خود ادیب نہ تھے غرض اس کو پڑھ کر مایوسی ہوئی مگر شکر ہے کہ بلاغت کی دوسری کتابوں اور علامہ حمید الدین مرحوم کی رہبری کا کچھ مذاق پیدا ہوگیا الندوہ میں بعد کو ایک سلسلہ مضامین میں میں نے اعجاز القرآن کا خاکہ بنا دیا ہے اب کوئی صاحب قلم اس کو بھرے۔ وقت یہ ہے کہ وحی کلامی یا حسن ذاتی کا مقابلہ تکلفات سے بھرے کلاموں سے قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے کا مضمون ہے۔ یہ چیز ذوق کی ہے مذاق سلیم اور عقل سلیم دونوں درکار ہیں جس طرح کوئی اچھا شعر ارسطو کی بوطیقا کے قواعد سے بالا ہے اسی طرح خدا کا کلام اگرچہ وہ ہماری ہی زبان کے بنے الفاظ میں ہو کسی بلاغت کے قواعد کا پابند نہیں ہو سکتا انسانوں کے کلاموں کے لئے تو نحویوں نے مستثنیات اور خلاف کی ایک لمبی فہرست بنا رکھی ہے مگر یہ تو کلام ربانی ہے۔ گیٹے نے بلا تشبیہ عورت کے متعلق لکھا ہے۔

SIT SILENT & LET ME WORSHIP YOU

پھر تلاوت قرآن تو ہماری عبادت ہے اور اس عبادت کا اصل نہ فہم سلیقہ ہے اس لئے خلوص اور خلوذہن کے ساتھ اگر زبان پر عبود ہے تو طبع سلیم لیکر بیٹھئے اور حسن کا جو رخ نظر آجائے اس کا لطف اٹھایئے اور جہاں بن پڑے اور زبان سے ادا ہوسکے تو اس کو ادا کیجئے یہی صحیح راستہ اعجاز القرآن تک پہونچنے کا ہے نہ کہ اس کا امراؤ القیس طرفہ اور لبید سے مقابلہ یہ تو جواب الزامی ہوا۔ نہ کہ اثبات

یہ رنگ تھوڑا بہت شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ اور پھر شیخ محی الدین ابن عربی کو نصیب ہوا ہے نسبتی لوگ تھے وما ینطق عن الہویٰ سے مناسبت تھی۔ جو وارد ہوا وہ کہہ ڈالا۔ فرق یہ ہے کہ شیخ عبد القاہر جرجانی نے بھی صفحے کے صفحے ایک آیت پر رنگے ہیں زبان کی لطافت جو کچھ بھی ہو ادل تو اس کو سمیٹ نہیں سکے دوسرے حال قلبی نہ تھا اس لئے کیف ہوتا ہے مگر وجد نہیں آتا خود ان کا کلام لکھے اللنا نا میں کلام یدخل فی اذنك قبل اذنك کا مصداق نہیں ہے۔ علامہ ابن خلدون نے عربی مبین کے ذوق کسبی کے پرداخت کے لئے جو باتیں بتائی ہیں پہلے ان کو پوری کرلو پھر اسطرف متوجہ ہو تو کچھ سمجھ رہبری کرے آجکل تو جس کو عربیت میں شُدبد درک ہوا اسے "ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں" کے اصول پر قرآن پاک پر خامہ فرسائی شروع کردی لیصائر کے بے بصیرت تو پیدا کرلو۔ ہمارے علامہ کو کسی آیت قرآنی کی بلاغت پر واقعی وجد آجاتا تھا اور پھر اس کے حسن کو بیان کرتے بعض مرتبہ ہندی دوہے پڑھ پڑھ کر اس کی مثالوں کو ذہن نشین کرکے اس حسن کی توضیح کرتے تھے مگر اپنے شاگرد اور عزیز علامہ فراہی کی تحقیق اور عمیق نظر کے ہمیشہ معترف رہتے ان دونوں بھائیوں کے مکالمے جن کو سننے کا اکثر اتفاق ہوا ہے بڑے علم آموز اور وسعت نظر پیدا کرنے والے ہوتے مگر فرق یہ تھا کہ علامہ ارسطو کی بوطیقا اور قواعد معانی وبلاغت سے گھرے تھے اور علامہ فراہی ان گرفتوں سے نکل چکے تھے ان میں قرآن فہمی کا ایک حسن باطنی پیدا ہوگیا تھا۔ انھیں مکالموں کا نتیجہ ہے کہ شعر العجم میں شعر کی حقیقت پر جو بحث ہے وہ اس صدی میں شاعری پر بہترین مقالہ ہے۔

تہذیب الکلام اور شرح عقاید نسفی پڑھ کر علم کلام کی لطافتوں سے محروم رہے۔ شرح مواقف شرح مقاصد بیشک علم کلام اور فلسفہ کا بھی ضمناً فتادی ہیں ہمارے مولنا نے ان کی چاٹ لگادی تھی ہم ان کو بہت پڑھتے تھے معتزلہ کی نہ تو کوئی کتاب ملی دیکھنے کو اور جو کچھ دیکھا وہ بروایت ثانیہ مگر ان سب نے قرآن پاک کو بالائے طاق پیچ کر رکھدیا ہے۔ اگرچہ امام رازی کی تفسیر قرآن پاک کی

کی خود تفسیر ہے عقاید و کلام فلسفہ تفسیر کا ایک امتداد ہے گر عقاید کا ثبوت یا دلہ قرآنیہ اسمیں
بھی خاص پرواز کا نہیں ہے۔ امام غزالی نے مقاصد الفلاسفہ اور تفتازانی نے اس کی شرح
لکھکر یونانی فلسفہ کا ملتوبہ اپنی سمجھ کے مطابق پیش کر دیا ہے لیکن جو کچھ زور ہے وہ نفی پر خرچ ہوگیا اثبات
کے ڈھیلے پڑ گئے ہیں تاہم اس لحاظ سے امام غزالی کی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد بہتر ہے ہم نے اب
اس کو پڑھا اس سے اشاعرہ کا نکتہ نظر صاف صاف سامنے آگیا اس کے بعد ابن رشد کی کشف الادلہ
پڑھ کر اس تکلم کوشش کی غلطی اور یونانی فلسفہ کی غلط ترجمانی معلوم ہوگئی اور علم کلام کی نئی ترتیب کا پرواز
سمجھ میں آگیا امام غزالی نے مضنون بہ میں جو کچھ لکھا ہے یا الجام العوام اور جواہر القرآن میں وہ سب
تصوف کا پرواز لئے گر علم کلام کی طلب کچھ اور چاہتی ہے ابن رشد نے اس جہت کو بھی کشف الادلہ میں
مجروح کر دیا ہے غرض یہ سب پڑھ کر اب اشکال سے نکلنے کی ترکیب علامہ کی رہبری اور علامہ فراہی
کی توضیحات کی بدولت سمجھ میں آگئی جو الحمد اللہ ہمیشہ قائم رہی اور جب مغربی فلسفہ دیکھا اور بہت
دیکھا اور برگسن سے فلسفی کی گاڑی رکتے دیکھی تو اس امر کی قدر و منزلت دل میں اور زیادہ ہوگئی ہر مسئلہ کا
تشفی بخش جواب اور معاملہ کا تسکین وہی ما ینطق عن الھوی ہی سے ممکن ہے قرآن ظاہری کی وسعت اور نزاکت معنی کو
تو دیکھئے یہی صحیح علم کلام ہے جس کو ہمارے دوست نے سیرۃ النبی کی جلدوں میں پیش کیا ہے۔ علم کلام اور حکماء اسلام
کے فلسفہ کا اب بھی مجھکو شوق ہے اور جب کوئی نئی چیز سامنے آجاتی ہے تو ضرور پڑھتا ہوں مگر کیوں اس لئے کانٹ
اسپائنوزا حق گو برگسن کے مقابلہ میں اس میں حق کا پہلو زیادہ ہے اور اس کو یونانیت کا غلام ٹھہرانا اور اصل ہماری
کوتاہ نظری ہے اسکو تو عمرانی حوالوں سے دیکھکر ڈیکارٹ دیکارت بنا حجۃ اللہ البالغہ کے وہیں نے شریعت کے
نکات ہی نہیں بتلائے بلکہ میری سمجھ میں یہ بات بھی سے جم گئی کہ دنیاداری مطابق دین ہی اصل دینداری ہے
میں نے اس زمانہ میں عبدالوہاب شعرانی کی کتاب الیواقیت پڑھی تھی جو تصوف اور علم کلام کی تطبیق پہ پہلی
کوشش ہے اگر اس پرواز پر علم کلام لکھا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا جس گھر میں ہم رہتے تھے علامہ کے تشریف

لانے سے بہت پہلے اس کے ایک حصہ میں جلسۂ تہذیب اور لائل سوشل کلب جواب رفاہ عام بارہ دری میں ہے اٹھ آیا تھا ہمارے بھائی صاحب قبلہ جناب منشی مظہر علی صاحب ممبر جنرل اسمبلی اس کے بڑے سرگرم ممبر تھے اور مولوی ظہور احمد صاحب وکیل جو سندہ کے بڑے خدمت گذار ہیں اس کے سکریٹری تھے۔ اس لئے اس کلب کے دروازے میرے لئے کھلے تھے۔ بیڈمنٹن وہاں کھیلا تاش کے کھیل وہاں دیکھنا اور جدید تہذیب کے بروردہ ایک لڑکے کے لئے جو کچھ چاہئے تھا وہ سب وہاں جمع تھا اس ذکر کی وجہ یہ ہے کہ جلسہ تہذیب کا کتب خانہ ایک خاص چیز تھی کتابیں فارسی کی کافی تھوڑی عربی کی تھیں اور اب تو انگریزی کا زور تھا اور چھٹ منزل کے بعد انگریزی کا کتب خانہ وہاں اچھا تھا لیکن اس کا اردو کا سرمایہ بہت نایاب تھا تھا نے اب باقی بھی ہے کہ نہیں۔ قدیم و جدید فسانے ناول دواوین کا بڑا ذخیرہ تھا مگر وہاں اردو کی علمی سرمایہ میں وہ کتابیں ملیں جنکو دیکھکر حیرت ہوتی تھی سنہ شمسیہ اس زمانہ میں پڑھا تھا مگر اردو کی کتابیں ناول و فسانے خوب میں نے پڑھے طلسم ہوشربا، داس کے ساتھ کے ادنٰی ٹکڑے بوستان خیال اسی زمانہ میں پڑھیں تھیں۔

سرسید کی تمام تصانیف میرے بھائی منشی واحد علی صاحب قبلہ بسمل کے پاس تھیں تہذیب الاخلاق رسالہ حسن حیدرآباد کے فائل اور معارف (قدیم) یہ سب ایک ایک کرکے پڑھ ڈالے تھے اردو کے سرمایہ پر کافی عبور ہوگیا تھا۔ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری پر تنقید گھروں میں ہوتی تھی چچا سجاد حسین مرحوم کی صحبت تھی انکے فقرے اور کتاب پر نکتہ چینی ہمیشہ یاد رہی اگرچہ اب میرے خیالات میں انقلاب ہو چکا ہے حالی کی حقیقی عزت دل میں ہے اور انکی ہستی ہی ایسی تھی مینے علامہ کو ہر ایک پر نکتہ چینی کرتے سنا ہے مگر حالی صاحب کی جب کی تو تعریف ہی کی اگرچہ بعض عالمانہ اختلافات مقدمہ سے انکو بھی تھے تذکرہ گلشن ہند مولفہ لطف کا مقدمہ تو پڑھا ہی ہوگا اس سے اس تذکرے کے پانے پر حال معلوم ہوگیا ہوگا۔ علامہ جب دکن سے تشریف لائے تو انکی بیاض میں چند اشعار میر اثر دہلوی کی مثنوی کے درج تھے اس کو دیکھکر یہ بات یاد آگئی کہ حضرت حالی نے مرزا شوق کی مثنوی کے متعلق لکھدیا ہے وہ اثر کی مثنوی کا تتبع ہے رنگ لکھنویت جوش ملیح [illegible]ٹ میں نے

۱، دوسرے مُعلّیٰ میں ایک مضمون لکھ مارا اور اپنے خیال میں حالی صاحب کی اچھی گزنت کی اب تو یاد نہیں ہے کہ کیسا لکھا تھا مگر اتر کا ایک شعر یاد ہے اس سے اندازہ کیجئے۔

ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

اتفاق سے ایک مرتبہ جناب حالی لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے بھانجے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرے میں انکی خدمت میں حاضر ہوا ہمارے دوست بھی ساتھ تھے۔ میں بڑا ہی منفعل اپنی اس حرکت پر ہوا جب انھوں نے فرمایا کہ حضرت واقعی آپ نے ٹھیک لکھا میری نظر وہاں تک نہیں پہونچی تھی اس کو کہتے ہیں انصاف اور انکسار!

مشہور ہے کہ لکھنؤ میں معمار کے ہاتھ سے جو اینٹ گرتی ہے وہ بھی بحر و میں الاپتی گرتی ہے بچہ بچہ موزونیت سے بھرا ہے ایک ایک رگ پھڑکتی ہے جنھوں نے کھنڈر وہاں کے سنے ہیں وہ جانتے ہیں ایسے دائرے میں رہ کر سوال ہوتا ہے کہ میں نے شعر کہنا کیوں نہ شغل کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے عم زاد بھائی خدا بخشے منشی احمد علی صاحب مرحوم جن کا ذکر کہیں آگے آئے گا انھوں نے مجھکو سمجھا دیا تھا کہ یہ دودھ ہے ذہن کے سنوارنے کا شاعری ذہن سنوار کر زیب دیتی ہے یا پھر بیکاری میں بگاڑ کر لاتی ہے اسکی ہمیشہ تائید فرمائی صاحب نے بھی کی عزیز لکھنوی کی مثال سامنے تھی انکی تعلیم ادھوری رہ گئی وہ تو شاعر تھا اور میں اگر بنتا بھی تو تشاعر الحمدللہ تضیع اوقات سے بچ گیا مگر اب کچھ مضایقہ نہیں کبھی کبھی دل کے بہلانیکو کچھ فکر کر لیتا ہوں۔

نوٹ الندوہ عموماً ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہو کر روانہ کر دیا جاتا ہے نہ پہونچنے کی صورت میں اسی مہینہ کی آخری تاریخ تک دفتر میں اطلاع بھیجنے پر دوبارہ رسالہ روانہ کیا جا سکے گا ورنہ قیمت رسالہ روانہ کرنے پر تعمیل ہو سکے گی۔ "منیجر"

باسمہٖ

نقد و نظر

بشریٰ | مصنفہ مولانا عنایت رسول صاحب مرحوم چریاکوٹی۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر، صفحات ۴۴۲ ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی شروانی پرنٹنگ پریس علی گڈھ قیمت درج نہیں اہل علم کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی جاتی ہے۔

مولانا محمد فاروق صاحب مرحوم چریاکوٹی استاذ علامہ شبلی نعمانی و سابق صدر المدرسین دار العلوم ندوۃ العلماء سے قارئین الندوہ بخوبی واقف ہیں مولانا عنایت رسول صاحب انھیں کے بڑے بھائی تھے مرحوم ہندوستان میں عبرانی زبان کے بے مثل ماہر تھے اس کے ساتھ انگریزی کلدی اور یونانی زبانوں سے بھی آگاہ تھے دینی علوم میں بھی بڑا تجربہ تھا حدیث میں صرف ایک واسطہ سے حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے مرحوم نے متعدد کتابیں تالیف و تصنیف کیں لیکن زیر نظر کتاب پر انھیں بہت ناز تھا فرمایا کرتے تھے کہ "یہ کتاب قیامت میں میری بخشائش کے لئے کافی ہے" اس کتاب میں توریت و انجیل کی وہ تمام بشارتیں جمع کر دی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے متعلق مختلف صحف میں درج ہیں اردو ترجمہ کے ساتھ اصل عبرانی عبارت بھی نقل کی ہے اور اس پر پوری وسعت نظر سے بحث کی ہے سلسلہ بحث میں کہیں کہیں بعض مشہور و مسلم اسلامی مسائل بھی آگئے ہیں جن کے بارے میں مصنف نے جمہور اہل اسلام کی رائے سے اختلاف کیا ہے جسکی طرف جناب مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نے اپنے دیباچہ میں اشارہ کر دیا ہے لیکن یہ کتاب کا اصل موضوع نہیں ہے اصلی عنوان بحث وہ بشارتیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صحف سابقہ میں مرقوم ہیں امید کہ اہل علم کے حلقوں میں کتاب دلچسپی سے پڑھی جائیگی۔

اسیر الحثیث | مصنفہ ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی پروفیسر اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی مطبوعہ

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کاغذ بہتر ٹائپ خوشنما صفحات ۵۵

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں مذکورہ بالا کتاب کا ضمناً ذکر آچکا ہے جولائی ۱۹۳۵ء میں دائرۃ المعارف کی جانب سے مختلف علمی مسائل پر بحث وگفتگو کی غرض سے اہل علم کا ایک اجتماع حیدرآباد میں ہوا تھا اس موقع پر ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی نے تدوین حدیث کی تاریخ پر ایک مقالہ پڑھا تھا جو اسی موضوع پر ان کی انگریزی تالیف کے ایک باب کا اردو میں خلاصہ تھا الیسر الحثیث اسی خطبہ کا عربی ترجمہ ہے مصنف نے اسے مختلف عنوانوں پر تقسیم کیا ہے اور ہر عنوان کے ماتحت قدیم وجدید ماخذوں کی مدد سے بیش قیمت معلومات فراہم کئے ہیں مصنف کی اصل انگریزی کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا طرز بیان کیا ہے لیکن زیر نظر کتاب میں اختصار سے کافی کام لیا گیا ہے ضرورت تھی کہ واقعات کے بیان میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جاتا اس موضوع پر اردو میں متعدد اہل علم نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں معلوم نہیں یہ مضامین صاحب موصوف کے پیش نظر تھے یا نہیں لیکن کتاب میں ان مضامین کا کوئی اثر نظر نہیں آتا خطبات مدارس میں تدوین حدیث کے ابتدائی دور کے متعلق بہت کافی مواد فراہم کیا گیا ہے معارف الندوہ وغیرہ رسائل میں بھی اس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں جو غالباً ڈاکٹر صاحب موصوف کے علم میں ہوں گے حدیث کے ابتدائی تحریری سرمایہ کے متعلق گذشتہ تیس ۳۰ چالیس ۴۰ برس سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں انکی کوئی اصلیت نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک ہی میں روایتیں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں یہی تحریری مجموعے تھے جو بعد کو مسانید وجوامع کی شکل میں مرتب ہوئے ان آخری کتابوں کی جامعیت ترتیب وتہذیب اور ان سے استفادہ کی سہولتوں کی بنا پر ابتدائی مجموعوں کا استعمال کم ہوتا گیا اور وہ رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے کچھ کچھ انقلابات زمانہ کی نذر ہو گئے اور کچھ مختلف گوشوں میں دب دبا کر رہ گئے یہ حقیقت اب روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے الندوہ میں کئی مہینے سے اس موضوع پر بحث ہو رہی ہے اس لئے اس جگہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

محمد رسول اللہ | مصنفہ جناب مقبول احمد صاحب سیوہاروی کتابت بہتر اور جلی کاغذ اچھا طباعت عمدہ صفحات ۱۶۰ تقطیع چھوٹی قیمت مجلد عمر طلبہ کے لئے خاص رعایت ملنے کا پتہ اسلامی کتاب گھر سیوہارہ ضلع بجنور یا مکتبہ جامعہ دہلی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں چھوٹے بچوں اور کم پڑھے لکھے مردوں اور عورتوں کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، عبارت بہت آسان، واقعات سادہ، طرز بیان دلچسپ اس کے ساتھ عرب اور دنیا کا نقشہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، غار حرا، غار ثور کوہ احد وغیرہ تاریخی ماثر کے فوٹو بھی شامل ہیں کتاب اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہے۔

ناموران سیاست | مصنفہ جناب عبد المجیب صاحب ندوی بی اے آنرز و جناب محمد نسیم احمد صاحب کاغذ کتابت طباعت اچھی قیمت ۶ر ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

آجکل اخبارات میں دنیا کے مختلف مشاہیر سیاست کے نام روزمرہ آتے رہتے ہیں جن سے واقفیت کے بغیر حالات پورے طور پر سمجھ میں نہیں آتے ہیں عبد المجیب صاحب اور نسیم صاحب مستحق شکریہ ہیں کہ انھوں نے ہر ملک کے مشہور اور سربرآوردہ ارکان حکومت اور ارباب سیاست کے حالات مختلف انگریزی اور عربی ماخذوں سے اختصار گر جامعیت کے ساتھ جمع کر دئے ہیں یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ ہندوستان کے مشاہیر سیاست وحکومت کے حالات پر مشتمل ہوگا امید ہے کہ ملک میں یہ کتاب مقبول ہوگی اور مصنفین کی یہ کوشش پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

ہندوستان اور مسئلہ امارت | مصنفہ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی۔ کاغذ کتابت طباعت اچھی قیمت ۲ر صفحات ۱۲۸ ملنے کا پتہ خانقاہ رحمانیہ مونگیر

مسئلہ امارت کی اہمیت محتاج بیان نہیں اسلام کی نظر میں اسکی اس درجہ اہمیت ہے کہ وہ اس کے بغیر صحیح اسلامی زندگی کا تصور نہیں کرتا اور اس حالت کی موت کو جاہلیت کی موت قرار دیتا ہے سفر وحضر ہر جگہ امارت

کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن افسوس کہ اتنی تاکیدوں کے باوجود اس مسئلہ کی جانب سے سخت غفلت و اعراض برتا جا رہا ہے۔ زیر نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو فراموش شدہ سبق یاد دلایا جائے کتاب میں ہندوستان کے مخصوص حالات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور ان حالات کے لئے بھی اسلامی اصول کی روشنی میں راہ دکھائی گئی ہے۔ (اللّٰہ ق)

عربی کا معلم | مؤلفہ مولوی عبد الستار صاحب۔ ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں غالباً شرف الدین الکتبی اولادہ بھنڈی بازار ۲۳۲ بمبئی

ہندوستان میں ایک عرصہ سے عربی زبان کو سہل طریقہ پر کم از کم مدت میں حاصل کرنے کے لئے متعدد کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں لیکن اس وقت تک کوئی ایسی کتاب جو جامعیت کے ساتھ وقت کی ضرورت کو پورا کر سکے نظر سے نہیں گزری، مولانا عبد الستار صاحب ہندوستانی طلبہ و معلمین کے شکریہ و امتنان کے مستحق ہیں کہ موصوف نے ایک بہت مفید سہل اور جامع کتاب لکھ کر یہ کمی پوری کردی۔

عربی صرف و نحو کا اشتغال ہندوستان میں ایک مسلّم مسئلہ ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس نے اب تک زبان کو زبان کی حیثیت سے تعلیم دینے کی طرف توجہ نہیں کی، زبان کے خشک قواعد و اصول بلا مشق و طریق کے پڑھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو قواعد نحو و صرف کے حصول میں الجھن پیدا ہوتی ہے مصر و شام میں نئی ریڈریں تیار کی گئی ہیں جن میں تمرین پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے مختلف مثالوں سے نحو و صرف کے اصول ذہن نشین کرائے جاتے ہیں جس سے طلبہ کے دماغ پر قواعد کی خشکی کم ہو جاتی ہے مولوی عبد الستار صاحب نے اسی میں قواعد نحو و صرف کو قابلیت کیساتھ مرتب کیا ہے نحو و صرف کے اکثر اصول آگئے ہیں ادبی جملے بھی لیاقت بڑھانے میں معین ہوتے ہیں چار سال کے ذاتی تجربہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کتاب افادیت کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے۔ ایک سال کے عرصہ میں اس کتاب کے ذریعہ عربی زبان حاصل کیجا سکتی ہے۔ البتہ جہاں مثال کے قواعد بیان کئے گئے وہاں کچھ زیادہ الجھاؤ ہے جسمیں مصری کتابوں کو پیش نظر رکھنا زیادہ مناسب ہے کتاب فی الجملہ اس قابل ہے کہ عربی مدارس اور انگریزی اسکول میں داخل کیجائے تاکہ طلبہ کم از کم مدت میں زبان کو سیکھ سکیں۔ (م - ن)

حالات ندوہ

۱۰ مئی سے دارالعلوم میں گرمی کی تعطیل ہے جسکا سلسلہ آخر جون تک رہیگا انشاء اللہ یکم جولائی کو دارالعلوم پھر کھلے گا مدرسہ کھلتے ہی حسب معمول تعلیم شروع ہو جائیگی امید ہے کہ طلبہ ٹھیک وقت پر پہونچ جائینگے تاکہ انکا نقصان نہ ہو۔

آج کل بیرون ہند یا ہندوستان کے دور دراز صوبوں کے طلبہ کے علاوہ باقی سب اپنے اپنے وطن چلے گئے ہیں تعطیل کے زمانہ میں عموماً مولوی نورالحسن صاحب نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن ابکی وہ اپنے بعض اعزہ کی ملاقات کی غرض سے حیدرآباد تشریف لے گئے ہیں اس لئے اس مرتبہ جناب ماسٹر عبدالسمیع صاحب نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں انکی امداد و اعانت کے لئے سابق نقیب عام (جنرل مانیٹر) محمد نواب خاں متعلم دارالعلوم مقرر ہوئے ہیں مولانا محمد عمران خاں صاحب انچارج مہتمم دارالعلوم بھی اس مرتبہ مکان تشریف نہیں لے گئے ہیں بلکہ دارالعلوم ہی میں مقیم ہیں۔

تعطیل کی وجہ سے دارالعلوم اور اس سے متعلق سب شعبے بند ہیں البتہ الندوہ معین الندوہ اور کتب خانہ میں کام ہو رہا ہے الندوہ کے کاموں کی وجہ سے اس کے اسسٹنٹ منیجر جناب افتخار احمد صاحب قدوائی زیادہ تر ندوہ ہی میں رہتے ہیں کتب خانہ میں حسب معمول آج کل مولانا کلیم احمد صاحب کتابوں کا جائزہ لے رہے ہیں جو انشاء اللہ وسط جون تک ختم ہو جائے گا۔

تعطیل گرما سے پہلے ششماہی امتحان ہوا جس کا سلسلہ چھ دن تک جاری رہا ۱۲ مئی کو نتیجہ کا اعلان ہوا اس مرتبہ کامیاب طلبہ کا تناسب توقع سے بڑھ کر رہا تفصیلی نتیجہ طلبہ کے والدین اور سرپرستوں کو

بھیج دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کی تعلیمی رفتار سے باخبر رہ سکیں۔

مئی میں دارالاصلاح کی پہلی ششماہی ختم ہو گئی اس موقع پر حسب دستور تمام شعبوں کا جائزہ لیا گیا آجکل تعطیل میں انجمن کے تمام شعبے بند ہیں صرف دارالاخبار کھلا ہوا ہے تاکہ جو طلبہ دارالاقامہ میں مقیم ہیں وہ واقعات عالم سے باخبر رہ سکیں۔

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں معین الندوہ کی مجلس منتظمہ کی کارروائی شائع ہو چکی ہے اس اجتماع میں منجملہ اور مسائل کے یہ بات بھی طے پائی تھی کہ خاص لکھنؤ میں معین الندوہ کے کام کو آگے بڑھایا جائے اس غرض سے مہتمم صاحب دارالعلوم کی سرکردگی میں ایک وفد مرتب ہوا تھا تاکہ اکابر شہر سے مل کر کام کی مناسب راہیں پیدا کرے لیکن دفعۃً لکھنؤ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مدح صحابہ کی تحریک پھر شروع ہو گئی جس نے شہر کی فضا میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے ان حالات میں وفد کا کام رک گیا ہے اور جب تک تمام معاملات قابل اطمینان طور پر طے نہیں پا جاتے کوئی دوسرا کام دشوار ہے۔

مولوی حامد علی صاحب ندوی ناظم معین الندوہ نے شروع مئی میں اودھ کے بعض قصبوں اور شہروں کا دورہ کیا آج کل پنجاب تشریف لے گئے ہیں اگر موقع ملا تو وہاں سے سرحد بھی جانے کا خیال ہے پشاور کے ندوی احباب معین الندوہ کے لئے عرصہ سے کام کر رہے ہیں چند مہینے ہوئے پنجاب میں مولوی محمد حنیف صاحب ندوی نے بھی کام شروع کیا ہے اپریل میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ لاہور تشریف لے گئے تھے ان کی توجہ سے کام کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی ہمیں امید ہے کہ ناظم صاحب معین الندوہ کے اس سفر سے ندوہ کے ہمدردوں اور دوستوں کی توجہ میں اضافہ ہوگا اور معینین ندوہ کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔

تذکرۂ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

ساڑھے تین سو عنوانوں میں سے صرف ڈیڑھ سو عنوان یہ ہیں

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ کی تاثرات
ارشاد گرامی: از حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ
ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا اور شاہ ولی اللہ رح
(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق)
شاہ صاحب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کی سرگزشت
(از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)
(اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں)
عرب داخل فاتحین اور انکا باہمی فرق
دسویں صدی ہجری سے پہلے اسلام کی عام حالت
اس دور کے مخلص مصلحین اور خدام دین
محمد تغلق اور خدمت دین
فیروز تغلق کی مساعی اصلاح
سکندر لودھی کی اصلاحات
دور ضلالت یا عہد اکبری
حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ
شیخ عبدالحق کی دینی خدمات
عالمگیر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد
امام ولی اللہ دہلوی کا ظہور

منصب تجدید کی حقیقت اور
تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہ رح کا مقام
(از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)
[اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں]
اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش،
جاہلیت کی اقسام اور جاہلی نظریات
اسلام کا نظریہ تمدن،
نبی کے کام کی نوعیت
جاہلیت کا حملہ
کار تجدید کی نوعیت اور اسکے چند شعبے
مجددین کے کارنامے
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تجدید دین
ائمہ اربعہ کا تجدیدی کارنامہ
امام غزالی کی مجددانہ مساعی
امام ابن تیمیہ کا جہاد تجدید
امام ربانی مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام
حضرت شاہ ولی اللہ کا کام اور پیغام
حضرت سید احمد اور شاہ اسمٰعیل شہید
تحریک جہاد کی ناکامی کے اسباب
عہد حاضر میں کار تجدید کی ضرورتیں

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا
ایک وفادار بندہ
(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ)
(یہ مقالہ ۳۰۰ صفحات پر ہے اور اس میں ایک سو
سے زیادہ ضمنی عنوانات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔)
الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ کی انتہا
عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کا زور
شاہ عبدالعزیز کے خونی آنسو
دلی کے خونی نقشے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت
سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک
مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم
نظریہ تقسیم ہند یا پاکستانی اسکیم
انسانوں کے پتلے
مرہٹہ تحریک کا نصب العین
دلی کے لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ
حضرت شاہ ولی اللہ رح کا ایک تاریخی خواب،
خواب کی تعبیر اور پانی پت کی تاریخی جنگ،
غازی ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست،
پھر مسلمانوں کی غفلت اور شاہ صاحب کی طرف سے
خطرہ کا مسلسل الارم
مسلمانوں کے مختلف طبقات کو شاہ صاحب کا
پیغام اور مفصل پروگرام
سلاطین اسلام سے شاہ صاحب کا خطاب
امراء اور ارکان دولت سے خطاب
فوجی سپاہیوں سے خطاب
اہل صنعت و حرفت سے خطاب
پیروں اور پیرزادوں سے خطاب
غلط کار علماء سے خطاب
واعظوں اور زاہدوں سے خطاب
عام امت مسلمہ سے جامع خطاب
ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیا
خواب غفلت کی سزا، انگریزوں کا تسلط
کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلائیو کا حملہ
میر جعفر وغیرہ کی غداری
سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل
مرشد آباد کا بازار جہاں لٹ گئے اور دلی کی کاوش
بنگال بہار اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام

حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے کام کا مختصر تعارف
(از مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" بریلی)
(اس مقالہ کے بعض عنوانات میں سے چند یہ ہیں:-)
شاہ صاحب کی خود نوشت سوانح حیات
شاہ صاحب کی جامعیت
شاہ صاحب بحیثیت مفسر قرآن
شاہ صاحب بحیثیت شارح حدیث
شاہ صاحب بحیثیت فقیہ اُمت
شاہ صاحب بحیثیت متکلم اسلام
شاہ صاحب بحیثیت امام سلوک و تصوف
شاہ صاحب اور علم حقائق و اسرار
شاہ صاحب بحیثیت ماہر اقتصادیات و معاشیات
شاہ صاحب اور امور سلطنت و حکومت
شاہ صاحب اور فلسفہ تشریع
شاہ صاحب کی اولین وصیت
شاہ صاحب کا فقہی مسلک
شاہ صاحب کی حنفیت اور آج کل کے حنفی
شاہ صاحب اور موجودہ جماعت اہل حدیث
ہر ولی اللہی کو آپکی آخری وصیت
قریباً ۱۵۰ عنوانوں میں سے یہ بطور نمونہ یہ سو عنوان
درج کیے گئے ہیں

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

... سو عنوانوں کے جو ڈیڑھ سو عنوان یہاں درج ہوئے ہیں انہی سے آپ نے اس کی جامعیت اور افادیت کا اندازہ فرما لیا ہوگا

... کے مطالعہ سے جو خاص چیزیں آپ کے علم میں آئینگی انکی ایک مختصر فہرست بطور خلاصہ یہ ہے۔

(۱) تجدید دین کی حقیقت، مقام مجددیت کی تشریح اور مجدد دین کے فرائض — تاریخ اسلام کے مشہور مجددین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، امام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے تجدیدی کارناموں پر تبصرہ اور دور حاضر میں تجدید دین و احیاء ملت کا نقشہ اور اس کی مزید ضرورتیں۔

(۲) ہندوستان میں اسلام کے داخلہ سے لیکر عہد عالمگیری تک کی پوری دینی تاریخ کہ کس زمانہ میں عرب کے اس مسافر پر یہاں کیا گذری اور کن سلاطین نے خدمت دین کا حق ادا کیا۔

(۳) غازی اورنگ زیب رحؒ سے لیکر سلطنت مغلیہ کے سقوط، انگریزوں کے تسلط اور پھر شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد تک کے حالات پر مفصل تبصرہ یعنی سکھ تحریک، مرہٹہ گردی، نادر شاہ درانی کی خونریزی اور غازی احمد شاہ ابدالی کی جنگ کے اسباب و اثرات اور ان تمام سیاسی واقعات سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تعلقات اور تاثرات اور ان انقلابات کے متعلق آپ کے الہامات

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ کی سوانح حیات ان کے آباؤ اجداد، اساتذہ و مشائخ، خاص تلامذہ اور اولاد امجاد کے حالات اور علمی و دینی خدمات۔

(۵) شاہ صاحب کی علمی و عرفانی خصوصیات قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں آپ کی تجدید اور فلسفہ تشریع کی تاسیس و تدوین۔

(۶) دور حاضر کے مسلمانوں کے لیئے لائحہ عمل اور صحیح اسلامی انقلاب کا ولی اللہی پروگرام

ضخامت و قیمت:- ۴۰۲ صفحات، سائز یہی جو آپ کے پیش نظر ہے، کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید چکنا قسم عام ۴۰ پونڈ، قیمت دو روپیہ (عہ) قسم خاص ۴۴ پونڈ، کاغذ نہایت اعلےٰ ڈھائی روپیہ (عہ) محصولڈاک قسم عام ۸ قسم خاص ۹ جلد کی قیمت مزید ہوگی جلد نہایت خوشنما ہے جس پر بڑا کتاب سنہری حروف میں نام کندہ ہے۔ ملنے کا پتہ کتبہ الفرقان بریلی

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۷

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

الحاد زار یورپ سے جو کفر و زندقہ اور بے دینی و لامذہبی کی صدائیں اُٹھ رہی ہیں گو ایک عرصہ تک وہ صدا بصحرا ثابت ہوئیں لیکن بالآخر ایک عالم انکی گونج سے پُر شور ہو گیا، پہلے ہم نے دیکھا کہ سواحل باسفورس اس سے متأثر ہو رہے ہیں، پھر وادی نیل میں جنبش نظر آئی، بالآخر وسط ایشیا میں اسکے بگولے اُٹھے اور آخر کار ہمالیہ کی بلند چوٹیوں سے گذر کر یہ سیلاب قدامت پسند ہندوستان میں بھی آ ہی گیا، جسنے ایک محشر اضطراب اور عالم دار و گیر برپا کر دیا۔

جو کچھ ہونا تھا ہوا، حالات کی پوری تفصیل آپکے سامنے ہے، لیکن کبھی آپنے اسپر بھی غور کیا کہ آخر اس الحاد عام کے اسباب کیا ہیں، دوسری قوموں اور جماعتوں کو چھوڑ دیجئے کہ آپ کا تعلق اُنسے نہیں ہے، لیکن وہ مذہب اسکی زد میں کیوں آ رہا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری پیغام ہے جو دینِ فطرت ہونیکا مدعی اور عالمگیر ہدایت کا دعویدار ہے جو کہتا ہے کہ میں دنیا کا دائمی نظام عمل ہوں اور سیری ہی پاس تشنہ کامان صداقت کو سامان سیرابی میسر آ سکتا ہے۔ آخر اس دینِ حق کی پرینی کی اسباب کیا ہیں؟

اسلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے تو پہلے مکہ کی مقدس سرزمین پر آپ اس دعوت حق کو بلند ہوتے دیکھیں گے اور جبل ابو قبیس سے داعی حق کے پُر اثر و مقدس وعظ سنیں گے جسکی دعوت حق ہر قسم کے اختلاف، زور و شور کی مخالفت، انتہائی جبر و تعدی اور طاقت و قوت کی پوری نمائش کے باوجود نہ صرف مکہ نہ صرف عرب نہ صرف جوار عرب بلکہ زمین کے چپہ چپہ اور کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ میں کامیاب ہو کر رہی، اسے نہ ابوجہل و ابولہب کی شرارتیں روک سکیں، نہ طائف و مکہ کے

رئیسوں کی سختیاں بند کر سکیں نہ یورپ و عرب کا بغض و عناد سد راہ ہو سکا نہ آہن پوش فوجیں، اور خون چکاں اسلحہ اسکی مخالفت میں کامیاب ہو سکے۔

اسکے بعد اصحاب باصفا کی جماعت نظر آئیگی جسنے ظاہری بے سروسامانی اور اسباب مادی کے فقدان کے باوجود مشرق سے مغرب تک دین الٰہی کا پرچم اُڑا دیا اور اسطرح کہ جسطرف نکل گئے دوستوں نے نہیں بلکہ دشمنوں نے فرشتۂ رحمت سمجھکر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جہاں چلے گئے پورا علاقہ انھیں کے رنگ میں رنگ گیا۔ جس جگہ بیٹھ گئے دین و مذہب، تہذیب و تمدن، لسان و آداب آناً فاناً بدل گئے۔ اور اسطرح کہ آج صدیاں گذر جانے کے بعد بھی انمیں کوئی تغیر نہ ہو سکا۔

لیکن سوال یہ ہو کہ جو دین کہ نکلا تھا بڑی شان سے وطن سے "آخر کیوں "پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے"۔ اگر سچ پوچھئے تو بات یہ ہو کہ وارثین نبوت اُسوۂ نبوی کو فراموش کر چکے ہیں دین و دُنیا کی جامعیت جو اسلام کا طرۂ امتیاز تھی عرصہ ہوا مسلمانوں سے رخصت ہو چکی ہو اور اسکے بجائے چرچ و اسٹیٹ کی راہبانہ تقسیم کا رواج ہو۔ اس تفریق نے ملت کی رگ حیات کاٹ دی ہو۔ زندگی کے تمام شعبے مذہبی رہنمائی سے محروم ہوتے جاتے ہیں، ضرورت ہو کہ مسلمان اب بھی اس حقیقت کو سمجھیں اور تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام تعلیم میں انقلاب ہو، آیندہ نوجوانوں کی تربیت اسطرح کی جائے کہ انکی سیرت میں پختگی، ارادوں میں بلندی اور عمل میں استواری ہو۔ اسلام کے بنیادی عقائد ان کے دلوں میں اسطرح اُتر جائیں کہ پھر مخالفت کی آندھیاں اور کفر کے طوفان کوئی بھی انمیں تزلزل پیدا نہ کر سکے طبیعتوں میں ایسا استحکام اور عمل میں ایسا دوام ہو کہ اُن کے دم سے آیندہ زندگی کی راہیں بدل جائیں۔ مدت کے مرجھائے ہوئے چمن لہلہا اٹھیں اور اس باغ کی خزاں پھر بہار سے بدل جائے

عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کا مسئلہ اب روز بروز مفکرین کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے قارئین الندوہ کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ حکومت بھوپال نے بھی اس جانب توجہ کی ہے پرانے نصاب پر نظرثانی اور نئے نصاب کا خاکہ تیار کرنے کی غرض سے پچھلے مہینہ بھوپال میں ملک کے مختلف اہل علم اور صاحب نظر علماء کا اجتماع ہوا ندوہ کے حلقہ سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ بھی اس اجتماع میں شریک تھے بحث و گفتگو کے بعد اصلاح نصاب کے اصول اور درسی کتابوں کا ایک خاکہ تیار ہوگیا ہے امید ہے کہ رمضان بعد نصاب رائج ہو جائے۔

تعلیمی اور تدریسی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۶ر جولائی ۱۹۴۱ء کو مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی نے یکایک انتقال فرمایا۔ مولانا مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کے پرنسپل تھے اور عرصہ سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے، علوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی، درس نظامی کی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے، ان علوم سے انھیں گہرا تعلق تھا، اور وہ ہندوستان میں درس نظامی کے بڑے پرجوش حامی اور زبردست وکیل سمجھے جاتے تھے۔ ان تعلیمی اور تدریسی خدمتوں کے علاوہ سیاسی معاملات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنی فہم و بصیرت کے مطابق مسلمانوں کی خدمت سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، خلافت کمیٹی کے زمانے میں فرنگی محل ان اطراف میں مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھا مولانا مرحوم اس کے پرجوش کارکن تھے، آخری زمانے میں مسلم لیگ کی طرف خاص توجہ تھی، اور اسکی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے، خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

میری محسن کتابیں

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے مدیر برہان

میری اُردو اور فارسی کی پوری اور پھر عربی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم آگرہ میں گھر پر ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب قبلہ (اللہ اُن کی عمر دراز کرے) آگرہ کے نامی گرامی سرکاری ڈاکٹر ہونیکے باوجود انتہا درجہ کے مذہبی اور دیندار بزرگ تھے۔ اور وہ تعلیم سے زیادہ تربیت کو مقدم سمجھتے تھے انھوں نے میری عربی تعلیم کے لئے دیوبند سے ایک عالم کو معقول مشاہرہ پر بلالیا تھا، جو ہر وقت میری ساتھ رہتے تھے۔ اور تعلیم کے علاوہ اکثر بزرگان دین کی حکایتیں اور تاریخ اسلام کے موثر واقعات سناتے رہتے تھے شام کے وقت ایک ماسٹر صاحب انگریزی اور حساب وغیرہ پڑھانے آتے تھے۔ یہ سلسلہ تین سال تک قائم رہا۔ اسوقت تک اگرچہ مذہبی اعتبار سے میں نیک اور اسلامی عقائد کا پابند تھا، لیکن کوئی خاص علمی ذوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اکثر احباب کے اصرار پر ۱۹۲۲ء میں جبکہ میں پندرہ سال کا تھا، آپ نے بڑے اہتمام و انتظام سے مجھکو دیوبند کے مدرسہ میں داخل کرادیا۔ یہاں آکر میں درسی کتابیں تو پڑھتا ہی تھا، لیکن مجھکو خود بخود عربی ادب کا شوق پیدا ہوگیا، اور خارج اوقات میں میں مصر کے جرائد و رسائل، اور عربی ادب کی قدیم و جدید کتابیں بکثرت پڑھتا تھا۔ آپ میرے ماہانہ اخراجات کے لئے کافی روپیہ بھیجتے تھے، اسلئے مجھکو اپنے اس شوق کی تکمیل میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس سلسلہ میں کامل للمبرد، اغانی، نہایۃ الارب، صبح الاعشیٰ یہ سب کتابیں دیکھیں اور پڑھیں، لیکن البیان والتبیین للجاحظ نے مجھپر سحر کا کام کیا، اُسکی ایک ایک فصل کئی کئی بار پڑھتا تھا اور ہر مرتبہ نیا حظ لیتا تھا۔ نظم میں کتاب الحماسہ سے مجھکو بڑی محبت تھی، اُسکے سیکڑوں اشعار نوک زبان ہوگئے تھے۔ درسیات میں منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر، ہیئت، تاریخ معانی وبیان اور عروض وغیرہ سب کچھ پڑھا، لیکن ادبی ذوق کی وجہ سے معانی وبیان پڑھنا وقت

صرف کرتا تھا، کسی اور علم پر نہ کرتا تھا، فلسفہ اور منطق کے اسباق میں بادل نخواستہ شرکت کرتا تھا، لیکن جب امام غزالیؒ کی مقاصد الفلاسفہ اور پھر تہافۃ الفلاسفہ میں نے خود مطالعہ کی تو فلسفہ میں بھی لطف آنے لگا، اور اس ذوق نے یہاں تک ترقی کی کہ ابن سینا کی اشارات امام رازیؒ اور محقق طوسی کی شروح سے حل کی اور اسکو اول سے آخر تک خود ہی پڑھا۔

عربی نظم میں درسی کتابوں کے علاوہ ابو العلاء معری کا سقط الزند اور لزوم ما لا یلزم اور دیوان حسانؓ بن ثابت کا میں بہت گرویدہ تھا۔ اکثر یہ کتابیں میرے ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن یہ میرا شوق ذوق محض طالبعلمانہ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعد میں جو میرا سنجیدہ ذوق علمی تعمیر ہوا اُسمیں مولانا شبلی مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض کتابوں کو بھی بڑی حد تک دخل ہے۔ میں اردو کے ادبی رسالے، افسانے اور ناول پڑھتا ہی تھا، مولانا ابو الکلام کے الہلال کی بھی جلدیں پڑھیں۔ اور انکا تذکرہ اور مسئلۂ خلافت بھی پڑھا، اور بعض مضامین کئی کئی دفعہ پڑھے۔ لیکن یہ اثر عارضی تھا، دو ایک برس کے بعد اُتر گیا۔ مولانا شبلی کی کتابوں میں سب سے پہلے غالباً میں نے المامون اور الغزالی پڑھیں۔ مولانا کے اندازِ نگارش، طرزِ تحقیق، اور طریقۂ بحث نے دل پر عجیب اثر کیا۔ اور میں مولانا کی تحریروں کا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ میں نے آپکی سب کتابیں خریدیں۔ اور پڑھیں۔ الفاروق اور سیرت النبیؐ جلد اول کئی بار پڑھیں، اور ان دونوں کے مقدمے تو خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھے ہیں۔ ٹھیک یاد بھی نہیں آتی تقریب سے ارض القرآن کی دونوں جلدیں اور سیرت عائشہؓ وامام مالکؒ کا مطالعہ کیں۔ اور دل پر مولانا سید سلیمان ندوی کی کاوش و محنت، جمع و ترتیب واقعات کا حُسن سلیقہ اور ان کے شبلوی اندازِ تحریر نے بھی دل پر گہرا اثر کیا۔ اب میں رسالۂ معارف کا خریدار بھی بن گیا، اور بجائے محض ادبی رسالوں کے سنجیدہ اور ٹھوس رسالے پڑھنے لگا۔ معارف خود خریدتا تھا اور جامعہ، اُردو اور زمانہ مانگ تانگ کا پڑھتا تھا۔ اب طبیعت ادب لطیف اور لسانی ولفاظی کے بجائے سنجیدہ علمی حقائق کی جویا ہو گئی ہیں

اُس زمانہ میں معارف کے سب مضامین سمجھتا نہیں تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ جب معارف میں چھپا ہے تو یقیناً بلند معیار کا ہوگا، اور مضمون نگار نے اسکے لکھنے میں کوشش کی ہوگی اسلئے دل میں قدر اُن نہ سمجھے ہوئے مضامین کی بھی ہوتی تھی۔ معارف کا ایک ایک پرچہ محفوظ رکھتا تھا اور جلد کے ختم پر اُسے مجلد کرا لیتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں تمام علوم و فنون درسیہ سے فارغ ہونیکے بعد مجھکو حضرت مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم سے بسلسلۂ دورۂ حدیث بخاری اور ترمذی کا درس لینے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت شاہ صاحب کا درس کیا تھا، علوم و فنون کا ایک بحر زخار تھا جو شروع سے آخر تک پوری تیزی سے موجزن رہتا تھا، حضرت شاہ صاحب اپنی تقریریں کثرت سے نامور مصنفین و ائمۂ اسلام کے حالات، اُن کے علمی و عملی کارنامے، اجتہادات اور رائیں تنقید وغیرہ بیان فرماتے رہتے، خصوصاً علامہ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن حجر وغیرہم کا ذکر تو بہت ہی رہتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی ان تقریروں سے ہی مجھکو حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی کتابوں کا شوق ہوا اور میں نے ان دونوں اماموں کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور کچھ نہیں آئیں۔ بہرحال پڑھیں سب۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیفات نے جس سنجیدہ علمی ذوق کی طرح ڈالدی تھی حضرت شاہ صاحب کے درس نے اسمیں پختگی پیدا کر دی۔ درس کے علاوہ میں یوں بھی حضرت کی پرائیوٹ مجلس میں شریک ہوتا رہتا تھا۔ آپکی عام گفتگو بھی درس سے کم نہیں ہوتی تھی، میں اُس سے استفادہ کرتا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے۔ ابا نے انگریزی اور عربی دونوں ساتھ شروع کرائی تھیں لیکن دیوبند پہونچکر انگریزی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا، اب فارغ التحصیل ہونیکے بعد خیال آیا کہ انگریزی کی بھی تکمیل کر لوں۔ بعض امتحانات پرائیوٹ اور بعض کالج میں داخل ہو کر دیے۔ سب میں سکنڈ کلاس کے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ آخر میں ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ رہا۔ بی اے میں میرے استاد آگرہ یونیورسٹی کے ایک بنگالی پروفیسر تھے، وہ انگریزی کے بڑے اچھے ادیب تھے

انھوں نے مجھ میں بھی انگریزی لٹریچر کا شوق پیدا کر دیا۔ میں نے اس سلسلہ میں زیادہ تر ادبی کتابیں پڑھیں۔ برک کا انقلاب فرانس، مکالے کے مقالات اور تاریخ ہند اور سیاسیات پر بھی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کئی بار مطالعہ کی اور اب تک اپنے دل میں اسکی نمایاں قیمت پاتا ہوں۔

فارسی میں میرا مطالعہ شعراء کے دواوین اور چند تاریخی کتابوں تک محدود ہے۔ دواوین میں میں نے امیر خسرو، نظامی، جامی، نظیری، عرفی، خاقانی وغیرہم سب کو پڑھا ہے، لیکن دیوان حافظؒ اور دیوان غالب مجھکو سب سے زیادہ عزیز ہیں! اور خصوصًا دیوان حافظ کو تو میں اپنا مونس تنہائی شریک رنج و راحت اور پریشانی میں ہمدرد و غمگسار سمجھتا ہوں۔ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جب کبھی کسی وجہ سے سخت اضطراب و پریشانی کی کیفیت طاری ہے اسی حالت میں میں دیوان حافظؒ پڑھنے لگتا ہوں۔ دو ایک غزلوں کے بعد ہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی اضطراب تھا ہی نہیں۔ ایک مرتبہ تو لسان الغیب نے پیرو مرشد ہی کا کام کیا اللہ تعالیٰ ستار عیوب ہے اسلئے تفصیل سے بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ میں ایک مرتبہ سخت فتنہ میں مبتلا ہو گیا تھا، اگر حضرت لسان الغیب ایک شعر کے ذریعہ میری رہنمائی نہ فرماتے تو میں ارتکاب معصیت کے علاوہ شدید جانی و مالی نقصان سے دو چار ہو جاتا۔ بلبل شیراز کا یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا، اور اسی وجہ سے میں اُن کا دیوان حد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کئی دفعہ دیوان سے فال بھی نکالی ہے اور وہ صحیح ثابت ہوئی ہے۔

آخر میں عرض یہ کرنا ہے کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا پڑھا یا اب جو کچھ لکھتا پڑھتا ہوں وہ میرے نزدیک فیض و برکت ہے میرے والد صاحب قبلہ کے حسن نیت و عمل کا جنھوں نے عربی تعلیم کو بُرا سمجھنے والے لوگوں کی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود محض خالصتہً لوجہ اللہ مجھکو عربی تعلیم دلائی اور اس پر اتنا ہی خرچ کیا جتنا کہ کوئی مالدار اپنے اولاد کی انگریزی تعلیم پر خرچ کر سکتا ہے، اور یہ سب صدقہ ہے میری والدۂ محترمہ

کی دُعاؤں کا جنھوں نے تہجد کی نمازوں میں میرے حُسنِ علم وعمل کے لئے بارگاہِ ایزدی میں رو رو کر التجائیں کی ہیں اور کبھی اُنھوں نے یہ خواہش نہیں کی کہ دنیوی اعتبار سے مجھے کوئی جاہ ومنصب ملے اللہ دونوں کی عمر دراز کرے اور مجھکو اُن کی تمناؤں کے مطابق حُسنِ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

فخرِ قوم ملا عبدالقیوم کی یادمیں

مجلہ نظامیہ حیدرآباد دکن کا نصف صدی تھا۔ آج سے ۲۵ سال سے اتحاد اسلامی، آزادی وطن، اور قومی تعلیم کی جدوجہد میں فخرِ قوم ملا عبدالقیوم کا خاص حصہ رہا ہے اور اپنی تمام عمر خدمت ملک و مذہب میں صرف کی اس قابل یادگار ہستی کے کارنامے مجلہ نظامیہ کے خصوصی شمارہ میں جمع کئے گئے آپکی سیرت ہر کارکن قومی کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوگی رسالہ کی قیمت ... روپیہ مجلہ نظامیہ حسینی علم حیدرآباد دکن سے حاصل کر سکتا ہے

مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم

از جناب مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مدیر کانفرنس گزٹ

"موت" کا کوئی وقت معین نہیں، اسلئے جسوقت بھی وہ واقع ہو کوئی عجیب و غیر معمولی بات نہیں لیکن با ایں ہمہ جب بعض دفعہ ہم اچانک اپنے کسی عزیز یا دوست کی خبر وفات سنتے ہیں تو یہ ہمیں خلاف توقع چیز معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی کی رحلت بھی ہماری جماعت کے لئے ایک خلاف توقع واقعہ ہے جو اچانک پیش آیا، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھتا تھا کہ حاجی صاحب (مرحوم) ہم سے اسقدر جلد جدا ہو جائیں گے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ حاجی صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء میں پڑھتے تھے، انکا عنفوان شباب تھا، اور صحت نہایت اچھی، بےفکری تھی اور آزادی، دُنیا کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا ندوہ سے نکلکر علمی دُنیا میں قدم رکھا۔ یہ گویا اُن کی زندگی کا دوسرا دور تھا، جو تالیف و تصنیف اور درس و تدریس میں گذرا، اور اسی طرح گذر رہا تھا کہ پیام اجل آیا، اور وہ دفعتاً ہم سے جُدا ہوگئے چونکہ مرحوم کی زندگی کا "آغاز و انجام" پیش نظر ہے اسلئے یہ سارا واقعہ ایک کھیل معلوم ہوتا ہے اور کھیل بھی ایسا جس کے سارے مدارج جلد جلد ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

جب میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت طالب علم داخل ہوا تو پہلے ہی روز حاجی صاحب مرحوم اور مولوی (اب حاجی) مسعود علی صاحب ندوی نیز دو تین اور طلبہ سے ملاقات ہوئی جو زمانۂ مابعد میں بہترین رفیق اور شریف دوست ثابت ہوئے۔ یہ سب میرے ہم سبق تھے، لیکن حاجی صاحب مرحوم کے ساتھ یہ مزید خصوصیت تھی کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔ گویا پڑھنا لکھنا، رہنا سہنا، کھانا پینا، سیر و تفریح یعنی شبانہ روز کی پوری زندگی ایک ساتھ گذرتی تھی، کئی سال اسیطرح گذرگئے

ایک شریف طالبعلم کی زندگی عموماً ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہوتی ہے۔ تصنع، ریاکاری اور زمانہ سازی سے عموماً بالاتر ہوتا ہے، البتہ جب وہ عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے ماحول کے اثر اور دوسرے لوگوں کی صحبت سے اُسمیں اس قسم کی کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں حاجی صاحب بھی اپنی طالبعلمانہ زندگی میں بناوٹ اور ریاکاری سے بالکل دور تھے۔ البتہ طبیعت کسی قدر دیرآشنا تھی، اسلئے ہر کس و ناکس سے جلد مانوس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن جب مناسبت طبع اور اتحاد ذوق کی بناپر کسی سے مانوس ہوجاتے تو پھر اسپر پورا اعتماد کرتے اور اخلاص و بے تکلفی سے ملتے تھے۔ ایک دفعہ اعتماد کرلینے کے بعد پھر اُن کے دل میں اپنے احباب کی طرف سے بدگمانی نہیں پیدا ہوتی تھی۔

حاجی صاحب طالبعلمی کے زمانہ میں بھی بلند نظر و باوقار تھے۔ عادات و اطوار میں شائستگی اور خودداری تھی، اور عزت نفس کا پاس، اسلئے کوئی مبتذل اور گھٹیا حرکت اُنسے کبھی سرزد نہیں ہوتی تھی، اور وہ ہمیشہ عامیانہ و سوقیانہ صحبتوں سے بچتے تھے۔ البتہ اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں وہ بے تکلف اور خوش مزاج نظر آتے تھے۔ حفظ مراتب کا اُنھیں خاص خیال رہتا تھا۔ اسلئے وہ اپنے سے کم عمر اور چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ اُن سے مساویانہ بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کریں، اسی طرح وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا پورا احترام کرتے اور ان کے ساتھ تہذیب و شائستگی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اسمیں بھی اعتدال پیش نظر تھا۔ کسی بلند شخصیت کے سامنے جھکنا یا اُسکی ہاں میں ہاں ملانا اُنکی عادت نہ تھی، وہ طبعاً آزاد خیال تھے اور بےنیازی کی شان ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

حاجی صاحب کی ایک خاص شرافت یہ تھی کہ وہ لوگوں کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتے اور خلوت یا جلوت میں ان باتوں کا تذکرہ کرکے کسی کو رسوا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

بلکہ اگر کسی صحبت میں اس قسم کے تذکرے چھڑ جاتے تو وہ حتی الامکان موضوع گفتگو بدل کر لوگوں کو کسی اور طرف متوجہ کر دیتے تھے۔

حاجی صاحب کی زندگی نہایت سادہ اور معتدل تھی، وہ کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ نہیں خرچ کرتے تھے اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُنھیں کسی خاص چیز کا شوق نہیں ہو جس پر وہ بلا لحاظ عواقب روپیہ خرچ کریں، اگر کسی موقع پر اُنکے پاس روپیہ نہ رہتا اور مکان سے آنے میں دیر ہوتی تو وہ اپنے ضروری خرچ بھی بند کر دیتے اور کسی سے قرض لیکر اپنی ضرورت پوری نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ اُنھوں نے کسی ضرورت کے لئے کبھی کسی سے قرض لیا ہو، وہ ہمیشہ ہر چیز نقد خریدتے اور دار الاقامہ کی فیس بروقت ادا کرتے اس عادت کی بنا پر کبھی کسی کا کوئی مطالبہ اُن کے ذمہ نہیں رہا۔ اسی طرح وہ سب معاملات میں صفائی کا لحاظ رکھتے تھے۔ دیانت اور ذمہ داری کا احساس اُنکی خصوصیت تھی۔

حاجی صاحب ایک ذہین و ذی استعداد طالبعلم تھے، اُنکی قوت مطالعہ اچھی تھی اور دماغ سلجھا ہوا اسلئے وہ عموماً ہر چیز کو صحیح طور پر سمجھتے تھے، ایسا شاذ و نادر ہوتا تھا کہ اُن کا دماغ کجی کی طرف مائل ہو، وہ عام طلبا کی طرح کسی کتاب و مضامین کا طوطے کی طرح رٹنا اور بار بار یاد کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ جب کسی مسئلہ کو سمجھنا اور ذہن نشین کرنا چاہتے تو کتاب لیکر ایک طرف بیٹھ جاتے اور کامل توجہ اور پوری انہماک و یکسوئی کے ساتھ مطالعہ میں مستغرق ہو جاتے یہاں تک کہ اس مسئلہ کو بخوبی سمجھکر محفوظ کر لیتے! اور جب اُنھیں یقین ہو جاتا کہ مسئلہ ذہن نشین ہو گیا تو پھر فوراً کتاب بند کر کے دوسرے کاموں میں اسطرح مصروف ہو جاتے کہ گویا اُنھیں کتاب سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

جہاں تک عام حالت کا تعلق ہے حاجی صاحب روزمرہ زیادہ محنت نہیں کرتے تھے۔ بس مقررہ کام انجام دیتے اور پوری نیند سوتے۔ لیکن جب واقعی طور پر محسوس کرتے کہ اب کام کرنیکا وقت آگیا تو دفعتاً اُن کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا اور وہ یکسر کام میں مصروف ہو جاتے اور بڑی

مستعدی سے امتحان کے لئے تیاری کرتے اور کامیاب ہوتے۔

نمازِ عصر کے بعد وہ درسی سلسلہ کا کام بالکل بند کر دیتے اور یہ وقت عموماً اخبار بینی میں صرف کرتے تھے۔ وہ اخبار پوری توجہ سے پڑھتے اور زیرِ بحث مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے، وہ ہر مسئلہ کے متعلق اپنی مستقل رائے رکھتے تھے، گویا تقلید سے بالاتر تھے۔

اُس زمانہ میں دار العلوم ندوہ میں اردو عربی کے بہت سے اخبارات آتے تھے، جو طلبہ کے "دار المطالعہ" میں جس کا نام "دار المعلومات" تھا میزوں پر رکھ دیے جاتے تھے۔ دار المعلومات کا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا، ایک زمانہ میں حاجی صاحب بھی اُسکے ناظم تھے، وہ اخبارات فراہم کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اس زمانہ میں دار العلوم کی پرانی عمارت کے احاطہ میں بالائی منزل پر رہتے تھے، مولانا مرحوم کے پاس بہت سے اخبارات آتے تھے، لیکن مولانا کو اس طومار کے پڑھنے کی کہاں فرصت تھی وہ ان اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈال کر میز کے نیچے پھینک دیتے جاتے جسے! شام کو یہ اخبارات اُٹھالاتے، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مولانا مرحوم ان اخباروں کو کمرہ کے ایک دروازہ کو جہاں اُن کے لکھنے پڑھنے کی میز تھی، باہر پھینک دیتے۔ کمرہ کے نیچے ایک دوسرے کمرہ کا چھپر تھا۔ یہ اخبار اُسپر آکر گرتے، حاجی صاحب یہ کرتے کہ ایک لانبا بانس لیکر اُسکے سہارے سے یہ اخبار چھپر سے اُتار لیتے اور دار المعلومات میں لاکر رکھتے۔

اس زمانے میں امین آباد پارک میں ایک مسلم کلب بھی تھا، جہاں اُردو انگریزی کے بہت سے اخبارات آتے تھے، ہم لوگ نمازِ عصر کے بعد عموماً وہاں جایا کرتے تھے، لیکن جب علامہ شبلی نعمانی لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہوتے تو شام کو ہماری حاضری عموماً علامہ کے یہاں ہوتی۔ یہ عجیب صحبت تھی، ہمارے ہم عموماً معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ لیکر اُٹھتے مولانا بھی ہم لوگوں کو عزیز رکھتے اور تقریباً ہر حاضری کے موقع پر کسی نہ کسی معاملہ میں ہماری رہنمائی فرماتے تھے۔

جس روز اس صحبت میں کوئی خاص علمی یا تاریخی نکتہ ہمیں معلوم ہوتا تو ایک بے پایاں مسرت و خوشی حاصل ہوتی تھی، اب یہ مسرت کہاں میسر آسکتی ہے، بس ایک خواب تھا جو کبھی دیکھا تھا۔

اس زمانہ میں ہمارے احباب و رفقا میں ایک اور دلچسپ ہستی تھی، جسے ہم سب "خواجہ صاحب" کہتے تھے۔ لیکن آخر میں ان کا ایک اور بہت دلچسپ نام مشہور ہو گیا تھا جس کا یہاں ظاہر کرنا مناسب نہیں، ورنہ خواجہ صاحب جو طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس نام سے ناخوش ہوتے تھے اب اور زیادہ ناخوش ہوں گے۔ بہرحال خواجہ صاحب بھی ہم لوگوں کے ساتھ شام کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اُنکے خاص انداز و اطوار طبیعت کی جلد بازی، اور کثرت استفسارات کی وجہ سے علامہ کو بھی اُن سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ خواجہ صاحب کی حرکتوں پر اکثر ہنس دیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ علامہ کا ایک ایک لفظ غور سے سنتے اور جب کوئی ایسا لفظ سنتے جس سے اُن کے کان پہلے سے آشنا نہیں یا اُس کا محل استعمال معلوم نہیں تو وہ اسی صحبت میں آہستہ آہستہ لیکن بار بار اس لفظ کا اعادہ کرتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ اِدھر علامہ کی زبان سے کوئی نیا لفظ نکلا اور اُدھر خواجہ صاحب کے مونھ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے، وہاں سے اُٹھکر خواجہ صاحب روز مرہ کی بات چیت میں کوئی نہ کوئی موقع نکال کر یہ نئے الفاظ ضرور استعمال کرتے تھے حاجی صاحب بلکہ ہماری ساری جماعت کو خواجہ صاحب سے خاص دلچسپی تھی، اب وہ ایک کالج میں پروفیسر ہیں اور ایک متین و سنجیدہ بزرگ سمجھے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ خواجہ صاحب طلبائے دارالعلوم کی ایک انجمن کے ناظم (سکرٹری) منتخب ہو گئے۔ حاجی صاحب نے رنگ برنگ کاغذوں کا ایک اونچا تاج بنایا اور اُسے پھولوں سے خوب سجایا اور ایک جگہ محفوظ کر دیا۔ انتخاب کے بعد طلبہ ہال میں جمع ہوئے اور انجمن کا پہلا جلسہ منعقد ہوا، اسکے بعد خواجہ صاحب شکریہ کی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو حاجی صاحب نے

نت کے دروازے سے نمودار ہوکر تاج اُن کے سر پر رکھدیا، جس سے خواجہ صاحب کی صورت عجیب
مضحکہ انگیز بنگئی، اُنھوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور نہایت سنجیدہ انداز اختیار کر لیا۔ مجمع میں ہر طرف سے
نعرہ بلند ہوا، مگر خواجہ صاحب نے اپنے اسی سنجیدہ انداز میں ایک تقریر کرتے ہوئے اس "تاج بخشی" پر
اجی صاحب اور طلبائے دار العلوم کا شکریہ ادا کیا۔ تقریر کے دوران میں تاج بدستور سر پر رہا۔ یہ ندازہ
ھیکر سارا جلسہ سنجیدہ بن گیا اور خواجہ صاحب اپنی تدبیر میں کامیاب ہوئے۔

اسی طرح کے اور بہت سے دلچسپ واقعات حاجی صاحب کے زمانۂ طالبعلمی کے ہیں، جو
خوف طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ یہ چند واقعات بھی اسلئے عرض کئے گئے کہ ایک ندوی بھائی اور
رحوم دوست کی طالبعلمانہ زندگی کی ایک جھلک ہمارے بھائیوں کے سامنے آجائے۔ اگر حاجی صاحب
بھی ہم سے رخصت نہوتے تو کسی نہ کسی حیثیت سے بار بار اُن کا ذکر آتا اور شاید وہ خود بھی کبھی الندوہ
میں کچھ لکھتے اور طلبائے قدیم کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ اب یہ صورت ممکن نہیں اسلئے بے اختیار
ل چاہا کہ رفیق دیرینہ کے متعلق چند الفاظ لکھدیے جائیں جو بطور یادگار باقی رہیں۔ اب کون بار بار
ن کا ذکر کریگا، البتہ انکی تصانیف ایک زندہ یادگار ہیں جو مدت تک باقی رہیں گی۔

جب میں اور حاجی معین الدین صاحب دار العلوم ندوہ میں اپنی تعلیم ختم کرکے فارغ ہوئے تو
ندوہ ایک دور انقلاب سے گذر رہا تھا، تعلیمی و انتظامی حالت میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور ارکان میں باہم
کی باہمی کشمکش اور اختلافات سے شکستہ خاطر ہوکر علامہ شبلی نعمانی اپنے عہدۂ معتمدی سے دستکش ہوچکے تھے
ور مستقل قیام کے ارادہ سے اپنے وطن اعظم گڈھ تشریف لیگئے تھے۔ جہاں آپ "دار المصنفین" قائم کرنیکے لئے
بد وجہد میں مصروف تھے۔ علامہ نے دار المصنفین کا ایک خاکہ مرتب کیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ
بنا بنگلہ اور باغ اس کام کے لئے وقف فرمادیں گے۔ دار المصنفین کے لئے علامہ کو ایسے صحیح المذاق
جید الاستعداد نوجوانوں کی ضرورت تھی جو فی الجملہ تصنیف کا سلیقہ رکھتے ہوں اور انکے زیر تربیت

نہ کر تالیف و تصنیف کی خدمت انجام دیکیں، گویا مختصر الفاظ میں دار المصنفین کا مقصد یہ تھا کہ بہترین مصنف پیدا کئے جائیں جو موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق تالیف و تصنیف کا کام کرسکیں۔

یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نوجوان انہیں صرف دار العلوم ندوہ ہی سے مل سکتے تھے جنھوں نے سالہا سال تک علامہ کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کی تھی اور برسوں تک انکی صحبت سے متمتع ہو چکے تھے۔ اسکے علاوہ ایک حد تک تالیف و تصنیف کے مبادی سے بھی آشنا تھے اسی بنا پر علامہ نے ہم میں سے چند طلبہ کو جو تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور زمانۂ طالبعلمی میں اُن کے حلقہ نشین تھے اس کام کے لئے منتخب کر کے اعظم گڈھ طلب کیا تھا، لیکن ابھی اس سلسلہ میں مراسلت ہو رہی تھی کہ علامہ نے رحلت فرمائی۔

اس زمانہ میں حاجی صاحب عارضی طور پر وطن جا چکے تھے اور میں لکھنؤ میں تھا، اور رسالہ الندوہ کی اڈیٹری کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ یہ علمی و تاریخی رسالہ جو ندوۃ العلما کا آرگن تھا کچھ مدت پہلے بند ہو چکا تھا اور علامہ شبلی نعمانی جو رسالہ کے اڈیٹر تھے، اس کام سے دستکش ہو گئے تھے۔

غرض دار العلوم ندوہ سے فارغ ہونیکے بعد میرا قیام تو رسالۂ الندوہ کے کام کی وجہ سے لکھنؤ میں رہا لیکن حاجی معین الدین صاحب چند روز بعد اعظم گڈھ چلے گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی پہلے ہی (علامہ کی رحلت کے بعد) اعظم گڈھ جا چکے تھے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بھی پونا سے اپنے پروفیسری کے عہدہ سے مستعفی ہو کر اعظم گڈھ چلے آئے تاکہ بحیثیت جانشین علامہ مرحوم دار المصنفین کی تاسیس و ترقی اور سیرت نبویؐ کی تکمیل کے لئے کوشش کریں۔

علامہ کے ان سب مخلص تلامذہ نے نہایت ایثار و ہمت سے کام لیکر اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی سیرت کی تالیف و تدوین میں مصروف ہو گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے انتظامی کاروبار سنبھالا یعنی منیجر کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے، اور حاجی معین الدین صاحب ندوی تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔

"یادش بخیر" مولوی حاجی مسعود علی صاحب کا ذکر آگیا ہو تو برسبیل تذکرہ یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ مولوی صاحب موصوف کو زمانۂ طالبعلمی ہی سے انتظامی اور کاروباری معاملات سے دلچسپی تھی اور ان امور میں ایک خاص سلیقہ آپکو حاصل تھا جس کا علامہ کو بھی اعتراف تھا، چنانچہ وہ اپنے ذاتی امور کے انصرام میں مولوی صاحب موصوف کے اس سلیقہ سے فائدہ اُٹھایا کرتے تھے یہانتک کہ اکثر اوقات علامہ کی شیروانیاں وغیرہ بھی مولوی مسعود علی صاحب کے مشورہ سے اور ان کے زیرنگرانی تیار ہوتی تھیں دارالمصنفین کے منیجر ہونے پر اُن کی یہ صلاحیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی جبکہ اُنھوں نے اعظم گڈھ جیسے مقام پر ایک مطبع قائم کیا اور پھر تبدریج اُسکو شاندار پیمانہ پر پہونچایا اور دارالمصنفین کے کاروبار کو غیر معمولی ترقی دی۔
یہ ایک ضمنی تذکرہ تھا۔

غرض حاجی معین الدین صاحب دارالمصنفین کے اولین رفقاء میں تھے، اور اُنھوں نے ایک خوشگوار ماحول میں اپنا کام شروع کیا، اس سے میرا مقصد یہ ہو کہ دارالمصنفین میں سب کام کرنے والے ندوی تھے، اسلئے اُن کے خیالات و افکار میں یکسانیت تھی، اسکے علاوہ وہ سب علامہ کی بارگاہ فضل و کمال کے حاشیہ نشین تھے، اور کم و بیش اُن کے علمی فیوض و برکات سے مستفید ہو چکے تھے سب سے بڑی بات یہ ہو کہ علامہ کے مقصدِ حیات اور ندوۃ العلماء کے اعلیٰ نصب العین سے واقف تھے، ان حالات کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دارالمصنفین کا کام اخلاص و ہم آہنگی کی فضا میں شروع ہوا۔ آج دارالمصنفین کو ہندوستان کے علمی و قومی اداروں میں جو درجہ حاصل ہو وہ اسی اتحادِ فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔

اس زمانہ میں جو سب سے مقدم کام دارالمصنفین کے پیش نظر تھا وہ "سیرت نبویؐ" کی تکمیل تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ اسکیم بھی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بعد خلفائے راشدینؓ اور صحابۂ کرامؓ کے مفصل حالات بھی مرتب کئے جائیں تاکہ خیر القرون کی تاریخ کا ایک مکمل سلسلہ تیار ہو جائے سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کی خدمت برادر محترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لی۔

کیونکہ سید صاحب ممدوح سیرت کے سلسلہ میں علامہ مرحوم کے ساتھ کام کرکے ایک خاص بصیرت حاصل کرچکے تھے اور علامہ کے دماغ میں جو سیرت کا خاکہ تھا اُس سے واقف تھے۔

سلسلہ "سیر الصحابہ رض" کا کام مولوی حاجی معین الدین صاحب کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بڑی محنت سے اپنا کام شروع کیا، اور اس سلسلہ کی دو جلدیں تالیف کیں۔ پہلی جلد کا نام خلفائے راشدین ہے۔ اور دوسری کا "مہاجرین"۔ یہ دونوں کتابیں دار المصنفین کے سلسلہ التصانیف میں ایک خاص درجہ رکھتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے حاجی صاحب مرحوم کی محنت و تلاش کا اندازہ ہوتا ہے۔

دار المصنفین میں کچھ زمانہ تک قیام کے بعد حاجی صاحب کتب خانۂ ندوۃ العلماء کی از سر نو ترتیب کے لئے لکھنؤ طلب کئے گئے، لکھنؤ ہم ندویوں کا گویا گھر ہے، اور اپنی مادر درسگاہ کی کوئی خدمت ہر ندوی کیلئے باعث صد مسرت، اسلئے حاجی صاحب نے یہ خدمت خوشی سے قبول کی۔ حاجی صاحب کے ذمہ جو کام کیا گیا تھا، وہ بہت محنت طلب تھا، کتابوں کی مجوزہ فہرست کے جو عنوان تجویز کئے گئے تھے، وہ ایسے تھے کہ انکی خانہ پُری کے بعد ہر کتاب کے مضامین اور مصنف کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو جاتے تھے۔ لیکن ان معلومات کے حاصل کرنے کے لئے حاجی صاحب کو پوری توجہ سے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، میں برابر دیکھا کرتا تھا کہ حاجی صاحب یہ کام کیسی محنت و شوق سے انجام دیتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے کتاب خانہ میں ایک معقول حصہ نادر الوجود قلمی کتابوں کا تھا، جو زیادہ تر علامہ شبلی نعمانی کے ذاتی کتبخانہ سے منتقل ہو کر آئی تھیں، کیونکہ ممدوح نے اپنا کتاب خانہ جو ساری عمر کی کمائی تھی، اور برسوں کی تلاش و جستجو اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا نتیجہ تھا، ندوۃ العلماء کے لئے وقف فرمادیا تھا۔ ترتیب فہرست کے وقت یہ قلمی کتابیں خاص توجہ سے دیکھی جاتیں اور ان کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کئے جاتے تھے، مثلاً یہ کہ کتاب مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یا کسی دوسرے شخص نے مصنف کے عہد میں لکھی ہے اور یہ کہ مصنف کی نظر سے گذری ہے یا نہیں، غرض حاجی صاحب کتاب کی جملہ خصوصیات

تلاش کرکے اُس کے وجوہ ندرت قلمبند کرتے تھے۔ حاجی صاحب نے اس سلسلہ میں جو محنت کی اس کا تفصیلی ذکر یہاں ممکن نہیں اس کام سے خود حاجی صاحب کو یہ فائدہ پہونچا کہ قدما کی تصنیفات پر اُن کی نظر بہت وسیع ہوگئی اور تلاش و تحقیقات کا ایک خاص ذوق اُنہیں پیدا ہوگیا۔

لکھنؤ کے بعد حاجی صاحب بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ میں ترتیب فہرست کے کام پر مامور ہوئے حسب معمول یہاں بھی آپ نے اپنا کام بڑی محنت و سلیقہ سے انجام دیا۔ کلکتہ کے بعد آپ خدابخش لائبریری یعنی "اورنٹیل لائبریری بانکی پور پٹنہ" میں عربی کتابوں کی ترتیب فہرست کے کام پر مقرر ہوئے۔ نادر الوجود کتابوں کے لحاظ سے اس لائبریری کو جو شہرت و اہمیت حاصل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ حاجی صاحب ضلع پٹنہ کی ایک مردم خیز بستی کے رہنے والے تھے اسلئے پٹنہ گویا حاجی صاحب کا وطن تھا۔

پٹنہ پہونچکر حاجی صاحب اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوگئے، اور مسلسل محنت و کوشش کے بعد ایک پُرازمعلومات فہرست کی چند جلدیں انگریزی میں مرتب کیں جو اُنکی قابلیت کا خاص کارنامہ ہیں۔ یہ جلدیں حکومت کی طرف سے چھاپ کر شائع کردی گئی ہیں اور ارباب نظر و اہل بصیرت نے انکی خوبی کا اعتراف کیا ہے، کیونکہ ان کے مطالعہ سے حاجی صاحب کی محنت، تلاش اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حاجی صاحب نے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کہیں حاصل نہیں کی تھی، صرف ندوہ ہی میں تھوڑی سی انگریزی پڑھی تھی، لیکن اپنی ذہانت اور مسلسل محنت و مطالعہ سے اچھی قابلیت بہم پہونچائی تھی۔

چند سال بعد پٹنہ کی یہ جگہ تخفیف میں آگئی، اس فرصت میں حاجی صاحب ایک ضروری کام سے دو چار روز کے لئے علی گڈھ بھی تشریف لائے، ایک مدت بعد ان کی یہ چند روزہ صحبت نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔

پٹنہ لائبریری سے جدا ہونیکے بعد حاجی صاحب نے دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ہندوستان

کے قدیم تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں مرتب کیا جو شائع ہو چکا ہے، اسکے بعد کچھ مدت تک رام پور کے مشہور سرکاری کتاب خانہ میں کام کیا۔

ان تمام مراحل سے گذرنیکے بعد ۱۹۲۳ء میں حاجی صاحب کو پھر پٹنہ میں قیام کا موقع ملا، مدرسۂ شمس الہدیٰ میں جو پٹنہ کی مشہور تعلیم گاہ ہے پرنسپل کا عہدہ خالی ہوا تو کمیٹی کے ارکان نے بلحاظ آپکی سابقہ علمی خدمات و قابلیت کے آپکو اس عہدہ پر مقرر کیا۔ یہ آپکی آخری خدمت تھی۔ جسپر آپ تادم واپسیں مامور رہے، اور حدیث کا درس دیتے رہے، یہاں تک کہ ۲۴ مئی کی صبح کو اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔

جس زمانے میں حاجی صاحب اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں کام کر رہے تھے مجھے بمعیت مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) کلکتہ اور ڈھاکہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر زیادہ تر حاجی صاحب کی ملاقات کے لئے پٹنہ میں قیام کیا۔ حاجی صاحب نے جس اخلاص و سچی مسرت کے ساتھ ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا وہ آجتک یاد ہے، انھوں نے بڑے پیمانے پر ہم لوگوں کی دعوت کی، ندویوں کو جمع کیا، لوگوں سے تعارف کرایا۔ اُنکی ہر ادا سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ملاقات سے کس قدر مسرور ہیں۔

آخری مرتبہ ۱۹۳۸ء میں حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی، جبکہ پٹنہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا، اور اس سلسلہ میں مجھے بھی پٹنہ جانا پڑا، اس زمانے میں حاجی صاحب "شمس الہدیٰ" کالج میں پرنسپل تھے۔ جب میں اُن سے ملاقات کے لئے وہاں پہونچا تو جس گرمجوشی سے وہ پیش آئے اور جو مسرتِ بے پایاں اُنھیں حاصل ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، وہی اخلاص تھا اور وہی بے تکلفی، جو زمانۂ طالبعلمی میں اُن کا شیوہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم اُسی دورِ طالبعلمی میں واپس آگئے ہیں، جبکہ دنیا کے ہر قسم کے افکار و ہموم

سے آزاد تھے، اور زندگی کی کشمکش سے ناآشنا۔

اس موقع پر بھی حاجی صاحب نے تمام برادران ندوہ کو جمع کیا، پرتکلف دعوت دی، اور عہد ماضی کی داستانیں دہرائیں، اس ملاقات سے دل۔ دماغ کو ایک عجیب طرح کی تازگی حاصل ہوئی۔

میری تحریک پر حاجی صاحب خود بھی اجلاس کانفرنس میں شریک ہوئے! اور دوسرے اساتذہ نیز طلبہ کو شرکت کی اجازت دی، یہ آخری ملاقات تھی جو اس عزیز ترین رفیق سے ہوئی ان کی وفات کے بعد سے میں برابر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسا جوہر گراں مایہ ضائع ہوگیا جس کا نعم البدل یا بدل اب کبھی نہیں مل سکتا، لیکن چارہ کار کیا ہے۔

"شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن"

یادِ ایّام

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب ایم اے ندوی انسپکٹر مدارس عربیہ رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

(۷)

الندوہ

دارالعلوم کی تبلیغ اُسکے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں اور انکی کارروائیوں تک محدود تھی اور اسمیں علاوہ وکلاء کی تحصیل کے کچھ چندہ بھی ہو جاتا تھا سب سے پہلے علامہ نے چارج لینے سے قبل یہ کیا کہ ایک رسالہ "الندوہ" جاری کیا اسکے دو اڈیٹر قرار پائے۔ ایک تو خود علامہ، دوسرے ہمارے مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔ شروانی صاحب ملک میں مشہور ہو چکے تھے۔ ادبیات اور تاریخ پر اُنکی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ انکو عنفوان شباب سے ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اور اس پیرانہ سالی میں بھی وہی ایک حال بلکہ اس سے بڑھکر آجتک باقی ہے بہت کام کئے اگرچہ دُور رہکر کئے۔ رؤساء کے طبقہ میں عالم اور شائق علم ہیں، کتب خانہ اور اسکے عجائبات کی فراہمی میں بہت کچھ دولت اور وقت صرف کیا۔ جب لکھنؤ تشریف لاتے تو اس تلاش میں چوک، نخاس، چوبٹیاں سب ایک کر ڈالتے، انکا گھر تحفہ جات کا ایک خزانہ ہے، قدردان علم اور قدرشناس ہیں، خدا عمر دراز کرے اب ایسی ہستیاں کہاں ہیں! مگر وہ نرے کھرے مولوی نہ تھے، انکی مصروفیت اپنی جائداد کے انتظامات میں کچھ غیر معمولی طریقہ پر اس زمانہ میں بڑھی ہوئی تھی انکی طرح بچے بھی اس قابل نہ تھے کہ کچھ ہاتھ بٹاتے پھر لکھتے تو کچھ الندوہ کے قابل لکھتے۔ اسکے لئے وقت محنت تفحص اور نظر سب کچھ درکار تھیں، اسلئے گاہے ماہے لکھنے کی نوبت آتی علامہ اکثر جز بز ہوتے، ایک مرتبہ تو لکھدیا کہ ان کو اپنے رئیسانہ مشاغل سے فرصت نہیں ملتی بعد کو اس لفظ پر ندامت ہوئی اور معافی چاہی۔ یہ انکی خاص خصوصیت تھی اپنی غلطی پر سخت انزجار

ہوتا تھا مگر علامہ کو علم کے سوا اور کام ہی کیا تھا، ان کو تو بہت کام تھے، خانگی امور کا سارا سر انجام ایک شاہانہ طبیعت کے بزرگ چچا کی اطاعت اور خدمت یہ کوئی معمولی کام نہیں ہوتا جو اسکو جو جانتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ اسلئے الندوہ کا بوجھ بہت کچھ علامہ پر پڑتا، اس رسالہ کی اہمیت اس سے زیادہ کیا کہی جاسکتی ہے کہ اپنے زمانہ میں دُنیا کا سب سے بڑا اسلامی مصنف اسکا اڈیٹر تھا۔

الندوہ نکلا، اگرچہ بڑے آب و تاب سے آجکل کے رسالوں کی طرح نہیں مگر بڑی آن بان کے ساتھ نکلا، ہر شخص کی نظر اُٹھتی تھی۔ شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد نے تو بچین ہو کر اسکا اعتراف ان اشعار میں کیا ؎

یقولون ان العلم والفضل والنہی تبیس علی المتقدم المتبصر
فلما تصفحنا صحائف ندوۃ وجدنا بان الفضل للمتأخر

تہذیب الاخلاق کچھ اور چیز تھا "معارف" چمکا، مگر جھلک دکھا کر ڈوب گیا لیکن الندوہ اسلامیات کا سب سے بڑا خدمتگذار ربع صدی اُدھر ہو گذرا ہے۔ ہمارے اڈیٹر صاحب معارف خفا ہوں۔ انکو ایک قصہ سناتا ہوں جو ان کے حق میں پیشین گوئی ہو کر اُترا۔ ایک دن شرر صاحب اور ہمارے علامہ بیٹھے تھے، دونوں نے اپنے اپنے پرواز پر اسلامی ادبیات کی خدمت کی تھی، میں نے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے اتنا کرلیا ہے کہ ہمارے لئے کیا رکھا! علامہ نے فرمایا، ابھی ہوا کیا ہے۔ شرر صاحب جو ہمیشہ مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے تھے، بولے "ہم نے تو داغ بیل ڈالی ہے، اب کیاریاں تم لوگ بھرنا۔" درحقیقت معارف کی خدمت ان دونوں بزرگوں کی یہی پیشین گوئی ہے۔

جوزف اڈیسن کے طرز تحریر کے متعلق ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ناقابل تقلید ہے، اور میری ناقص رائے میں ہر سچا مصنف اگر طبیعت میں زور ہے تو اپنی انشا آپ پیدا کرلیتا ہے، تقلید اس راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس سے ذہنی اور قلمی گرفتگی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگلے اردو انشا پردازوں میں سرسید اور نذیر احمد کو

چھوڑکر علمی انشاپرداز آزاد حالی اور شبلی ہیں۔ آزاد کا طریقۂ تصنیف یہ کہ سادہ کاری پر نقش بھرتے ہیں، یعنی پہلے مضمون لکھتے پھر اسکے کترنے کاٹ کاٹ کر اور نئے چیتے لگا لگا کر سارا صفحہ منبت کار بنا دیتے لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ عبارت میں آمد ہی معلوم تو ہوتی ہو مگر کسقدر پوشیدہ آورد کے بعد۔ حالی اپنا لکھا خود صاف کرتے اور صفائی کے وقت اسپر اصلاح دیتے جاتے۔ شبلی برجستہ لکھتے، کہیں کہیں حاشیے پر گھٹاتے بڑھاتے طبیعتوں کا اختلاف تو دیکھو، حالی صاحب کے مزاج میں جو سکون تھا وہ ان سے اپنا مسودہ صاف کرالیتا مگر علامہ کی طبیعت میں اضطراب تھا اسلئے مسودہ کسی منشی کے سپرد ہو جاتا۔

مجھے حیدرآباد سے لکھا تھا کہ تم کو مضمون نگاری کی تعلیم آکر دونگا، الندوہ کا تیسرا یا چوتھا نمبر تھا کہ مجھکو یاد فرمایا اور المقتطف کا ایک مضمون حفظان صحت اور درازی عمر کے متعلق دیا کہ اسکا ترجمہ کر ڈالو۔ میں نے صبح کو دوسرے روز ترجمہ پیش کیا۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے، صرف ایک دو لفظ بدلے میں بدخط جیسا کا تھا، فرمایا منشی عارف الزماں کو صاف کرنیکو دیدو اسکو صاف کراکے الندوہ میں چھپوا دیا۔ میں نے سب سے پہلے اردو معلی میں اپنا ایک نیا مضمون "قدرت کی صناعیاں" جو نثری شاعری تھا، لکھا تھا، وہ مضمون لوگوں نے بہت پسند کیا تھا، اسکے بعد تو جبتک لکھنؤ میں رہا الندوہ اور دیگر رسائل میں لکھتا رہا۔ علامہ مواد بتا دیتے، مگر اس تفحص ہی میں میں اکثر دو چار قدم آگے بڑھ جاتا، فرماتے کہ تم مواد خوب نکال کر جمع کر لیتے ہو۔ ایک مرتبہ مقریزی دیکھتے دیکھتے اسطول یعنی بیڑہ جہازات پر نظر پڑ گئی فرمایا اسکا اقتباس کر ڈالو۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ ماخوذ از مقریزی لکھنا تو کچھ ٹھیک نہیں لاؤ اور جستجو کروں، کچھ تو مقدمہ ابن خلدون میں ملا، پھر خیال ہوا اسماعیل کی تاریخ پر نظر ڈالوں، تونس کی تاریخ المونس اٹھائی اسمیں اسقدر ملا کہ خاصہ ایک مضمون ہو گیا، اسکے بعد ایک رسالہ پڑھا، عربی میں اس مضمون پر مگر اسمیں اس سے کم مواد تھا اور اب تو ہمارے دوست نے اسی پر

ایک مستقل تصنیف کر ڈالی ہے۔

ایک مرتبہ مختصر تاریخ قرآن اور ان چار مصاحف کی تاریخ پر جو حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مستند قرار دے کر اسلامی ممالک میں جاری کئے تھے، ایک مضمون لکھنے کا حکم دیا، وہ لکھ رہا تھا کہ ایک جگہ گاڑی رک گئی، نفح الطیب میں ایک صندوق کا اس قرآن کے لئے ذکر ہو جو کہ کانی سے کھلتا اور آپ سے آپ بند ہو جاتا، نفح الطیب کی عقدہ عبارت کے سمجھنے میں پھنس گیا کتاب لئے ہوئے حاضر ہوا، ہنسنے لگے، فرمایا میں تو میں بھی اٹکا تھا، پھر کہا سلمان اور میکانکس پر جو میرا مضمون رسائل شبلی میں ہی آمیں یہ ٹکڑا پورا موجود ہے مگر کس طرح سنو میں نے یہ ٹکڑا سید صاحب کو دکھایا انکو زبان پر بڑی قدرت تھی انھوں نے اس کا ترجمہ کر دیا وہی درج ہے اپنے الگ طرز تحریر کے مالک تھے۔ اُردو شعراء میں کون تھا جسکے کلام کا ذکر ہو اور ان کو کچھ نہ کچھ یاد نہ ہو، مشاعروں میں غزل سنی اور باہر آکر سنا دی، مگر اپنی زبان کو مستند کبھی نہ سمجھتے۔ ایک روز مجھے بڑی حیرت ہوئی، الفاروقؓ ان کو سب سے پیاری تھی، اسکا نیا ایڈیشن چھپوانا تھا، کتاب دیکر مجھ سے فرمایا کہ منشی وارث علی صاحب کو دے آؤ، میں نے اُن سے کہدیا جو ذرا اسکی زبان پر نظر کرلیں، درست ضرور کر دیں۔ میں لے گیا تو انھوں نے کئی دن اسکو غور سے پڑھکر چند مقامات پر نشان بنا کر واپس دیدی اور کہا کہ شبلی خود صاحب طرز بیان ہیں۔ علامہ نے وہ سب اصلاحیں منظور کرلیں، ساری عمر ایسے حلقہ میں بسر کی جہاں دلی ہی دلی تھی مگر لکھنؤ رہکر یہاں کی زبان کا چٹخارہ لینے لگے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا بھی تو فرمایا یہ چاٹ پرانی ہے، علی گڈھ سے بہت پہلے کی۔ مزاحاً فرماتے کہ اگر مجھکو موقع ملتا تو میں دو شادیاں کرتا، ایک کسی ایرانی عورت سے جو فارسی بولتی اور ایک لکھنؤ کی کسی بیگم سے جسکی زبان سنتا انکی طبیعت میں لوچ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور دل اسقدر نرم تھا کہ بعض واقعات حیرت انگیز دیکھے۔ گرمیوں میں پنکھا نہ کھنچواتے، ایک مرتبہ کسی علالت کے موقع پر میں نے عرض کیا تو فرمایا کہ بھائی کسی دوسرے کا پنکھا کھینچنا اور غلامی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات میں سیاسی انقلاب ذہنی وجہات سے زیادہ قلبی نزاکتوں پر مبنی تھا۔ اس زمانہ میں نے دیکھے مسلمانوں کی علمی اور نام نہاد سیاسی جماعت صرف ایجوکیشنل کانفرنس تھی، مگر بعض لوگ کانگریس سے بھی آشنا تھے۔ ہمارے چچا سجاد حسین مرحوم مسلمانوں میں کانگریس کے بڑے حامی تھے اور سرسید اور ان کے حواریوں کے سخت مخالف، سنا ہوں کہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور اسکے صدران کے خود ایک بزرگ جناب منشی امتیاز علی صاحب مرحوم مغفور تھے تو بزرگی خوردی بالائے طاق رکھکر انھوں نے کانفرنس کے بھرے اجلاس میں سرسید کو خوب خوب سنائی تھیں انکی صحبت میں کانگریس سے خوب واقفیت ہو گئی تھی، مگر اب مسلمانوں میں ایک کافی گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو کانفرنس کی عرضداشتوں سے گھبرا کر مسلمانوں کی سیاسی تیاری اور حقوق طلبی کے لئے ایک علیحدہ جماعت چاہتا تھا۔ لکھنؤ میں امروہہ کے ایک بیرسٹر صاحب حامد علیخاں صاحب بہتوں کو یاد ہونگے، بڑے زندہ دل شاعر اور خوش مزاج قوی آدمی تھے اور حق کے پتلے، نواب وقار الملک مرحوم اس گروہ کے مشیر و ترجمان تھے چنانچہ خوب یاد ہے کہ لکھنؤ کی رفاہ عام بارہ دری میں زیر صدارت عم محترم خان بہادر منشی اطہر علی صاحب ایک جلسہ کرکے مسلم لیگ کی داغ بیل پڑی جس کا دفتر برسوں ہمارے یہاں کوٹھی جناب منشی احتشام علی صاحب میں قائم رہا، پھر تو لیگ، لیگ اسوقت ہوئی جب بقول اکبر مرحوم آغا خاں لارڈ منٹو سے لیگ مانگ لائے۔ میرا اشارہ شملہ کے مسلم ڈیپوٹیشن کی طرف ہے۔

علامہ کے سیاسی خیالات میں انقلاب ہو چکا تھا۔ یہ تو محض غلط ہے کہ وہ ہندوؤں کے دوش بدوش چلکر کوئی کام کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کا سیاسی فلسفہ خیال ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے نکتۂ خیال سے کبھی نہیں متجاوز ہوا۔ دوسری قوم کی کوششیں دیکھکر متاثر ہوتے اور ان کو اپنے یہاں کرکے دکھنا چاہتے۔ گر کل دکھیا تو سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح قائم کیا۔ ان کا خیال پہلے اپنے میں اہلیت پیدا کرنیکا

تھا بسر سید کی کوششوں کا نتیجہ ان کے نزدیک "صنع الشئی فی غیر محلہ" ہوکر رہگیا تھا اسی وجہ سے ان کو کوئی رغبت ایجوکیشنل کانفرنس سے نہیں باقی رہی تھی۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ سرسید کے بنائے شبلی اب سرسید کے خلاف ہوگئے۔ اسمیں جرم کیا تھا، کتنے سرسید کے پیدا کئے ان کے خلاف ہو چکے تھے وہ ایک تجربہ کو کامیاب نہ پاکر مسلمانوں کے لائحۂ عمل کو ضرور بدلنا چاہتے تھے کسی وقتی یا سیاسی ضرورت سے اتحاد عمل دوسری قوم کے ساتھ جیسا محمدؐ اور شوکت مرحومین نے کیا اور پھر تائب ہوگئے۔ اس سے زیادہ پسند نہ فرماتے، وہ کانگریسی کبھی نہیں ہوئے میرے دل میں کانگریس کی کوئی عظمت نہیں قائم ہوئی بلکہ جب بنگال میں جوتیوں میں دال بٹی تو حقیقت آشکارا ہوگئی، غوغائیاں کسی غیر حرف پا کو آتے دیکھکر غل مچانے لگیں۔ لیگ حقوق طلبی کے بجائے اگر اصلاح قومی پر زور دیتی تو زیادہ کام کرسکتی، مگر اصلی خدمت قوم کی اس سے بھی نہ بن پڑی میرے دل میں یہ خیالات ہمیشہ پختہ ہوتے گئے اور آجتک انھیں پر میں قائم ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کانگریس اور لیگ دونوں انمیں ہیں۔

یقولون اقوالا ولا یعلمونہا ۔۔۔۔ اذا قیل ہاتو احققوا لم یحققوا

انکو سالانہ میلہ کرتے اور جوش دکھاتے اتنے دن ہوگئے مگر پایا کیا چند کاغذی سمجھوتے عملی عقدوں کی گرہ کشائی دونوں سے نہ بن پڑی اسکے ذمہ دار ہم میں فقدان اہلیت ہے۔ "ان الارض یرثہا عبادی الصالحون" کا حال کے تجربوں میں پڑ کر صلاحیت کا ۔۔۔ کھُل گیا۔ جن باتوں پر دوسروں نے حرف گیری کی تھی اس سے زیادہ خود کر دکھائیں۔

نقد و نظر

نمونہ اردو انسائکلوپیڈیا مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

دنیا کی ہر زندہ زبان و ادب کے لئے انسائکلوپیڈیا کی جس قدر ضرورت ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، دنیا کی اکثر زبانوں، اور ہندوستان کی بعض بعض زبانوں میں عام اور فنی دائرۃ المعارف مرتب ہو چکے ہیں اردو میں اہل علم اور اہل قلم کو عرصہ سے اردو انسائکلوپیڈیا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، بعض ضمنی معلومات کے لئے بعض مرتبہ سیکڑوں صفحے پڑھنے پڑتے ہیں اور پھر بھی قابل وثوق معلومات حاصل نہیں ہوتے، لیکن یہ کام کسی ایک فرد کے بس کا نہ تھا، اسی لئے بعض لوگوں کو شروع کرنے کے بعد مجبوراً اس عظیم الشان کام سے دستبردار ہونا پڑا، یہ کام یا تو کوئی بہت بڑا ادارہ کر سکتا تھا جس کے پاس علمی اور مالی وسائل کی کمی نہ ہو یا کوئی حکومت، اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو یہ دونوں چیزیں یکجا حاصل ہو گئیں، اور حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو نے اس کام کا آغاز کر دیا، یہ ادارہ اپنے متعلق اشخاص، ایک بڑے علمی مرکز سے تعلق اور ایک اعلیٰ علم دوست اور اردو کی سرپرست ریاست کی امداد کی بنا پر ہر طرح اس اہتم بالشان کام کو انجام دینے کا اہل ہے۔

ادارہ نے اپنے کام کا ابتدائی نمونہ تنقید و مشورہ کے لئے بھیجا ہے، اس نمونہ کو دیکھنے سے اس کا اطمینان ہوتا ہے، کہ مرتبین کے سامنے ایسے دائرۃ المعارف کا جو اردو کے لئے موزوں اور اردو داں اصحاب کے لئے کافی ہو صحیح تصور ہے اور وہ کام کو محنت اور دلچسپی سے کر رہے ہیں، بڑے سائز کے ۱۲ صفحوں میں (جن میں ہر صفحہ میں تین کالم ہیں) مختلف تاریخی، جغرافی، ادبی، طبی، فنی مضامین اور عام معلومات پر ۹۱ مضامین ہیں، جو مطالعہ اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں، بعض مضامین بعض ایسے مبصرین کے قلم سے ہیں، جو اس موضوع پر لکھنے کا پورا حق رکھتے ہیں اور یہ ادارہ کی کامیابی ہو کہ

اس کو ان کا تعاون حاصل ہے مثلاً نظریہ اضافیت پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مضمون عربی زبان وادب کے شعبے میں کسی غیر مستشرق ہندوستانی عالم کا نمونا ایک کی ہے اور منتظمین ادارہ کے وسعت خیال کے منافی ہے بعض جگہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقالہ نگار اسلامی تمدن اور مسلمانوں کے تمدن کے درمیان فرق نہیں کرتا ہارون رشید اور بابر کی طرف اسلامی تمدن کی توسیع کی نسبت اسی غلط فہمی پر مبنی ہے (صفحہ کالم ا) اسی طرح اکبر کو ایک نئے ہر دلعزیز تمدن کا بانی قرار دینا مسلمانوں کے نقطہ نظر سے محل بحث ہے (صفحہ کالم ۲) لیکن یہ مسامحات جو زبان اور خیالات میں پیوست ہو چکی ہیں ایسی نہیں کہ ان سے اس اہم علمی کارنامہ کی عظمت میں کچھ فرق آئے۔

ادارہ کو اپنے موضوعات کی فہرست مرتب کرنے میں کافی وقت نظر اور وسعت نظر سے کام لینا پڑے گا اردو ادبیات میں (اپنے وسیع معنیٰ میں) بہت سے ایسے الفاظ اور اشخاص داخل ہو گئے ہیں جن کے متعلق اس کے انسائکلوپیڈیا میں ضرور معلومات ہونے چاہئیں، کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی ایسا اہم موضوع نہ رہ جائے اور کوئی غیر اہم موضوع کتاب کے صفحات کو نہ گھیرے اس بارہ میں ادارہ کو مختلف موضوع اور ذوق رکھنے والے اصحاب کے امداد و مشورہ کی ضرورت ہے

ادارہ اس اہم علمی اور ادبی خدمت پر قابل مبارکباد ہے اور اردو سے محبت رکھنے والوں اور اس کی خدمت کرنے والوں کے لئے مسرت کا موقع ہے کہ اس کام کا موزوں ماحول اور معاون حالات میں آغاز ہو گیا ہے، خدا تکمیل کی توفیق عطا فرمائے (ا - ع)

اس سلسلہ میں اس پتہ پر خط و کتابت کی جا سکتی ہے،

فیض محمد صاحب صدیقی و سید بادشاہ حسین صاحب، ادارہ ادبیات اردو

خیریت آباد، حیدر آباد دکن

معاشیات ہند | ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب بی اے (علیگ) شائع کردہ دار الترجمہ حیدر آباد

کاغذ، کتابت، طباعت بہتر صفحات ۴۱۲ قیمت درج نہیں۔

معاشیات ہند کے موضوع پر (ATHAR AND BERI) کی (INDIAN ECONOMICS) ایک بے نظیر تصنیف سمجھی جاتی ہے دارالترجمہ کی جانب سے اس کتاب کے ۳۷ء کے اڈیشن کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے یہ کتاب کی پانچویں اشاعت تھی اس کے بعد ملک کے معاشی حالات میں تغیر ہوا تو ۳۹ء میں چھٹا اڈیشن شائع ہوا جدید اصلاحات کی روشنی میں تازہ ترین اعداد و شمار کی مدد سے تقریباً سارے مباحث پر نظر ثانی کی گئی لیکن موضوع کی تغیر پذیری کا یہ حال ہے کہ کتاب کے بازار میں آتے آتے بعض مباحث پھر نظر ثانی کے محتاج ہو گئے اور اب تو دو برس میں کتاب کی از سر نو اشاعت کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کاش دارالترجمہ کی جانب سے کوئی ایسا انتظام ہو جاتا کہ اصل کتاب کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی اس کا ترجمہ شائع ہو جایا کرتا تاکہ اردو داں طبقہ بھی اپ ٹوڈیٹ معلومات سے مستفید ہو سکتا بہرحال بحالت موجودہ یہ بھی غنیمت ہے کہ ۳۷ء ہی تک کی معلومات اردو خواں طبقہ کے سامنے آگئیں اب اس کے ساتھ اگر ۳۹ء کے اڈیشن کو اور اس کے بعد کے تغیرات کو پیش نظر رکھ کر ایک ضمیمہ شائع کر دیا جائے تو یہ کمی پوری ہو جائے اور کتاب بالکل مکمل ہو جائے امید ہے کہ دارالترجمہ کے محترم ارکان اور ناظم صاحب سر رشتہ تالیف و ترجمہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے اس بارے میں ہمیں جناب مولوی محمد الیاس صاحب برنی سے خاص توقعات ہیں بہتر ہوتا کہ اس سلسلہ میں جناب مولوی صاحب اپنی کتاب معیشت الہند نظر ثانی کے بعد پھر سے شائع فرماتے۔ (ر ق)

حالات ندوہ

تعطیل گرما کے بعد حسب معمول پہلی جولائی کو دارالعلوم کھل گیا، مدرسین و طلبہ تقریباً سب آ گئے ہیں، تعلیم تیزی سے ہو رہی ہو، مفتی محمد سعید صاحب ندوی البتہ ابھی تک نہیں آ سکے، تعطیل کے کچھ پہلے ہی وہ سخت علیل ہو گئے تھے تعطیل بھر علالت کا سلسلہ جاری رہا، اب بحمد اللہ مرض جا تا رہا ہے، لیکن ضعف کافی ہو، غالباً جولائی کے آخر تک کام شروع کر سکیں۔

ان صفحات کے قارئین کو معلوم ہو کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی مدظلہ وقتاً فوقتاً دارالعلوم تشریف لاتے رہتے ہیں تاکہ اپنے مفید اور مناسب مشوروں سے کارکنوں کی رہنمائی فرمائیں۔ چنانچہ ابکی وسط جون میں مولانا مسعود علی صاحب تشریف لائے تقریباً دو دن قیام رہا۔ آخری ہفتہ میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے شرفیاب فرمایا۔

دارالعلوم سے متعلق بعض تعمیری اور تنظیمی اصلاحات کا ذکر ان سطور میں ہوتا رہا ہو، اس مرتبہ تعطیل میں بھی اس قسم کے کچھ کام انجام پائے، دارالعلوم اور دارالاقامہ کے درمیان سڑک ایک کچی تھی جس سے آنے جانے والوں کو خاصی تکلیف ہوتی تھی، برسات میں خصوصاً سخت پریشانی کا سامنا ہوتا تھا، ندوہ کے طلبہ اور متعلقین کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ اب یہ مصیبت دور ہو گئی اور سڑک پختہ ہو گئی دارالعلوم کے مغربی جانب ایک خوشنما پارک کی داغ بیل پڑ رہی ہو، سامنے کا میدان بھی رفتہ رفتہ صاف کرایا جا رہا ہے، چھوٹے بچوں کے لئے ایک علحدہ دارالاقامہ کا نقشہ بن رہا ہو، اُمید ہے کہ جلد ہی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔

مجلس شبا رکا ذکر وقتاً فوقتاً ان صفحات میں ہوتا آرہا ہے تعطیل بعد نیا انتخاب عمل میں آیا اور حسب ذیل اصحاب اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے۔

نقیب عام۔	محمد اسحاق پشاوری
نقیب	عبدالغفار۔ عبدالحلیم
نقبائے تعلیم۔	وحیدالرحمٰن۔ محمد مصطفےٰ
نقبائے صلوٰۃ۔	مصلح الدین۔ محمد یوسف الہ آبادی
نقبائے صحت۔	سراج الحسن، محمد انور بری

۹ر جولائی کو مجلس الدعوۃ الارشاد کے ماتحت ایک جلسہ منعقد ہوا جسمیں مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ایک مؤثر سبق آموز، وجد آفریں اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی جسمیں طلبائے دارالعلوم کو ان کے بلند مقصد زندگی کی طرف توجہ دلائی اور زمانہ کے اس انقلاب انگیز دور میں انھیں اُمت وسط بننے کی دعوت دی۔ آپنے فرمایا کہ آج کفر والحاد اور شک وارتیاب کے اس پرشور دور میں پیغمبرانہ عزم و ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے، تاکہ ظلمت کے سیاہ بادل چھنٹ جائیں اور حق کا اُجالا ایک بار پھر اس دنیا کو مطلع انوار بنا دے۔

ندوہ کی تبلیغی جدوجہد کا ذکر ہو چکا ہے اس سلسلہ میں ترجمہ قرآن مجید کا کام بھی شروع ہوا ہے ڈالی گنج میں شاہ عزالدین صاحب ندوی ہفتہ وار درس دیتے ہیں عنقریب دوسرے اور محلوں میں بھی یہ کام شروع ہونے والا ہے۔

الندوہ

زیرنگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ مطابق اگست ۱۹۴۱ء عیسوی نمبر ۸

قیمت فی پرچہ تین آنے — سالانہ دو روپے

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

وائسرائے کی مجلس عاملہ میں توسیع کی اطلاع عام طور سے اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اس جدید توسیع شدہ مجلس کے ایک رکن سر اکبر حیدری صدر اعظم ریاست حیدرآباد بھی مقرر ہوئے ہیں. اس نئے تقرر کی وجہ سے ریاست میں جو منصب خالی ہو رہا ہے اس کے لئے نواب سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری کا تقرر عمل میں آیا ہے ستمبر میں موصوف اپنے عہدہ کا چارج لے لیں گے اور باضابطہ کام شروع کر دیں گے. نواب صاحب کے تجربہ اور صلاحیت کے متعلق کسی تعارف کی ضرورت نہیں مدتوں صوبجات متحدہ اور حکومت ہند کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہ چکے ہیں برسہا برس صوبجات متحدہ میں ہوم ممبری کے فرائض انجام دئے کچھ عرصہ تک وائسرائے کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے کئی بار گورنری کے لئے انتخاب ہوا اور مہینوں خوش اسلوبی سے یہ خدمت انجام دی ۱۹۳۵ء کے دستور کے مطابق جب صوبوں میں نئی اصلاحات رائج ہوئیں تو سب سے پہلی وزارت آپ ہی نے مرتب کی اور اس دشوار عبوری دور میں نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دئے اس عرصہ میں صوبہ کی ترقی اور یہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو کام ہوئے ان کی تفصیل اس سرکاری بیان میں آج بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو آپ نے وزارت سے علیحدگی کے وقت اپنے کابینہ کی جانب سے شائع کیا تھا.

دنیاوی عزت و وجاہت کے ساتھ نواب صاحب کی ذات اپنی سادگی، وضعداری، مشرقی تہذیب اور اسلامی اخلاق کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے حکومت کے بلند مناصب کے باوجود انکی اس وضعداری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا ندوہ اور اسکے کارکنوں سے موصوف کا دیرینہ تعلق ہے مسجد کی تعمیر میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا ابھی حال میں نظام اسلامی کی ترتیب و تدوین کی غرض سے جو کمیٹی مقرر ہوئی ہے وہ تمام تر آپکی کوششوں کی رہین منت ہے ہم آپکے اس تازہ تقرر کو ایک فال نیک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ کی صدارت عظمیٰ سے حیدرآباد میں ایک نئے شاندار دور کا آغاز ہو گا.

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ پچھلی مرتبہ لاہور تشریف لے گئے تھے تو آپ نے وہاں بعض حضرات کو ندوہ کی امداد و اعانت کی جانب توجہ دلائی تھی جون میں مولوی حامد علی صاحب ندوی ناظم معین الندوہ لاہور تشریف لے گئے تاکہ اس کام کو اور آگے بڑھائیں اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں بھی معین الندوہ کی شاخ قائم ہو گئی جناب مولوی محمود علی صاحب بار ایٹ لا اس کے صدر خواجہ عبد الوحید صاحب سکریٹری اسلامک انسٹیٹیوٹ اس کے ناظم مولوی محمد حنیف صاحب ندوی اس کے خازن اور صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور جناب عبد اللہ خاں صاحب بٹ بی اے *حکیم عبد المجید صاحب صدیقی اور شیخ محمد العربی پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اس کے ارکان منتخب ہوئے ہیں ہمیں امید ہے کہ اس مجلس کا حلقہ اثر ابھی اور بڑھیگا اور یہ مسلمانان پنجاب اور دار العلوم ندوہ کے درمیان خاص ربط و تعلق کا باعث ہوگی اس سلسلہ میں احسان ناشناسی ہوگی اگر جناب سر شیخ عبد القادر صاحب اور جناب نواب مظفر خان صاحب کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا اعتراف نہ کیا جائے ناظم صاحب معین الندوہ کی کامیابی بڑی حد تک آپ ہی حضرات کی توجہات کی رہین منت ہے ہمیں امید ہے کہ کرم فرمائیوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا۔

ناظم صاحب معین الندوہ کے اس دورہ کے علاوہ مولوی مظفر حسین شاہ ندوی نے بھی خاصہ کام کیا تعطیل کے زمانہ میں ریاست پونچھ و کشمیر کے متعدد مقامات کا دورہ کیا اور وہاں کے ممتاز و سر برآوردہ اصحاب کو ندوہ کی جانب توجہ دلائی ان کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ندوہ کے ہمدردوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ پیدا ہو گیا ہے اس بارہ میں ہم جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں و کشمیر اور جناب خان بہادر عبد القیوم خان صاحب ناظم اعلیٰ ریاست پونچھ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ندوہ کی جانب توجہ فرمائی اور اپنی امداد و اعانت کا یقین دلایا ہمیں امید ہے کہ آپ حضرات کی عنایت و ہمدردی کا سلسلہ آئندہ بھی برابر جاری رہیگا اور آپکی توجہ سے ندوہ کو بیش از بیش فوائد حاصل ہوتے رہیں گے اس سلسلہ میں ہم جناب پیر سید محمد کبیر شاہ ناظم تعلیم الاسلام باغ، جناب شیخ نبی بخش صاحب نظامی مدیر المجاہد و ناظم عام انجمن اسلامیہ پونچھ اور جناب ڈاکٹر محمد حیات خاں صاحب میڈیکل آفیسر انچارج باغ اسپتال کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس جد و جہد میں مولوی مظفر حسین صاحب کو کافی مدد دی جس کا سلسلہ امید ہے کہ آئندہ بھی جاری رہیگا۔

میری محسن کتابیں

از جناب پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے، سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڑھ

ایک وقت تھا جب علامہ شبلی مرحوم کے الندوہ میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ مولانا نواب فردوس نشین ہیں، لیکن الندوہ فیض سلیمانی سے مرکر جی اُٹھا ہو۔ البتہ میری حالت یہ ہے۔

"اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند"

پھر بھی عزیزی ابوالحسن علی کا اصرار ہوا اور مجھے خاطر عزیز منظور رہا اسلئے یہ چند سطریں تحریر ہیں۔

(۱)

بچپن میں جب سے مکتب میں بٹھایا گیا اُسوقت سے ابتک جبکہ عمر رواں کے ۷۰ مرحلے طے کرچکا ہوں طالبعلم ہوں، لیکن واقعہ یہ ہو کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد"

خیر اگرچہ فلسفیانہ رنگ میں کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن میری دُعا یہی رہی اور رہیگی "رب زدنی علما" میرے والد ماجد میر فرزند علی صاحب قبلہ وکیل مرحوم تہجد گذار تھے اور نماز فجر کے بعد تلاوت کلام اللہ کے عادی تھے۔ میری عمر قریب گیارہ برس کے تھی، جب وہ آخر نہ حیدرآباد تشریف لیگئے، چلتے وقت کلام مجید کا ایک نسخہ دیا جو ۱۲[illegible]ھ کا چھپا ہوا تھا، مطبع نظامی کی تصحیح کی ہوئی، متن کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ اردو۔ یہ نسخہ اُسوقت شائع ہوا تھا جب بنا ہو کہ مطبع میں کام کرنیوالے با وضو اور احتیاط سے کلام مجید چھاپتے تھے۔ جناب قبلہ نے نسخہ دیکر فرمایا کہ روزانہ تلاوت کرتے رہنا اور ترجمہ بھی پڑھا کرنا، کچھ عرصہ تک میں محض تعمیل ارشاد کرتا رہا، لیکن پھر شوق پیدا ہو گیا، اور ابتک شاید ہی کسی دن تلاوت میں ناغہ ہوا ہو۔ نسخہ اگرچہ اب بہت بوسیدہ ہو گیا ہو اور باوجودیکہ عمدہ چھپے ہوئے نسخوں کی اب کمی نہیں ہے لیکن اسی کہنہ نسخے کو سینہ سے لگائے رہتا ہوں، اسکے صفحوں پر کہیں کہیں کچھ مٹے ہوئے دھبے بھی

نظر آتے ہیں جو اس عمر رفتہ کی یادگار ہیں جب قلب میں اسقدر قساوت نہ تھی۔ میری زندگی میں
دناگوں انقلاب ہوئے متعلم سے معلم بنا اور مصنف کی حیثیت سے نشانۂ ملامت بھی، لیکن خواہ کوئی
انے یا نہ مانے میرا تو یہی یقین ہے کہ۔

"ہرچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم"

میری پہلی محسن کتاب کتاب اللہ ہے اسی سے مجھے ہدایت نصیب ہوئی۔ اور یہی دونوں جہان میں
میرے لئے نورٌ علیٰ نور ہے۔

(۲)

میری تعلیم مکتب سے شروع ہوئی اور تھوڑے عرصہ کے بعد انگریزی اسکول اٹاوہ میں داخل کردیا
یا، لیکن مدرسہ کے ساتھ مکتب کی پرانی تعلیم ساتھ ساتھ چودہ برس کی عمر تک جاری رہی۔

اسکول میں مولوی ظہور احمدؒ صاحب لاہپوری مرحوم فارسی کے پروفیسر تھے بڑے متقی اور پرہیزگار
ور امام حجۃ الاسلام غزالیؒ کی تعلیمات کے شیدا، فارسی کورس پڑھاتے وقت اکثر امام موصوف کا تذکرہ
رماتے تھے! اور جب میں اُن کی خدمت میں مکان پر حاضر ہوتا تھا تو امام صاحب کے حالات زندگی مؤثر
یرایہ میں بیان فرماتے تھے! اسکا اثر یہ ہوا کہ میں امام صاحب کی تصانیف کا ایسا گرویدہ ہوگیا کہ جب
۱۸۹۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے گیا تو امام صاحب کی کوئی نہ کوئی تصنیف سفر و حضر میں اپنے
ہمراہ رکھتا تھا۔ کیمیائے سعادت، احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال نے مجھپر خاص اثر کیا، بعد کو اگرچہ
یں نے ملحدوں اور دہریوں کی تصانیف اور مختلف مذاہب کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن ہمیشہ
"توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین" کی دعا دل سے نکلتی رہی۔ میرا ابتک یہ معمول ہو کہ ۱۴ جمادی الثانی کو
و امام صاحب کے وصال کا دن ہو صبح سے احیاء العلوم یا کیمیائے سعادت یا منہاج العابدین کا کوئی
جزو پڑھتا ہوں اور امام صاحب کی حیات طیبہ پر غور کرتا ہوں پھر بعد عصر فاتحہ پڑھکر ایصال ثواب کرتا ہوں۔

لکھنؤ کے قیام میں مولانا شرر مرحوم کے دلگداز اور دیگر مضامین و تصانیف کے مطالعہ سے اردو ادب کا شوق پیدا کر دیا شعر و سخن کا ذوق بھی انیس آتش غالب اور حالی کے کلام سے پیدا ہوا۔ اسلامی فرقوں کے باہمی مناظرے کی کتابیں اگرچہ اس زمانہ میں بہت دیکھیں، لیکن "جنگ ہفتاد و دو ملت" بجائے سکون قلب کے اُلجھن پیدا کرتی تھی۔ البتہ کتب تصوف اور ملفوظات بزرگان دین میں ایک دلکشی پاتا تھا شیخ عطارؒ کی تذکرۃ الاولیا، عارف رومؒ کی مثنوی، اور فتوح الغیب حضرت غوث الاعظمؒ اکثر پڑھا کرتا تھا۔

(۳)

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب علی گڈھ گیا تو یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ اگرچہ سرسید مرحوم کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا لیکن اُن کی مذہبی تصانیف خاصکر تفسیر القرآن کا کوئی بھولے سے بھی نام نہیں لیتا تھا۔ لکھنؤ کے قیام میں سرسید کی مذہبی تصانیف خصوصاً تفسیر نیچریت کی تعلیم سنا کرتا تھا، لیکن علی گڈھ میں دل نے کہا کہ مخالفین اسلام کی کتابیں تو پڑھتے ہو، کیا وہ درد ملت رکھنے والا سید افسے بھی بدتر ہے۔ اب میں نے خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، اور دیگر تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا سورۂ انفال کی تفسیر میں جہاں سرسید نے جملہ غزوات ایک جا جمع کر کے لکھے ہیں مجھے بہت پسند آئے خصوصاً غزوۂ بدر میں جو محققانہ بحث ہے مجھپر سرسید مرحوم کے خلوص، تلاش حق اور محبت اسلام کا ایک خاص اثر ہوا، اگرچہ بعض مقامات پر جہاں علوم جدیدہ سے مرعوبیت ٹپکتی تھی، میں انکی رائے سے متفق نہ تھا اور سلف صالحین کا متبع تھا۔ افسوس ہے کہ سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر نہ کی گئی۔ کاش علیگ بھی ندویوں کی طرح کچھ کرتے! اور مسلم یونیورسٹی دار المصنفین کی طرح کوئی دینی کارنامہ پیش کرتی۔ میں یہاں کسی جماعت کو گرانا یا بڑھانا نہیں چاہتا، صرف دل دردمند کا اظہار خیال ہے۔ خدا کرے ادھر بھی توجہ ہو۔

سر سید کی تصانیف کے ساتھ میں نے جسٹس امیر علی مرحوم کی اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف دی سراسینز اور آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کا بھی غور سے مطالعہ کیا اور علامہ شبلی مرحوم کی الکلام، الغزالی اور رسائل سے مستفید ہوا۔ اب مجھ میں تاریخ و سیر کا شوق پیدا ہوا۔ اور کچھ خدمت دین بجا لانے کے لئے تیار رہوا

۱۹۰۸ء میں جب میرا تقرر بڑودہ کالج میں ہو گیا تو سب سے پہلے آنحضرت صلعم کی سیرت پاک پر دس مضامین سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے لکھنا شروع کئے۔ اس زمانہ میں مولانا شبلی بڑودہ تشریف لیگئے اور جسٹس عباس طیب جی مرحوم کے بنگلہ پر پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا کی تصانیف مجھے پہلے ہی گرویدہ کر چکی تھیں، اب ان کے حسن اخلاق، لطف تقریر، ذوق سخن اور تبحر علمی نے اور بھی گرویدہ کر لیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تعطیلوں میں جب بھوپال جاتا تھا تو منشی منصب علی صاحب کے مکان پر مولانا سے اکثر شرف ملاقات حاصل ہوتا تھا۔

تذکرۃ المصطفیٰ ۱۹۱۰ء میں شائع ہو گئی تو مولانا کا یہ ناقدانہ فقرہ کہ "کتاب پرانے رنگ میں اچھی ہو مگر ایک نئے تعلیم پائے ہوئے سے کچھ اور ہی امید ہو" تازیانہ کا کام کر گیا۔ اور میں نے فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ خصوصاً اسپنسر، ڈارون، ہکسلے، ہیگل، الیورلاج، ولیس، ہاڈنگ اور برگسن کی تصانیف پر غور کرتا رہا۔ پھر معارج الدین کا حصۂ اول شائع کیا۔ مگر افسوس مولانا اسی سال رحلت فرما چکے تھے۔

اس اثناء میں ہز ہائنس مہاراجہ صاحب گائکواڑ نے علم موازنۂ مذاہب کی ایک شاخ ہندوستان میں سب سے پہلے بڑودہ کالج میں کھولدی اور اسکے ناظم پروفیسر وجری جو فرانس اور جرمنی میں الٰہیات کی تکمیل کر چکے تھے اور ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا آف رلیجن کے مضمون نگار تھے مقرر ہوئے۔ پروفیسر موصوف سے بہت جلد بے تکلفی ہو گئی، وہ علم موازنۂ مذاہب پر ایک کتاب

لکھ رہے تھے اور میں نے تاریخ صحف سماوی لکھنا شروع کی تھی۔ اور مہاراجہ صاحب نے ایک کافی رقم فراہمی کتب کے لئے عطا فرمائی تھی۔ وجری صاحب نے کتب یہود و نصاریٰ کے معتبر ماخذ بیرسے سلئے جمع کر دیے اور میں نے تفسیر، حدیث، رجال، تاریخ اور سیر کی اسلامی مستند کتابیں فراہم کرلیں۔ اور انسے مستفید ہونے لگا اور وجری صاحب کو اسلام کے متعلق نوٹس لکھوانے لگا۔ تاریخ صحف کے خاتمے پر میں نے ان ماخذوں کی ایک فہرست دیدی ہی لیکن چونکہ یہ کتاب جو ۱۹۱۹ء میں چھپی تھی اب نایاب ہے اسلئے چند کتابوں کے نام جن سے خاص طور سے مستفید ہوا ہوں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) وریلیم ریفرنس بائبل (۲) ابوکریفہ جس کا ترجمہ انگریزی میں چارلس نے ۱۹۱۳ء میں کیا۔ (۳) جوئش انسائیکلوپیڈیا (۴) وسٹ کاٹ کا ہسٹارک فیتھ (۵) گرانز ہسٹری آف دی جیوز (۶) فان سوڈن کی بکس آف نیوٹسٹامنٹ (۷) ڈالمر کی وانتروپولوجی۔

تفاسیر میں اگرچہ کسی واقعہ کو تفسیر کبیر، خازن، ابن کثیر، بیضاوی وغیرہ میں ایک ساتھ دیکھتا تھا لیکن تفسیر ابن جریر خاص طور سے پیش نظر رہتی تھی اسمیں موافق اور مخالف سب روائتیں کسی واقعہ کے متعلق جمع ہوتی تھیں انکو پھر طبقات ابن سعد، اصابہ اور میزان الاعتدال کی کتب رجال سے جانچ کر کے کوئی رائے قائم کرتا تھا۔ تفسیر صافی اور مجمع البیان بھی پیش نظر تھیں اور صحیحین کے ساتھ کافی بھی دیکھتا تھا۔ آجکل کی افسوسناک فضا میں میری پرنم آنکھوں کے سامنے وہ وقت پھرتا ہو جب علمائے فرنگی محل اور مجتہدین دونوں ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے تھے۔

میں نے اپنی محسن کتابوں کے چند نام تحریر کر دیے۔ اصل احسان مصنفین کا ہو جنکا رہین منت ہوں اور انکے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں باستثنائے ایک مصنف کے جو عالم الغیب حکیم و علیم ہو اور جس کی بارگاہ قدس میں سر نیاز جھکا کر یوں عرض کرتا ہوں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

رسالت

بسلسلۂ مضامین قرآن

از
ابوالحسن علی ندوی

فطرت انسانی کے سوالات

انسان کی فطرت کے کچھ سوالات ہیں جو روزِ ازل سے اسکی گہرائیوں سے اٹھتے ہیں، ان سوالات کو نہ حیلوں بہانوں سے ٹالا جا سکتا ہے، نہ ان کے جواب سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے، اس عالم کو کون چلا رہا ہے، اس کے کیا صفات ہیں، اس کا ہم سے اور ہمارا اس سے کیا تعلق ہے، اس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے اور یہ کہ اس زندگی کا انجام اور اس عالم کا منتہا کیا ہے ؟!

یہ وہ سوالات ہیں جو بالکل طبعی اور قدرتی ہیں، اور انسان کی فطرت سلیم کو پورا حق ہے کہ وہ انسان سے پوچھے کہ وہ جس دنیا میں بستا ہے اس کو کس نے بنایا اور کون اس کو چلا رہا ہے، پھر جبتک اس کو اس کے صفات نہ معلوم ہوں، اس کو اس سے کوئی قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق نہیں پیدا ہو سکتا، دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ جبتک کسی شخص کی سیرت اور اخلاق وصفات سے ہمیں واقفیت نہیں ہوتی، ہمیں محض اس کے نام سے تعلق پیدا نہیں ہوتا، پھر اگر ہم خالق کائنات کے متعلق اس کے سوا کہ وہ موجود ہے کچھ نہ جانتے ہوں، اس کی ربوبیت وحکمت، قدرت واختیار، علم واطلاع، محبت ورأفت، اور اس کے جلال وجمال کی دوسری صفات، اس کا ہم سے قریب ترین تعلق، اور ہماری اس کی طرف شدید ترین احتیاج اور اس کے سہارے ہمارے قیام وبقا کا حال معلوم نہو، اس سے ہمیں وہ تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو ایسی ذات سے پیدا ہونا چاہئے،

اسی طرح وہ اپنے اس سوال میں بالکل حق بجانب ہے کہ زمین کی اس مملکت میں بسنے والوں سے صاحبِ مملکت کے کیا مطالبات ہیں، اس لئے کہ کسی کی سلطنت میں رہنے والوں کا پہلا فرض ہے کہ اس کا نظام و

قانون معلوم کریں۔

اسی طرح سے یہ بھی بالکل طبعی امر ہے کہ وہ اس زندگی کے متعلق جاننا چاہے کہ اس کا آخر کیا ہے اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس لئے کہ اس سوال کا تعلق نہ صرف اس کے مستقبل سے ہے بلکہ اسکے حال سے بھی ہے جس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہے جس میں پہلی زندگی کا حساب کتاب ہوگا، اور اس پہلی زندگی کے اعمال کے مطابق اس کو جزا و سزا ملے گی، اس شخص کا طرز عمل موجودہ زندگی میں اس شخص سے بالکل مختلف ہوگا جو موجودہ زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی کا کوئی تصور نہیں رکھتا، اس لئے یہ سوال اس کی اس زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کے جواب میں تاخیر کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس مسئلہ کو طے کئے بغیر اس زندگی کی صحیح تشکیل نہیں ہو سکتی!

ہماری زندگی کے بنیادی سوالات ہیں، جن پر نجات و سعادت کا دار و مدار اور ہماری قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، جن کے جواب میں ذرا سی غلطی اور لغزش ہماری ابدی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے، یہ زندگی ہم کو صرف ایک مرتبہ کے لئے ملی ہے، اور یہ ہماری سب سے قیمتی متاع ہے وہ محض قیاس و تخمین، اور آزمائش و تجربہ میں گذاری نہیں جا سکتی،

ان سوالات کے علاوہ کچھ سوالات اور بھی ہیں، جن کا تعلق بھی ہماری روزمرہ زندگی سے ہے، ہمارے گرد و پیش کائنات کی جو طویل و عریض بساط پھیلی ہوئی ہے اس میں ہمارا اصل محل و مقام کیا ہے؟ ہمارا اپنے گرد و پیش کی دنیا سے اور اس کا ہم سے کیا تعلق ہے، ہماری اس ہنگامۂ ہستی میں حیثیت اور مقصد کیا ہے؟ ہم تحت ہیں یا خود مختار، ذمہ دار ہیں یا غیر ذمہ دار، اگر ذمہ دار ہیں تو کس کے سامنے اور ہماری ذمہ داری کس حد تک ہے؟ ہماری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری اپنی ہیں یا کسی دوسرے کی ملک، ان کا طریق استعمال کیا ہے اس زندگی کا کمال مطلوب اور منتہائے نظر کیا ہے، یہ اور ایسے متعدد سوالات ہیں، جو ہمارے لئے فوری طور پر حل طلب ہیں اور زندگی کے مرکزی سوالات ہیں،

سوالات کے جواب کی دو راہیں

ان سوالات کے جواب کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ان کا جواب ہم اپنے ذاتی علم و فہم اور غور و فکر کی بناء پر خود دیں، لیکن اس طریقہ سے ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں وہ یہ ہوگا کہ اس عالم کا کوئی ضرور بنانے والا ہے، لیکن اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کا جواب ہم اپنے ذاتی تفکر کی بناء پر نہیں دے سکتے ہمارا دماغ اپنی انتہائی بلند پروازیوں میں بھی قیاس کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن اس معاملہ میں قیاس کی گنجایش نہیں، کہ خالق و مخلوق کے درمیان کوئی مشابہت نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا مشکل سوال اس کا تعین ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، کیا اس کو پسند ہے اور کیا ناپسند ہم دیکھتے ہیں کہ دوستوں اور عزیزوں اور خاص رفیقوں کی خوشی، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بارہ میں ہمیشہ قیاس مشکل ہے اور اس میں بعض مرتبہ بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں، پھر ایک نادیدہ ذات اور وراء الوراء ہستی کی مرضیات و نامرضیات کی یقینی تعیین محض قیاس سے کس طرح ممکن ہے،

پھر اس علم و فہم اور غور و فکر کا نتیجہ ایک نہیں ہے نتیجہ میں سخت اختلاف و تعارض ہے،

کسی نے اپنے غور و فکر کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ یہ کارخانہ بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا اور بغیر کسی چلانے والے کے چل رہا ہے، اور خود ہی ختم ہو جائے گا،

کسی کے نزدیک اس کا اگر کوئی صانع ہے تو اس کا اب اپنی مصنوعات سے کوئی تعلق نہیں رہا، کسی کے نزدیک اس کا صانع ہی اس کا حقیقی مالک ہے، مگر اب وہ دوسروں کے حق میں اپنے مالکانہ حقوق سے دستبردار ہو گیا ہے، اور اسکی مملکت میں وہ بادشاہی کر رہے ہیں،

کسی نے اس دنیا کی ہر چیز کو جس نے اس کو بظاہر نفع و ضرر پہونچایا ہے یا پہونچ سکتا ہے اپنا اللہ معبود اور ہر صاحب طاقت کو اپنا حاکم بنا لیا، اور اس کے ظاہری حواس، روزمرہ کے تجربات اور عقل و فہم نے اس کو اسی نتیجہ پر پہونچایا۔

کسی کے نزدیک انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جو کچھ ضرورتیں رکھتا ہے اور کچھ خواہشیں وہ آزاد

وہ خود مختار ہے اور قطعًا غیر مسئول ہے، اسکی طاقت غیر مقید اور اس کا اختیار غیر محدود ہے، اس کے قانون کا کوئی الٰہی ماخذ ہے نہ اس کے علم کا کوئی غیبی سرچشمہ، دنیا ایک ہنگامہ کارزار ہے جس میں اصل قانون طاقت ہے، اخلاق خیر و شر حسن و قبح۔ یہ سب بے معنی الفاظ ہیں[1]

خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے صفات کے بارہ میں حکماء اور فلاسفہ نے جو جو قیاس آرائیاں اور موشگافیاں کی ہیں اور جس طرح انھوں نے اسکی طرف ان نقائص کی نسبت کی ہے جنکی نسبت وہ خود اپنی طرف پسند نہیں کرتے، وہ انسانی عقل کے عجائبات میں سے ہے[2]

جواب کی دوسری راہ یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں کسی دوسری جماعت پر اعتماد کریں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت کونسی ہو؟ اگر وہ حکما کی جماعت ہو تو پوچھا جا سکتا ہو کہ ان مسائل میں انکو ہمارے مقابلہ میں کونسا یقین حاصل ہو اور ان مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کے ان کے پاس کون سے علمی ذرائع ہیں؟ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسائل میں نہ حواس کام کرتے ہیں نہ عقل کا کچھ دخل ہے، انکو اس علم کے مبادی بھی حاصل نہیں پھر اُن کو اس بارہ میں ہماری رہنمائی کا کیا حق ہو، اور ہم ان پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں[3] ان سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے

هَاأَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (آل عمران)

تم نے ان مسائل میں بحث کی جن کا تم کو تھوڑا بہت علم تھا اب ایسے مسائل میں کیوں بحث کرتے ہو جن کا تم کو کچھ بھی علم نہیں، اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اب صرف یہی ایک صورت باقی رہجاتی ہو کہ ان مسائل میں ہم کچھ ایسے انسانوں پر اعتماد کریں جن کا علم

---

[1] یہ سب اقوال و عقائد جاہلیت اولیٰ جاہلیت وسطیٰ اور جاہلیت جدیدہ کے عقلا اور فلاسفہ کے ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں، کتب فلسفہ و مابعد الطبیعیات

[2] ملاحظہ ہوں اقوال حکماء یونان، و ابن سینا و ابن رشد،

[3] ملاحظہ ہو بحث "غیب" مضمون "قرآن سے استفادہ کے شرائط اور اس کے موانع"

اس بارہ میں قیاسی نہو بلکہ یقینی اور قطعی ہو، جنھوں نے ان علوم و حقائق کو اپنے مشاہدہ سے اسطرح حاصل کیا ہو جس طرح ہم کو اس عالم کے مسموعات و مبصرات کا علم ہوتا ہے، ان کے لئے یہ چیزیں ایسی ہی بدیہی ہوں، جس طرح ہمارے لئے دنیا کی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، جن کو مشترک انسانی حواس کے علاوہ ایک حاسۂ زایدہ طاہر ہوا جس کو ہم حاسۂ غیبی کہہ سکتے ہیں، جو خدا سے براہ راست اسکی مرضیات اور احکام معلوم کرسکیں، اور دوسرے انسانوں تک پہونچا سکیں، صرف پیغمبروں کی جماعت ہے۔

سابق الذکر جماعتیں (حکما و فلاسفہ) اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا دعویٰ نہیں کرتیں نہ ان کو اس بارہ میں کسی مشاہدہ کا دعویٰ ہے، ان کے اقوال و دعاوی کا ماحصل یہ ہے کہ ایسا ہوگا یا ایسا ہونا چاہیئے، (ہمارے قائم کئے ہوئے مقدمات (جو بدیہی اور قطعی الثبوت نہیں ہیں) ہم کو اس نتیجہ پر پہونچاتے ہیں، اور وہ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہیں؟

لیکن پیغمبروں کو اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا دعویٰ ہے، وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ خدا ہے یا اس کے یہ صفات ہیں، بلکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اسکی باتیں سنتے ہیں، ہم اس سے ہم کلام ہوتے ہیں ہمارے پاس اس کے پیغام پہونچتے ہیں، ہمارے پاس اس کے فرشتے آتے ہیں، ان کے لئے کوئی چیز اتنی یقینی اور بدیہی نہیں جتنی خدا کی صفات، اس کے احکام پیغام اور اپنی نبوت و رسالت اس لئے ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی ان حقائق میں کوئی شک و تذبذب نہیں ہو سکتا اور کسی کے کہنے سننے سے اپر کوئی اثر نہیں ہوتا،

ایک پیغمبر[1] سے جب اسکی قوم نے خدا اور اسکی صفات کے بارہ میں حجت کی تو اس نے نہایت سادگی سے اپنا اور بے دلیل بحث کرنے والوں کا فرق بیان کیا،

وحاجہ قومہ قال اتحاجونی فی اللہ وقد ھدٰین (انعام ع ۹)	اور اس سے اسکی قوم نے حجت کی، اسنے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے میری رہنمائی کی ہو۔

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام

ایک دوسرے پیغمبر[1] نے بھی فرق اس طرح بیان کیا

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰىنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (ہود ع ۳)

انھوں نے کہا کہ اے قوم دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے صاف دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی پھر وہ تمھاری نظر سے مخفی رہی کیا ہم تم کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں اس حالت میں کہ تم اسکو پسند نہیں کرتے

ایک تیسرے پیغمبر[2] کے متعلق یوں کہا گیا،

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ع ۱)

وہ اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا، وہ محض وحی ہے جو وحی کیجا رہی ہے۔

اسی کے مشاہدہ کے متعلق کہا گیا

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم ع ۱)

نہ انکی نگاہ بہکی، نہ حد سے بڑھی، بیشک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ (النجم ع ۱)

رسول کے دل نے جھوٹ نہیں کہا جو کچھ دیکھا، کیا تم اس سے جو کچھ اس نے دیکھا اسپر جھگڑتے ہو،

اس یقینی مشاہدہ کے مقابلہ میں جو کچھ ہے اسکی حقیقت بھی سن لیجئے۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (النجم ع ۱)

وہ محض اٹکل اور دل کی خواہشوں پر چلتے ہیں حالانکہ انکے پاس انکے رب کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝ (النجم ع ۲)

ان کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں، وہ محض اٹکل پر چلتے ہیں اور قیاس حقیقت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

---

[1] حضرت ہود علیہ السلام [2] حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

زندگی کی مکمل توجیہ وحی اور پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں

ان مابعد الطبعیاتی سوالات کے علاوہ جن کا جواب دئے بغیر ہماری زندگی حیوانی زندگی سے ممتاز نہیں ہوسکتی ہم یوں بھی وحی کی روشنی اور پیغمبرونکے نور بصیرت کے بغیر اپنی زندگی کی مکمل توجیہ نہیں کرسکتے اور نظام کائنات کا حقیقی مرکز اور اس ہمگیر اور حکیمانہ قانون کو دریافت نہیں کرسکتے، جو اس عالم میں کارفرما ہے، اپنی ذاتی بصارت سے ہم کو یہ زندگی ایک وحدت کے طور پر نظر نہیں آئیگی بلکہ ایک نسخۂ شیرازہ ملے گا جس کے اوراق بکھرے ہوے ہیں اسکی کچھ سطریں اور اس کے بعض عنوانات ہم غور کرکے پڑھ سکتے ہیں، مگر اس صحیفۂ کائنات کا موضوع اس کتاب کا خلاصہ اور اس کے مصنف کی معرفت ہم کو پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی!

حکما اور ماہرین طبعیات نے کائنات سے متعلق جو تحقیقات کی ہیں، زندگی سے متعلق جن حقائق کا انکشاف کیا ہے، طبعی قوتوں کا پتہ علم و تجربہ سے انسان کیلئے جسطرح مسخر کیا ہے، اور جسطرح کائنات کے ایک ایک شعبہ اور زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لئے مستقل علوم مرتب کئے اور کتب خانے فراہم کردئے وہ انسانی علم کا ایک کارنامہ ہے۔

لیکن یہ جو کچھ بھی ہے یہ زندگی اور کائنات کے اصل مجموعہ کے کسورد اجزا ہیں جنمیں باہم کوئی ربط نہیں ہے نہ انکا کوئی مرکز معلوم ہے، یہ سب کس نظام کے ماتحت ہیں، کس مقصد کے تابع ہیں، اور کس اہم غرض کے خادم ہیں، ہمارے لئے عملی طور پر یہ سوالات زیادہ اہم ہیں، اخلاق، طریق کار اور زندگی کے اصل نقطۂ نظر پر جو تمدن کا اصل محرک اور روح ہے یہ مباحث زیادہ اثر انداز ہیں لیکن یہ تمام سوالات ان حکما اور ماہرین کے موضوع بحث سے خارج ہیں، انھوں نے اپنے علم و تحقیق کا سفر اصل نقطۂ آغاز (خالق کی معرفت) سے شروع نہیں کیا اس لئے وہ ہمیشہ آفاق میں گم رہیں گے اور زندگی کے معمہ کو کبھی حل نہ کرسکیں گے۔

لیکن اس کے بالکل برخلاف جب ہم وحی کی روشنی اور پیغمبر کی بصیرت سے اس عالم پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو وہ ایک "وحدت" نظر آتا ہے، اور ایک اعلیٰ وحدانی نظام معلوم ہوتا ہے جس کے اجزا میں باہم پورا

تعاون ہو یہ سب ایک مرکز کے تابع ہیں۔ انکی ہر حرکت و عمل ایک مقصد کے ماتحت ہو، انمیں وہ باہمی تصادم ہے، وحدت مرکزیت، دنیا ایک مرتب و متوازن مشین ہو، جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کارآمد ہے اور دوسرے پرزہ کی امداد کر رہا ہو یا ایک بڑا کارخانہ ہو جسمیں صدہا مشینیں چل رہی ہیں۔ ہر مشین کو دوسری مشین سے پورا تعلق ہے اور یہ پوری مشین یا پورا کارخانہ ایک صاحب علم و صاحب اختیار طاقت کے ہاتھ میں ہو جو اس کو ایک قانون و نظام کے ماتحت جو اسی کا وضع کیا ہوا ہے چلا رہا ہے۔

انبیاء اور محققین کے طریق نظر اور طریق کار کا اختلاف

انبیاء اور حکماء و محققین کے طریق نظر اور طریق کار کا اس کائنات کے بارہ میں جو اختلاف ہو اسکی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں،

کسی شہر میں علماء و محققین کی ایک جماعت داخل ہوتی ہو انمیں سے ایک گروہ یہ تحقیق کرتا ہے کہ اس شہر کا محل وقوع کیا ہو، اس کے حدود اربعہ کیا ہیں، اس کے پاس کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں، وہ دریا کہاں سے آتے اور وہ پہاڑ کہاں تک جاتے ہیں، شہر کا رقبہ کیا ہو وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں یہ جغرافیہ دانوں کا گروہ ہے۔

دوسرا گروہ یہ دریافت کرتا ہو کہ یہ شہر کب سے آباد ہو، شہر میں کون کون سے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں انکی تاریخ کیا ہے، یہ مورخین اور علماء آثار کی جماعت ہو!

کچھ لوگ اسکی زمین کی حیثیت معلوم کرنا چاہتے ہیں، وہ کھدائیاں کرتے ہیں۔ اور اسکی معدنیات دریافت کرتے ہیں، یہ ماہرین طبقات الارض کا گروہ ہو!

کچھ لوگ وہاں ایک رصدگاہ قائم کرتے ہیں جہاں سے سیاروں اور ثوابت کا مطالعہ کرتے ہیں، انکے زمین سے فاصلے دریافت کرتے ہیں، زلزلوں اور بارشی ہواؤں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں، یہ علماء طبیعیات و ہیئت کی جماعت ہو!

کچھ لوگ وہاں کیمیائی معمل قائم کرتے ہیں، جہاں اور یہ کے خواص کا تجربہ کرتے ہیں، مفردات و مرکبات

کی تحلیل و تجزیہ کرکے نئی نئی تحقیقات کرتے ہیں، یہ علم الکیمیا اور نباتات کے ماہر ہیں؛

کچھ لوگ شہر کی زبان سے تعلق تحقیق کرتے ہیں، اس کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اسکے لغت کی تدوین اور اس کے قواعد وضع کرتے ہیں، یہ ادبا اور علما السنہ کی جماعت ہے!

کچھ صاحب ذوق ان خشک مباحث سے ہٹکر گلشن کی سیر کرتے ہیں، پھولوں پتیوں اور مناظر طبعی کا لطف اٹھاتے ہیں اور ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں، یہ شعرائی جماعت ہے!

کچھ لوگ یہاں کے عادات و رسوم اور اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں اور انکی تنقید کرتے ہیں وہ سراغ لگاتے ہیں کہ یہ عادات و رسوم ان میں کہاں سے داخل ہوئے کس طرح پیدا ہوئے، ان میں سے کون صحیح ہیں اور کون قابل اصلاح یہ علما اجتماع اور اخلاق ہیں!

کچھ لوگ شہر سے متعلق کچھ اصلاحات پیش کرتے ہیں، شہر کی تنظیم و ترقی اور اہل شہر کی راحت رسانی کیلئے ان کے پاس کچھ تجاویز ہوتی ہیں، یہ علما تمدن ہیں!

یہ سب جماعتیں اپنے اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہیں، اور دلچسپی اور انہماک کیساتھ اپنے اپنے شعبوں کی تحقیقات کرنے لگتی ہیں،

اب ایک شخص اس شہر میں داخل ہوتا ہے، وہ پورے شہر پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے، وہ دیکھتا اور سنتا سب کچھ ہے مگر مشغول کسی چیز میں نہیں ہوتا، اس کے نزدیک اہم سوالات یہ نہیں ہوتے کہ شہر کا رقبہ کیا ہے، اسکی تاریخ کیا ہے، اسکی زمین کی تہ میں کونسی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ اور وہ دوسرے سوالات جو سابق الذکر جماعتوں کے نزدیک اہم تھے، اس کے سامنے اولین اور اہم ترین سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ شہر اس حسن و صنعت کیساتھ کس نے تعمیر اور آباد کیا، یہاں کسکی حکومت ہے، شہر کے باشندے کسکی رعیت ہیں، اس کا نظام حکومت کیا ہے، شہر کی آبادی، اور عام زندگی سے اس کو کسطرح کا اور کس درجہ کا تعلق ہے، وہ اس اعلیٰ تنظیمی طاقت سے براہ راست واقفیت پیدا کرتا ہے، اس کے اصول و مقاصد معلوم کرتا ہے پھر تمام شعبہائے زندگی پر ایک تنقیدی

نظر ڈالتا ہے، ان سب کو مرکز کے تابع اور مقصد کے ماتحت کرتا ہے اور انکی اصلاح اور باہمی تعاون سے ایک نظم اور اعلیٰ زندگی پیدا کرتا ہے، وہ حکومت اور رعیت کے درمیان واسطہ بنتا ہے، حکومت کا ترجمان اور اسکے احکام کا شارح ہوتا ہے، پس وہ تمام علمی اور تحقیقی جماعتیں ملکر بھی اس ایک شخص کی قائم مقام نہیں ہوسکتیں اسکے بغیر یہ پورا شہر صرف ایک عجائب خانہ اور سیرگاہ بنکر رہجاتا ہے،

اس عالم میں جو اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہے اور جس میں رہنے والے اسکی پیدائشی رعیت ہیں، انبیاء کا طرقِ نظر حکما اور محققین سے اسیطرح جدا ہوتا ہے، انکا کام موجودات کے اسرار و حقائق کے انکشاف و اظہار پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انکا اصل موضوع "موجد کی ذات اور صفات اور اس کے احکام" ہے، صحیفہ کائنات کے اوراق و صفحات انکے سامنے بھی اسیطرح کھلے اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، جسطرح دوسرے اہل نظر کے سامنے، مگر انکی نظر کہیں انکتی الجھتی نہیں، وہ اس صحیفہ کے مصنف سے براہِ راست تعلق پیدا کرتے نہیں، وہ "آفاق" و "انفس" میں اسکی کھلی نشانیاں دیکھتے ہیں، اور اسکی سلطنت کا ایسا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس زمین و آسمان میں انکو صرف اسی کا حکم چلتا نظر آتا ہے، اور صرف اسی کی بادشاہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اس کا قانون انکو کسی گوشہ میں بھی ٹوٹتا نظر نہیں آتا، اور اس کا حکم کہیں بھی انکو ٹلتا دکھائی نہیں دیتا، تمام بلندیاں اس کے سامنے سرافگندہ دکھائی دیتی ہیں اور تمام طاقتیں اس کے سامنے سپر افگندہ نظر آتی ہیں، ہر عالم میں اسی کا غیبی ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے، زمین و آسمان اسی کے سہارے تھمے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور اس کا "قیوم السمٰوات والارض" ہونا انکے لئے عین الیقین بنجاتا ہے۔

یہی خدا کی وہ بادشاہی ہے جو انکو بے نقاب دکھائی دیتی ہے اور جس کا علم سب سے بڑا علم اور حقیقۃ الحقائق ہے جس سے حکما و محققین کے علوم کو ذرہ کی بھی نسبت نہیں، اور جس کے مقابلہ میں انکی حقیقت طفلانہ معلومات سے زیادہ نہیں۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ه (انعام ع ۹)	اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں اور تاکہ اس کو یقین آجائے۔

پیغمبروں کی تعلیم زندگی کی صحیح اساس ہے،

پیغمبروں کو خدا کی طرف سے جو ابدی علوم و حقائق اور اخلاق اور تمدن کے جو قطعی اصول و قواعد حاصل ہوتے ہیں، انکے بغیر نہ کسی صحیح زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے نہ کسی صحیح تمدن کی تاسیس، نہ اخلاق کی تہذیب، نہ نفس کا تزکیہ، نہ زندگی کی تاریکیوں میں انھیں کی تعلیم ہی تنہا ایک روشنی ہے، جہاں یہ روشنی نہ پہونچے، یا پہونچکر کسی سبب سے گل ہو جائے، وہاں کی تاریکی کو کسی مصنوعی روشنی سے روشن نہیں کیا جا سکتا، اسی کا نام جاہلیت ہے خواہ وہ کسی عہد میں پائی جائے اور وہ کیسے ہی انسانی علوم و فنون کے ترقی کا عہد ہو۔

دنیا کا سب سے بڑا علم جس سے علم کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں خدا کی معرفت ہے، جس کے بغیر نہ اس دنیا کا معمہ حل ہوتا ہے نہ انسان کو اپنی معرفت حاصل ہوتی ہے، خدا کی معرفت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے لیکن اس خوابیدہ قوت کو بیدار کرنے کیلئے اکثر اوقات انبیاء کی تحریک ضروری ہوتی ہے اور اسکی وضاحت و تصحیح کے لئے انکی رہنمائی ہمیشہ ضروری ہوتی ہے اسکے لئے، نہ سلامت فہم کافی ہے، نہ سلامت فطرت، نہ ذکاوت اور سرعت ادراک نہ بڑے سے بڑا غور و مطالعہ، ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروروں سلیم الفہم اور سلیم الفطرت اور ذکی انسان پیغمبروں کی تحریک کے بغیر اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے، یا اس کا کچھ ادراک کرنے کے بعد وہ بعض ایسی شدید غلط فہمیوں اور نادانیوں میں مبتلا ہو گئے جنھوں نے انکو اس علم سے مستفید ہونے سے باز رکھا۔

تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس بھی پیغمبروں کی رہنمائی اور تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان کی فطرت سلیم کے ظہور کے لئے دنیا میں کثرت سے موانع اور حجابات ہیں، طبیعت تربیت، ماحول اور غلط علم کے ایسے موٹے موٹے پردے پڑجاتے ہیں، جو انبیاء کی طاقتور روشنی کے بغیر چاک نہیں ہو سکتے، انسان کے دل و دماغ کے قفلوں کو صرف انھیں کی کلید ہدایت کھول سکتی ہے اور انھیں کا صیقل اسکے آئینہ کا زنگ دور کر سکتا ہے۔

اخلاقیات میں حدود کی صحیح تعیین کا اعتدال، جامعیت اور صحیح توازن کیلئے، جس اعتدال مزاج جس، اعلیٰ سلامت روی، اور جس وقت نظر کی ضرورت ہے وہ صرف انبیاء میں پائی جاتی ہے، وہ مزاجی طبعی اور

اخلاقی حیثیت سے خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، صرف انھیں کے اعمال اور تعلیمات، غلو افراط و تفریط تنگ ظرفی اور تنگ نظری سے پاک ہوتی ہیں، پھر ان سے جو لوگ جتنے زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ بھی جامعیت و توسط کا نمونہ ہوتے ہیں، انبیاء کرام اور انکے اصحاب کی سیرتیں اسکی شاہد ہیں،

انبیاء کی دعوت انبیاء کرام کو جب اس حقیقت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ یہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اسکی ملکیت ہے، اور اسیکے حکم سے یہ پورا نظام چل رہا ہے تو پھر وہ انسانوں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور تعجب سے دیکھتے ہیں کہ کائنات اور اسکے تمام اجزانے چار و ناچار جس بڑی طاقت کے سامنے سر جھکا دیا ہے، اور اپنے کو اس کے تابع فرمان بنا دیا ہے انسان جو اس کائنات کے مجموعہ کا سب سے اہم جز ہے اس کے سامنے اپنے ارادہ اور خواہش سے جھکنے میں تامل کر رہا ہے اگرچہ وہ بلا ارادہ اسکے سامنے جھکا ہوا ہے اور اس کے تکوینی احکام و قوانین کے زیر فرمان ہے وہ اسی کے حکم سے پیدا ہوتا ہے، اسی کے حکم سے نشاو نما پاتا ہے بچے سے جوان ہوتا ہے اور جوان سے بڑھا، اسیکی پیدا کی ہوئی چیزیں کھاتا ہے، اسیکے حکم سے بیمار ہوتا ہے اور اسی کے حکم سے صحت پاتا ہے، وہ زندگی کی تمام ضروریات میں اور اپنے تمام جسمانی احکام فطرت میں خدا کے بنائے ہوئے نظام و قوانین کے اسیطرح تابع ہے جسطرح جمادات و نباتات و حیوانات لیکن جب اس سے کہا جاتا ہے کہ جس طاقت کے سامنے تم بلا ارادہ جھکے ہوئے ہو، اسیکے سامنے تم بالارادہ بھی جھک جاؤ کہ تمھارے شرف و فضیلت اور علم و حکمت کے یہی شایان شان ہے تو اس کو اس میں عذر ہوتا ہے۔ انبیاء کرام نے جب پہلی حقیقت کے بالکل برخلاف یہ واقعہ دیکھا اور انھوں نے دیکھا کہ انکی انسانی برادری کے بہت سے افراد نے خالق کے بجائے، اسکی بعض مخلوقات کے سامنے سر جھکا یا ہے اور انکی عبادت و اطاعت اختیار کر لی ہے تو انکی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ	کیا اللہ کی فرمانبرداری کے سوا کسی اور کی فرمانبرداری کے
مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا	طالب ہیں حالانکہ اللہ کے سامنے زمین آسمان کی سب چیزیں اپنی
وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (آل عمران ع ۹)	خوشی یا زور سے جھکی ہوئی ہیں اور اللہ ہی کی طرف ان سب کو لوٹ کر آنا ہے

عالم کی بھی فتادگی اور کائنات کا یہی سجود ہے جو قرآن کی آیات سجدہ میں کثرت سے بیان کیا گیا ہے،

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (نحل ع)

اور اللہ ہی کے سامنے زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اور فرشتے سربسجود ہیں اور نہیں خدا کے سامنے تکبر کا کوئی جذبہ نہیں وہ اپنے رب سے جو انکے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور اسکے احکام کی اطاعت کرتے ہیں،

بس انبیاء کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کردے جس کے سامنے ساری کائنات سرافگندہ ہے، اور کائنات کا ایسا جزو ہو کر زندگی گذارے جو اپنی حرکت و عمل میں اسکی مجموعی حرکت و رفتار سے ہم آہنگ اور خالق کائنات اور مدبر ارض و سموات کے احکام و قوانین کے تابع ہو، وہ اپنی تمام غلط خواہشات اختیار و مطلق العنانی اور آزادی و خود مختاری کے دعووں اور اپنے "حقوق مالکانہ" سے دستبردار ہو کر اپنے کو اسکے حوالے کردے اسی کا نام "اسلام" ہے جسکی دعوت لیکر تمام انبیاء آئے۔

ظاہر ہے کہ اس "دین" اور "اسلام" (اطاعت مطلق اور تسلیم کامل) کے بعد اور اس تصور کے ساتھ کہ بالآخر پھر واسطہ اسی سے پڑنے والا ہے (والیہ یرجعون) اور اس کے سامنے اس زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے، انسان میں مطلق العنانی اور خود مختاری کا جذبہ کسی طرح نہیں پیدا ہوسکتا، اسکی زندگی کا نقشہ اس کے دماغ کے سانچے سے ڈھلکر نہیں نکلیگا۔ بلکہ اسی کا تجویز کیا ہوگا جس نے کائنات کا پورا نقشہ بنایا ہے اور خود اسکا بھی خالق ہے، اس کے اخلاق و عادات، سیاست و اجتماع اور احکام و قوانین اس کے اپنے تصنیف نہوں گے، بلکہ اس کو سب خدا کی طرف سے ملیں گے،

جاہلیت وحی و رسالت کے اس راستہ کے مقابل دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو اس عالم میں ایک وجود مستقل فرض کرے جسکی زندگی کا رخ کائنات کی دوسری چیزوں سے بالکل جدا ہے اور اس میں وہ کسی بالائی طاقت کے زیر فرمان کسی آسمانی نظام کا تابع، اور کسی غیر انسانی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے یہ جاہلیت کا راستہ ہے، یہ درحقیقت خدا کی اس سلطنت میں چھوٹی چھوٹی متعدد آزاد اور خود مختار سلطنتیں قائم کرنیکی باغیانہ کوشش ہے،

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور متعلقات زندگی پر ان دو مقابل نظریوں اور تصورات کا جو اثر پڑتا ہے واضح کر دیا جائے۔

پیغمبرانہ نظام زندگی اور جاہلیت اخلاق، تمدن، اور سیاست الگ الگ نظام نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی نظام کے اجزاء ہیں اس نظام کی بنیاد ایک مابعد الطبیعیاتی نظریہ یا تعلیم پر ہے، دنیا میں متعدد مابعد الطبیعیاتی نظریے ہو سکتے ہیں اور ہو چکے ہیں، ان میں ہر ایک کی بنیاد پر زندگی کا ایک پورا نظام مرتب کیا جا سکتا ہے اس نظام میں عبادت بھی ہوگی، اخلاق بھی ہونگے، تمدن بھی ہوگا اور سیاست بھی ہوگی، انہیں سے ہر ایک نظام دوسرے نظام سے اپنی روح اپنے اشکال میں اسی قدر مختلف ہوگا جس قدر انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں اختلاف ہے، حیوانوں اور انسانوں میں بہت سی چیزیں عام اور مشترک ہیں، حیوان اور انسان یکساں جسم اور جسم نامی ہیں حیوانیت کی منطقی حقیقت میں بھی اشتراک ہے لیکن اسکے باوجود یہ دو نوعیں ہیں، اسی طرح دونوں نظاموں میں بعض جنسی اور نوعی اشتراکات کے باوجود بڑا "فصل" ہوگا، دونوں نظاموں کے ماننے والے بہت سے مظاہر زندگی میں شریک ہونگے، کھانے پینے اور پہننے اور بہت سی تمدنی ضرورتوں میں انمیں آپس میں اختلاف نہ ہوگا لیکن پھر بھی بڑا اختلاف ہوگا، ہو سکتا ہے کہ جتنا جانور اور انسان کی زندگی میں ہوتا ہے،

ان نظریات میں دو نظریے بہت قدیم اور کامیاب ہیں اور ہر انسانی دور میں، دنیا کی انسانی آبادی انمیں بٹی رہی، ان دونوں نظریوں میں ہمیشہ جنگ جاری رہی ہے، اور ایک کو دوسرے پر غلبہ ہوتا رہا ہے

ایک نظریہ یہ ہے کہ اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے وہی اس کا منتظم، مالک، اور حقیقی حاکم ہے، انسان اسکی مخلوق بندے، اور رعیت ہیں، اس زمین پر وہ اسکی حکومت کے نائب اور اس کے خزانوں کے امین ہیں، زندگی امتحان کیلئے ہے، اس کے بعد ایک دوسری زندگی آئیگی جسمیں پہلی زندگی کا محاسبہ ہوگا، اور وہاں صرف وہ لوگ کامیاب ہونگے جنھوں نے یہاں، خدا کے احکام و قوانین کے مطابق زندگی بسر کی ہے،

اس عقیدہ کی تہ سے جو اخلاق ابھرینگے اور اس نظریہ کے تخم سے جو تمدن اگیگا اور اس تصور کی بنیاد پر

جو حکومت قائم ہوگی، اس کے پورے جسم میں خدا پرستی اور خدا ترسی کی روح ہوگی، تقویٰ اور احتیاط اسکی رگ رگ ریشہ میں سرایت کر چکا ہوگا، جس میں بادشاہی کی شان نہ ہوگی بلکہ بندگی کی شان ہوگی، وہ اپنے کو زمین میں امن کا پاسبان حق کا وکیل، صداقت کا علمبردار، مظلوموں کا حامی، سمجھینگے، اور قوامین بالقسط شہداء للہ (عدل وانصاف کے ذمہ دار اور منتظم اور اللہ کے گواہ) کے لقب کے مصداق ہوں گے۔

انہیں ذاتی سربلندی اور شخصی اقتدار کا جذبہ کبھی پیدا ہوگا۔ طاقت اور حکومت کا نشہ ان پر کبھی سوار ہوگا، وہ کبھی اپنے ذاتی فوائد کے لئے دوسروں کے فوائد کی قربانی پسند نہ کریں گے اور انکی ذات سے کبھی زمین پر فساد برپا نہ ہوگا اس لئے کہ انھوں نے سنا ہوگا کہ

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (قصص ع ۹)

وہ آخرت کا گھر ہم لوگوں کو دینگے جو زمین میں اپنا تفوق نہیں چاہتے اور نہ فساد اور انجام خدا ترس لوگوں کے لئے ہے۔

انکے یہاں شخصی اور اجتماعی اخلاق کی کوئی تقسیم نہ ہوگی وہ دونوں قسم کے اخلاق میں خدا ترس اور محتاط ہوں گے، وہ خدا کے خوف سے (نہ کہ قانون اور پولیس کے خوف سے) جرائم سے مجتنب اور قانون کے پابند ہوں گے، اسلئے وہ گھر کے اندر بھی وہی ہوں گے جو گھر کے باہر تخت سلطنت پر بھی وہی ہوں گے جو گھر کے پردہ پر، وہ جلوت وخلوت دونوں میں یکساں ہوں گے اس لئے کہ خدا دونوں جگہ موجود ہے، اور انکا اعتقاد ہوگا

مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (مجادلہ ع ۲)

تین آدمیوں کا مشورہ بھی ہوگا تو انکا چوتھا خدا ہوگا یا پانچ آدمیوں کا ہوگا تو چھٹا وہ ہوگا اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زائد مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوگا پھر قیامت میں انکو انکے اعمال کی خبر دیگا، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

انکی حکومت چند اشخاص یا کسی خاندان کے عیش وکامرانی یا کسی قوم اور ملک کے تفوق اور برتری کا ذریعہ نہ ہوگی، بلکہ اخلاق حسنہ کی عام اشاعت نیکی اور خدا ترسی کے رواج، حق وصداقت کے غلبہ، اور بداخلاقی اور فساد کے زوال کا سبب ہوگی،

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (الحج ع ۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انکو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے برائی سے روکینگے اور انجام اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

ان کا تمدن عیش وعشرت، شان وشوکت، لہو ولعب اور زینت وتفاخر اور مال ودولت کے مقابلہ کا مظاہرہ نہ ہوگا بلکہ ایک پاکباز اور محتاط تمدن ہوگا جس میں عمل اور دینداری کی سابقت ہوگی، تقویٰ معیار فضیلت ہوگا، شراب اس میں حرام ہوگی، سود لینا ناجائز ہوگا، سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع ہوگا۔ تصاویر اور پتھر کے بت اور انسانی مورتیں دیکھنے میں نہ آئینگی، قمار خانے ناپید ہونگے، فسق وفجور پر سخت بندشیں اور سزائیں ہونگی، موسیقی اور غفلت تعیش کے اسباب پر قیود ہوں گے،

اس تمدن کی روح یہ نہ ہوگی کہ "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" بلکہ دنیا کی زندگی کے بارہ میں انکا نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (حدید ع ۲)

دنیا کی زندگانی محض کھیل تماشا آرایش ایک دوسرے پر فخر مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش ہے جیسے ایک بارش جسکا سبزہ کھیتی کرنے والوں کو اچھا معلوم ہوا پھر وہ کھیتی لہلہاتی ہے پھر تم اس کو زرد دیکھتے ہو پھر وہ بھوسہ بنجاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ کی طرف سے اور رضامندی اور دنیا کی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے،

یہ ایک علیحدہ اور مستقل نظام زندگی ہی جو اپنی بنیاد سے لیکر آخری بلندی تک دوسرے نظاموں سے اپنی ایک ایک اینٹ میں ممتاز ہی، اس کا سنگ بنیاد وہی مابعد الطبیعاتی نظریہ ہی جو اوپر گذرا

اس نظریہ کے داعی اور اس نظام زندگی کے بانی پیغمبر ہیں جن کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہی، آپنے اس نظام زندگی کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا، اور آپنے اور آپکے سچے جانشینوں نے منظم و مرتب طریقہ پر اس کو خارج میں قائم کرکے دکھا دیا، جاہلی نظام کے مقابلہ میں یہی سب سے بڑی طاقت ہی، جو ہمیشہ زندہ رہیگی،

دوسرا نظریہ یہ ہی، کہ ممکن ہے اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہو لیکن اس کا اب اس کائنات سے کوئی عملی اور انسان کی زندگی سے کوئی داخلی تعلق نہیں ہی، انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہی، وہ زمین اور قدرت کے خزانوں کا حقیقی مالک ہی، یہی زندگی اصل زندگی ہی، اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہی، اس لئے جس قدر اس زندگی میں عیش کیا جا سکے کر لیا جائے، انسان اپنی طاقتوں کے استعمال میں بالکل آزاد ہے، طاقت اصل قانون اور اغراض و مصالح عمل کے اصل محرک ہیں، یہ جاہلیت کا نظریہ ہی،

اس نظریہ سے ایک ناخدا شناس تمدن اسطرح پھوٹتا ہی جسطرح بیج سے درخت نکلتا ہی جو اپنی تمام پتیوں اور شاخوں میں اس بیج کے خواص اور اثرات رکھتا ہی، ساری زندگی میں بے قیدی اور آزادی سرایت کر جاتی ہے، نفع اندوز ذہنیت، اور خود غرضانہ نقطۂ نظر زندگی پر چھا جاتا ہی، گناہ و ثواب کا تصور جاتا رہتا ہی بلکہ یہ اصطلاحیں قابل مضحکہ بنجاتی ہیں اخلاق کی دو قسمیں ہوجاتی ہیں، پرائیویٹ اور پبلک پرائیوٹ اخلاق قابل اعتراض نہیں رہتے، اس لئے ایک ہی شخص کی دو حیثیتیں ہوجاتی ہیں، خانگی اور خارجی شخصی اور خانگی طور پر اسکو آزادی دیدی جاتی ہی اور اجتماعی طور پر اس کو کچھ مصالح کا پابند کردیا جاتا ہی، جرائم سے مانع صرف قانون کی لفظی پابندی، اور سزا یا پولیس کا خوف ہوتا ہے، اس لئے جہاں یہ موانع دور ہوتے ہیں جرائم کے ارتکاب میں کوئی چیز مانع نہیں رہتی، قانون کی عظمت دل سے جاتی رہتی ہی، اس لئے کہ وہ اپنے

جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جن کا ذہن میں کوئی تقدس نہیں ہوتا، اور جو اقتدار اور قانون سازی کے منصب پر اپنی ذکاوت یا دولت یا طاقت کی وجہ سے زبردستی قابض ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو عاجز و مغلوب کرنے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنیکی کوشش کیجاتی ہے زندگی کا مقصد صرف عیش ولذت قرار پاتا ہے، اسلئے زیادہ سے زیادہ عیش کا سامان پیدا کیا جاتا ہے، اس کیلئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے سو اسکے پیدا کرنے میں سخت مقابلہ ہوتا ہے، اس سے قلبی قساوت، بہیمیت، تنافس اور طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے اسکے حاصل کرنیکے بعد اسکو اپنے نفس کی خواہشات میں آنکھ بند کرکے صرف کیا جاتا ہے، جس سے فسق و فجور اور جرائم پیدا ہوتے ہیں اور شہری زندگی میں سخت ابتری پیدا ہوتی ہے،

خداشناسی کی جگہ پہلے خود شناسی لیتی ہے، لیکن وہ جلد خود فراموشی میں تبدیل ہوجاتی ہے کہ خدا فراموشی کا نتیجہ ہمیشہ خود فراموشی ہوتا ہے پھر خود فراموشی رفتہ رفتہ نوعی خودکشی کی شکل اختیار کرلیتی ہے حیوانی یا انسانی نقطۂ نظر کے بجائے میکانکی نقطۂ نظر قائم ہوجاتا ہے، اور زندگی بالکل غیر انسانی بنکر رہجاتی ہے حکومت کا مقصد ایک شخص یا ایک خاندان کا اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے، اسکی خاطر خونریز جنگیں ہوتی ہیں، بعد میں یہ نظریہ ترقی کرکے قومی اور وطنی اقتدار کی شکل اختیار کرلیتا ہے، پہلے اگر خاندان خاندانوں سے، لڑتے تھے تو اب قومیں قوموں سے اور ملک ملکوں سے برسرپیکار ہوتے ہیں، اور زیادہ انسانوں کا خون بہتا ہے اور دنیا انسانوں کیلئے جہنم بنکر رہجاتی ہے،

اس پورے نظام زندگی کی بنیاد ناخداشناس طریق نظر اور انسان کی آزادی کا غلط تصور ہے، یہ کج خشت اول زندگی کی پوری دیوار کو ثریا تک کج رکھتی ہے، اسکی کجی فلک پیمائیوں، اور سائنس کی بلند پروازیوں میں بھی نہیں جاتی،

اس نظریہ اور اس کے اثر سے خیالات، اخلاق و اعمال، تمدن و سیاست کا جو نظام مرتب ہوتا ہے اس کا نام پیغمبر کی اصطلاح میں "جاہلیت" ہے جو پیغمبروں کی دعوت سے پہلے دنیا میں قائم ہوتا ہے انکی دعوت و تحریک کے زمانہ میں دنیا کا نظام زندگی ہوتا ہے اسی سے انکو جہاد کرنا پڑتا ہے اور پھر جب انکے بعد انکی دعوت و تحریک کمزور پڑجاتی ہے تو یہ نظام جو فنا نہیں ہوا کرتا بلکہ دب جاتا ہے پھر ابھر آتا ہے۔ عہد قدیم میں اپنے اپنے زمانہ میں عاد و ثمود، فرعون، ہامان، و قارون، اہل بابل و نینویٰ مصر کے باشندے اور دوسری قومیں اور اشخاص دنیا میں اس نظام کے نمایندے تھے، اب عرصہ سے اسکی امامت یورپ کے ہاتھ میں ہے،

یادِ ایام

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم اے، انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد

حضرت الاستاد علامہ شبلی نعمانی

چراغاں بزم تھی ساری بڑی یہ روشنی کیسی
گئے شرما چراغ ایسے کہ گل بند ہو بند ہو گئے انیس

علی گڈھ میں تھا، بی، اے کا امتحان دیکھا تھا، کہ شب کو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی محفل میلاد منعقد ہو عیدگاہ میں، حضرت علامہؒ وہاں کھڑے بیان فرما رہے ہیں۔ دوسرے روز خبر وفات ملی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس خواب کی مناسبت سُنئے علی گڈھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہو کہ ندوہ میں اسٹرائک ہو چکی ہو، مولویوں نے قبضہ کر لیا ہو۔ علامہ کنارہ کش ایک حد تک ہو چکے ہیں، ایک آنکھ میں نزول شروع ہو گیا ہو۔ میں حاضر ہوتا ہوں، اسٹرائک کا قضیہ سنتا ہوں، قلق ہوتا ہو، انکی سندوری پیش نظر ہو جاتی ہو اب وقت اس قسم کے ہیجان برداشت کرنیکا نہیں ہو۔ عقیدتمند شاگرد مشورہ کیسوئی کا دیتا ہو اور یہ عرض کرتا ہو کہ اسوقت تک آپنے جو کچھ کیا اگرچہ وہ دینی خدمت ایک حد تک تھی مگر اب مخلصین لہ الدین کا وقت آ الامر باتجوا تیم استاذ علامہ بجبین ہو جاتے ہیں، استاد و شاگرد آبدیدہ ہوتے ہیں، استاد فرطِ محبت سے شاگرد کو لپٹا لیتا ہو، اور پھر دو باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ علوم القرآن اور سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم۔ شاگرد عرض کرتا ہو کہ پہلے میں اشکال زیادہ ہو، یہ کام ساری عمر کا ہونا چاہئیے تھا۔ پھر ہندوستان میں اسکا مخاطب کون، اردو میں اسکو دلچسپ بنانا ایک اور محنت چاہتا ہو جو آپکے سن و سال و قویٰ کے مناسب حال نہیں ہو آخر میں سیرۃ ہی پر رائے مختتم ہو جاتی ہو۔ دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو مسودہ اعلان اپیل

تیار تھا، مجھے دکھایا، پھر طباعت کو بھیجدیا، کچھ خدمت مواد کے متعلق سپرد ہو جاتی ہو جس کی تعمیل بمشورۂ ڈاکٹر ہورووٹیز کر کے بھیجدی گئی۔ مگر یہ عرض کیا کہ کتاب ہر قسم کے مباحثوں سے الگ محض صحیح واقعات اور عمدہ ترتیب پر مبنی ہونا چاہئے۔ مولوی کچھ سمجھیں الاعمال بالنیات، یہ میرا ایمان ہو کہ خلوص کی کوئی کمی نہ تھی علم و فہم میں کیا کسر تھی، قبولیت کیوں نہ حاصل ہوتی عشق رسولؐ سے ہر رگ بھڑکی ہوئی تھی۔ یہ خواب اسکی بشارت تھا۔ ہمارے دوست کی خدمت دنیا کو معلوم ہو اور وہ انکے الطاف و شفقتوں کے مستحق تھے اور ہیں مگر "الدال علی الخیر کفاعلہ" کے ثواب میں شریک مجھ ہیچ کارہ کو بھی سمجھیں۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سنا دوں۔ ایک دفعہ بعض علما میں اس سے پہلے بھی علامہ کے خلاف ہیجان پیدا ہوا اسکی تحقیق اور تفتیش کے لئے ایک جماعت اراکین ندوہ کی آگئی صبح کو حضرت الاستاذ کی قیام گاہ پر چند علما، بیٹھے ہیں الکلام شائع ہو چکی ہو، پہلے دن کی جلد تو نواب محسن الملک مرحوم آئے وہ زمانے کسی طرح اپنے ساتھ لیگئے، وہی جلد میں نے بھی پڑھی تھی، مگر اسکے بعد والی مجلد رکھی تھی، جناب مولانا سمیع الزماں خاں صاحب نے اسکو اٹھا لیا، اتفاق دیکھئے صفحہ وہ کھلتا ہو جہاں علامہ نے "ملاحدہ کے اعتراض نقل کئے ہیں" اسوقت علامہ نے بعجلت بیچین ہو کر فوراً ان سے کہا کہ حضرت یہ میں نے ملاحدہ کے اعتراض نقل کئے ہیں خوف ہوا کہ یہ عصبیت کی رو میں کہیں ان اقوال کو انھیں کے اقوال نہ سمجھ لیں تو سونے میں سہاگہ ہو، اگرچہ "نقل کفر کفر نباشد"۔

نہ جانے علامہ کب تشریف لائیں گے، حکم خداوندی تو خداوندی کارخانہ ہو، کب وقت پورا ہو، بیچین ہو کر خط لکھتا ہوں، جواب تسکین بخش ملتا ہو، آخر خدا خدا کر کے وہ وقت آگیا اور علامہ مع اپنے ساز سامان کے یعنی ایک عدد ٹرنک کپڑوں کا بستر، ایک ٹیفن بکس اور باقی کتابیں ہاں ایک کیش بکس جو اکثر کھلا ہوا چارپائی کے نیچے رکھا رہتا تھا، تشریف لے آئے سب سے اوپر کی منزل میں قیام ہمارا علی گڈھ سے حیدرآباد دیکھئے، علامہ شبلی ایک سادگی پسند مولوی تھے، استاد شاگرد میں علمیت حافظ کے علاوہ ایک اور

جیز قدر مشترک تھی یعنی سیمابی کیفیت اور شعریت، وہ ذکی الشعور تھے، اگر کوئی گاتا تو وہ بےچین ہو کر تھرکتے، جب شعر کہتے تو گا گا کر کہتے اور وہ بھی آفتاب نکلنے سے پہلے۔ ذہنی خصوصیات میں دو باتیں انکی تھیں حافظہ تو خداداد تھا، مگر انھیں دو نے ان کو ممتاز اور کامیاب کیا تھا۔ قوت آخذہ، اور ترتیب مواد وسعت معلومات میں اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں فرد تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد بڑے مصنف اور نثار تھے مگر مواد کے لئے اپنی تصنیفات میں ان سے مستفید ہوتے، علامہ کی علالت کے زمانہ میں میں نے اس قسم کے استفسارات کے جواب لکھے ہیں۔ تفصیل "نسخی قران کے سوانح" کا کام ہے، مجھکو تو وہ جیسے نظر آئے اور جن باتوں میں وہ دوسروں سے ممتاز تھے بیان کر دیں، ہمارے مولانا کے تعلیم پانے کا جو اثر ہم پر تھا، وہی ان پر بھی تھا، انکی طبیعت میں اُپج وہی تھی، انھوں نے علاوہ ہمارے مولانا کے لاہور رہکر کچھ حصہ قرآن پاک اور حماسہ حضرت مولانا فیض الحسن صاحبؒ شارح حماسہ سے پڑھا تھا۔ حدیث کی تکمیل مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری اور مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری سے کی تھی۔ فرماتے تھے کہ جب میں باہر گیا تو والد یعنی مولوی حبیب اللہ صاحب وکیل جو مرفہ الحال تھے اور بزار میں بڑے سخی داتا تھے اور میرے اور بھائیوں کو علی گڈھ رکھکر پڑھوایا۔ ایک بھائی کو ولایت بھیجا، مجھکو صرف پانچ روپیہ ماہانہ دیتے، مگر میری بسر اچھی طرح ہو جاتی، سستا سماں تھا کوئی حیرت کی بات نہ تھی، عربی کے طالبعلم کی زندگی سادہ ہوتی ہی ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ اور سر سید کی صحبت نے انکی مولویت کی جڑ اکھاڑ پھینکی تھی، اسپر سر ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی صحبت نے دکن میں جنکو وہ ہمیشہ اپنا مربی کہتے تھے انکو بہت کچھ مستشرقیت سے روشناس کر دیا تھا اور مطبوعات یورپ انھیں کی وساطت سے علامہ کو دستیاب ہوتی تھیں انگریزی کے حرف شناس تھے، کبھی کبھی الفاظ بوجھکر صحیح جملے ادا کر لیتے، فرانسیسی ڈاکٹر آرنلڈ سے سیکھی تھی اور اسکا اپنے مضمون اور موضوع کے مطابق کچھ مطلب حل کر لیتے تھے۔ انکی فارسیت انکی عربیت سے بلند تھی مگر عربیت بھی بہت اچھی تھی جب شعر العجم زیر تصنیف تھی تو میں نے عرض کیا کہ آپ اپنے منشی نامے سے باہر کیوں جا رہے ہیں، ابھی تو وہ کام

بانی ہو۔ فرمایا! اب تم لوگ کرلینا، مگر یہ تو میرا بچپن کا شوق ہے، اسکو تو پورا ہی ہوجانے دو، ورنہ دب جائیگا۔ براؤن کی ادبیات ایران شائع ہوئی، ادھر شعر العجم کا بھی اشتہار ہوچکا، لوگ سمجھے کہ علامہ نے یہ خیال اس سے لیا، مگر اس سے پہلے شعر العجم بہت کچھ ہوچکی تھی، تاہم بچپن مصنف نے براؤن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھوا کر سوس کا ترجمہ سن لیا، پھر کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ اسنے میرا کام نہیں کیا۔ حالانکہ براؤن نے بعد کی جلدوں میں خود علامہ سے بڑی تشکر و امتنان کے ساتھ بہت کچھ نقل کیا۔ یہ جواب تھا، ان لوگوں کا جنھوں نے بدظنی کو دخل دیا۔ ان بعض الظن اثم۔ اسکے بعد شعر العجم کی تنقید یں میرے نزدیک وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو الفرق اور الفاروق میں ہے۔ الفاروق رضؓ پر یاد آیا۔ میں نے ایک مرتبہ حضرت الاستاذ سے سوال کیا کہ آپکو اپنی تصانیف میں سب سے پیاری کون تصنیف ہے۔ فرمایا۔ الفاروق رضؓ۔ یہ حق بھی ہے۔ وہ اولاد بہت پیاری ہوجاتی ہے جسکی پرورش میں زیادہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ اسی ایک تصنیف کے لئے لمبے لمبے سفر کئے۔ طویل علالت جس کے جراثیم عمر بھر ستایا کئے۔ اسی ایک کی بدولت اٹھاون چھپن ستاون برس کی عمر میں مولانا ایک پیر فرتوت معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ اکھاڑے میں اترنے والے کسرتی جوان تھے۔ مولانا حالی سے سچے نقادِ سیرت نے انکی شان میں خوب کہا ہے ؎

ادب اور شرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحیدِ عصر یکتائے زمن دیکھیں

حالات ندوہ

سالانہ امتحان قریب ہے شعبان میں امتحان شروع ہوگا لیکن تیاری ابھی سے شروع ہوگئی ہے طلبہ بڑے انہماک سے اپنی کتابیں دیکھ رہے ہیں سارا دن اور رات کا بڑا حصہ اسی مشغولیت میں گزرتا ہے۔

شروع اگست میں مولانا محمد عمران صاحب انچارج مہتمم دارالعلوم کی دعوت پر جناب چودھری خلیق الزماں صاحب دارالعلوم تشریف لائے اس تقریب میں نواب شمس الحسن صاحب، مولوی صباح الدین صاحب رفیق دارالمصنفین اور دارالعلوم کے کچھ اساتذہ بھی شریک تھے تقریباً تین گھنٹے بڑی دلچسپ اور پرلطف مجلس رہی مختلف سیاسی اور علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا مسلم لیگ کے نصب العین مقاصد اور راہ عمل کے متعلق کافی گفتگو رہی اس سلسلہ میں پاکستان کے نظریہ اور اسکے عملی خاکہ پر بھی خاصی بحث رہی چودھری صاحب نے اس بارہ میں تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کئے اور فرمایا کہ واقعات وحقائق کی روشنی میں ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشاکش کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے۔

اس مہینے الاصلاح میں بھی خاصی دلچسپیاں رہیں شعبۂ خطابت کے ماتحت کئی اہم مباحثے (ڈبیٹ) ہوئے۔ "۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مشرق ومغرب کی کشمکش" موضوع بحث تھا اس سلسلہ میں متعدد اصلاحی، تعلیمی اور تعمیری تحریکوں پر گفتگو ہوئی خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کی جدید تعلیمی تحریک اور دیوبند کی مذہبی دعوت پر تفصیل سے بحث ہوئی آخر میں دین ودنیا کی "باہم آمیزی" کے تصور نے ندوۃ العلماء کا خیال دلایا اور اس تحریک کی پنجاہ سالہ اصلاحی جدوجہد پر مقررین نے تفصیل سے بحث کی۔

عربی زبان کی اشاعت وترویج کی غرض سے دارالعلوم میں "النادی العربی" کے نام سے ایک انجمن عرصہ سے

سے قائم ہو پچھلے سال اس انجمن کے ماتحت ایک کل ہند مباحثہ (آل انڈیا ڈبیٹ) ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف اسلامی مدارس نے حصہ لیا تھا سال گزشتہ یہ اجتماع ستمبر میں ہوا تھا لیکن اب کی رمضان کی وجہ سے اس زمانہ میں جلسہ نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے بجائے انشاء اللہ ذیقعدہ (نومبر) کی کسی تاریخ میں ہوگا صحیح تاریخ اور جلسہ کے پروگرام کی اطلاع شوال میں دی جاسکے گی اس بارہ میں اگر کسی صاحب کو مزید معلومات حاصل کرنی ہوں تو وہ مدیر النادی العربی سے خط و کتابت کر سکتے ہیں،

اس درمیان مجلس الالعاب الریاضیہ (گیمس کمیٹی) کے حلقہ میں بھی بڑی دلچسپیاں رہیں فٹ بال کے متعدد مقابلوں (میچس) کے علاوہ سب سے دلچسپ چیز اناڑیوں کا میچ تھا جن لوگوں نے شاید کبھی فیلڈ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا اس مقابلہ میں شریک تھے اس میچ نا واقفان میں اصول و قواعد کی پابندی کا کیا ذکر ہو ریفری کی سیٹیاں انھیں متوحش ضرور کر دیتی تھیں لیکن اس سے انکی جدوجہد پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا بہرحال تقریبًا ڈیڑھ گھنٹہ اناڑیوں کی یہ کشاکش جاری رہی بالآخر فتح و شکست کے فیصلہ کے بغیر کھیل ختم ہوگیا اور شربت کے گھونٹوں سے کام و دہن کی تشنگی دور کی گئی۔

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں مولوی ابوالحسن علی صاحب کی کتاب "مختارات" کا ذکر آچکا ہے یہ عربی ادب و انشاء کا ایسا مرقع ہے جس میں تقریبًا ڈیڑھ ہزار برس کے انشاء پردازوں کے کلام کے ایسے نمونے جمع کئے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر اس عہد کی ادبی اور ذہنی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے کتاب پریس میں جاچکی ہے انشاء اللہ ستمبر کے آخر تک شائع ہو سکے گی۔

اَلنَّدْوَہ

زیر نگرانی

علّامہ سیّد سُلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۲ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۱ء نمبر ۹

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر منیجر رسالۂ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

علمی اور دینی حلقوں میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کی خبر وفات سخت رنج و افسوس کیساتھ سُنی جائیگی۔ مرحوم زہد و ورع میں سلف کی یادگار تھے۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت ارادت ہی نہیں بلکہ والہانہ تعلق تھا جو تذکرۃ الرشید کے ورق ورق میں نمایاں ہے۔ علمی کاموں میں تذکرۃ الرشید اور مکاتیب رشیدیہ کے علاوہ قرآن مجید کا ترجمہ اور جمع الفوائد کی اشاعت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ندوہ سے بھی مرحوم کا تعلق رہا ہے، ابتدائی زمانہ میں یہاں کچھ عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

یہ سطور ابھی ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ یکایک مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی کے سانحۂ وفات کی درد انگیز اطلاع ملی۔ استاذ مرحوم مولانا عبد الرحمٰن نگرامی کے تعلق سے ہم اہل ندوہ کو مرحوم کی ذات سے ایک خاص وابستگی تھی، اسلئے انکی یہ وفات ہمارے لئے ایک ذاتی حادثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرحوم ایک سادہ مزاج صاف دل، پاک باطن اور نیک نفس بزرگ تھے، انکی سادگی، دینداری اور نیک نفسی سارے جوار میں ضرب المثل تھی۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت زندگی کا خاص مقصد تھا۔ اس سلسلہ میں اردو کے علاوہ ہندی میں بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ سوامی عربی نبیؐ کا جیون چرتر اس سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔ قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ بھی کر رہے تھے، لیکن افسوس کہ اسکی تکمیل سے پہلے ہی مصنف کا نسخۂ حیات تمام ہوگیا۔ اس حادثہ پر ہمیں مرحوم کے اعزہ خصوصاً ان کے لائق فرزند مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کی یہ خدمتیں قبول فرمائے اور انھیں اپنی بخششوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔

اگست کے آخری ہفتہ میں مولانا محمد عمران صاحب انچارج مہتمم دارالعلوم دہلی تشریف لے گئے مولانا سعد الدین صاحب ندوی کے یہاں جامعہ ملیہ میں قیام رہا۔ اس تقریب سے جامعہ کے مختلف تعلیمی اور تربیتی شعبوں کو دیکھنے کا موقع ملا، اساتذہ اور کارکنان جامعہ بڑے لطف و محبت سے پیش آئے مولوی سعید انصاری پرنسپل ٹرننگ کالج، مولوی عبدالجلیل صاحب ندوی اور مولوی عبداللطیف صاحب ندوی کی عنایتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں، شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی کرم فرمائیاں شکریہ سے بالاتر ہیں۔ مولانا سعد الدین صاحب ندوی کی لذیذ دعوتوں اور پرلطف صحبتوں کی یاد مدتوں تازہ رہیگی۔ ایک دن مولوی محمد جعفری مدیر ملت کے یہاں بھی بڑے لطف سے بسر ہوا۔

دہلی کے اس سفر کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر جناب مولانا محمد الیاس صاحب کی عارفانہ صحبتوں اور بزرگانہ نوازشوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ کئی بار حاضری کا موقع ملا اور ہر بار دل نے ایک خاص لذت و اثر محسوس کیا۔ بستی نظام الدینؒ کی حاضری کے سلسلہ میں ایک دن جناب خواجہ حسن نظامی کے یہاں بھی جانا ہوا۔ خواجہ صاحب سے پہلی ملاقات تھی لیکن وہ اس محبت و اخلاق سے ملے کہ برسوں کے تعلقات کا دھوکہ ہونے لگا۔

دہلی سے واپسی میں علی گڑھ اور آگرہ میں قیام رہا۔ علی گڑھ میں مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی کی عنایتوں نے اس سفر کو حضر سے بدل دیا اور مسافرت میں گھر کا مزہ آنے لگا آگرہ میں تاریخی آثار کی زیارت کے علاوہ دیال باغ کے صنعتی مرکز کے مشاہدہ کا بھی موقع ملا۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ سفر بہت مفید رہا۔

میری محسن کتابیں

از جناب مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند۔

موقر اور علمی رسالے "الندوہ" لکھنؤ میں ایک عرصہ سے عنوان بالا پر مضامین لکھے جا رہے ہیں ملک کے ذی علم اور قابل فخر اہل قلم دلکش انداز اور موثر پیرائے میں اس پر طبع آزمائی فرما کر اردو ادب میں ایک نئے اور اچھوتے باب کا اضافہ کرتے ہیں، سلاست بیان کے ساتھ ساتھ طبائع کی رنگینی نے بھی اس عنوان کو کچھ ایسا دلچسپ بنا دیا ہو کہ جدید مضامین تو بجائے خود قدیم مضامین کا اعادہ بھی قند مکرر سے کم نہیں ہوتا ہو حتی کہ میں نے اپنے بعض سفروں میں بعض اہل علم کو والہانہ انداز میں اس کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔

میرے لئے ارشاد ہو کہ میں بھی مذکورہ بالا عنوان پر کچھ لکھوں، میں نے اسکی تعمیل بھی کرنی چاہی اور کئی بار کچھ لکھا بھی، لیکن جب کبھی تمہید کو ختم کرکے اصل موضوع پر عرض حال کا موقع ہوا تو اس خیال نے قلم کو آگے بڑھنے سے روک دیا کہ اس عنوان پر لکھنا انھیں اصحاب قلم کو زیب دیتا ہو جنپر کتاب نے احسان کیا ہو اور انھوں نے اہلیت کے ساتھ اسکے احسانات کو قبول کیا ہو، یا مشاہیر کے درجہ میں ہوں تاکہ انکی آپ بیتی سامعین کو اپنا مشتاق بنا لے، یہاں یہ حال ہو کہ تحریر مضمون کے شرائط ہی مفقود ہیں تو میری گذارش بے وضو کی نماز نہ ہوگی تو کیا ہوگا، مگر ارشاد ہوا اور سو کہ ارشاد ہو کہ اس مضمون پر مجھکو کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہو، پس اگر تعمیل نہ کروں تو کیا کروں۔

میرے سب سے بڑے بھائی حافظ تھے اور والدہ مرحومہ سے سنا ہے کہ بہت اچھا قرآن پڑھا کرتے تھے، انکی نوعمری کا آغاز ہی تھا کہ دوست احباب کی رائے سے والدین کی بلا اجازت الہ آباد پہونچکر پولیس کانسٹبل بنگئے، طبیعت صالح تھی، چند ہی سال کے بعد سب انسپکٹر پولیس ہوگئے، غالباً جس روز سے بغرض تلاش ملازمت نکلے قرآن شریف کی سورتیں کبھی نماز میں پڑھی ہوں تو پڑھی ہوں، تلاوت

کی غرض سے کبھی قرآن شریف ہاتھ میں نہ لیا۔

حفاظ سے سنا ہو کہ قرآن شریف کو یاد کر لینا کچھ مشکل نہیں ہو، اسکو سینہ میں محفوظ رکھنا بہت زیادہ مشکل ہو، نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہو سکتا تھا کہ سب اسکالرشپ تو مل گئی مگر قرآن شریف یاد نہ رکھ سکے۔ مرحومہ والدہ کو اس کا بہت سخت صدمہ تھا، ان کے والد (میرے نانا) اگرچہ علماء میں سے نہ تھے۔ مگر پڑھا لکھے لوگوں کی طرح بہت زیادہ دیندار تھے، مجھ سے دو اور بڑے بھائی تھے انہیں سے ایک نے اردو مڈل پاس کیا اور ریاست گوالیار وغیرہ میں تلاش روزگار تشریف لیگئے۔ میرے دوسرے بڑے بھائی نے عربی شروع کی اور وہ میزان الصرف سے آگے نہ بڑھنے پائے تھے کہ والد مرحوم کے ایک دوست سید محمد علی صاحب سررشتہ دار کے اصرار سے عربی چھوڑنے پر مجبور ہونے اور انگریزی میں انٹرنس پاس کیا۔

مرحومہ والدہ نے حفظ قرآن کے لئے مجھکو ایک سن رسیدہ اور معمر حافظ صاحب کے پاس بھیجوادیا اور میں حفظ قرآن میں معروف ہوگیا۔

مجھکو یاد ہو کہ میں ایک روز اسی مکتب میں پڑھ رہا تھا جسمیں مجھکو حفظ قرآن کے لئے بٹھادیا گیا تھا کہ اتفاقاً سید محمد علی صاحب مرحوم تشریف لائے، میں حافظ صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا مجھکو دیکھکر فرمایا کہ یہ بچہ کس کا ہو؟ حافظ صاحب نے فرمایا کہ منشی سراج علی (میرے والد کا نام ہی) کا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صاحب میرے والد کے دوست ہیں، اس گفتگو کو سنکر اس اُمید پر ان کو دیکھنے لگا کہ یہ خوش ہوں گے اور میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے، مگر خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم، سید صاحب مرحوم کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا اور بگڑ کر بولے کہ سراج علی نے یہ کیا حماقت کی کہ اس معصوم بچے کو حفظ قرآن میں لگادیا، کیا انکا یہ مقصد ہو کہ اسکو حافظ ہونیکے بعد قبروں پر تلاوت قرآن کی ملازمتیں کرنے اور فاتحہ کے حلوے کھانے پر مجبور کریں۔

میں اُسوقت بہت ہی چھوٹی عمر کا تھا، بعض الفاظ میں، تو تلا پن بھی تھا کہ ان کو نقل کر کرکے میرے دوست ہنسا کرتے تھے، اس کم سنی کے باوجود مجھکو یاد ہو کہ سید صاحب مرحوم کے یہ الفاظ مجھکو بہت زیادہ گراں گذرے اور میں نے ان کے اس کلام کو توہین قرآن کے مرادف سمجھا۔

سید صاحب مرحوم جو دانگریزی تعلیم یافتہ نہ تھے بلکہ شاید انگریزی کا ایک حرف بھی نہ جانتے تھے، پنج وقتہ نماز پڑھتے تھے، بعض مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے پیش شدہ کاغذ کھلا چھوڑ کر نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں چلے آتے تھے، کچہری جاتے تھے تو عالمانہ وضع کا سیاہ جبّہ پہن کر جاتے تھے اور غایت دینداری یہ تھی کہ اس علو مرتبت کے باوجود ایام محرم میں جھنڈی اپنے ننگے سر پر رکھکر اور ننگے پاؤں چلکر چڑھانے جایا کرتے تھے، آگے آگے باجہ بجتا تھا اور پیچھے وہ خود بہیئت کذائی مع اپنے مسلمان عملہ کے ہوتے تھے۔ اس نہایت ہی مقدس رسم میں میں نے بھی کئی سال شرکت کی ہے۔

غرض سید صاحب مرحوم کی اس نامحمود سعی نے کامیابی حاصل نہ کی اور میں حافظ قرآن کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اسکے بعد ہی میری آنکھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ سید صاحب مرحوم کی پیشن ہوئی اور اس ضعیفی میں ان کو (خدا جانے کیوں) خیال آیا کہ ان کا چھوٹا بیٹا حافظ قرآن ہو۔

سید صاحب مرحوم صاحب ثروت تھے، اچھے اچھے اُستاد اس غرض کی انجام دہی کے لئے ملازم رکھے اور برسوں رکھے مگر انکی آرزو پوری ہی نہوئی، میرا تو ابتک یہی خیال ہو کہ شاید خالق عزاسمہٗ کو سید صاحب مرحوم کی وہ عاجلانہ توہین پسند نہوئی جو کلام قدیم کی ہوگئی۔

حفظ قرآن سے فراغت کے وقت میری عمر کیا تھی مجھکو صحیح یاد نہیں ہو، اسقدر ضرور یاد ہو کہ بعض بعض لوگ میری موجودگی میں میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے کہ منشی جی (والد مرحوم) نے ازراہ تفاخر اسکو حافظ مشہور کر دیا ہے ورنہ ایسے صغیر السن بچے کا حافظ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

ان صاحبوں کا یہ کہنا کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا، کیونکہ میرے حفظ قرآن کی حقیقت اس سے

معلوم ہو سکتی ہے کہ پہلی دفعہ قرآن شریف تراویح میں سنانے کی تکلیف آج بھی مجھکو یاد ہے کہ رمضان المبارک میں سحری سے فارغ ہوکر قرآن شریف لیکر بیٹھ جاتا تھا۔ ضروریات انسانیہ کے لئے تو ضرور اپنی اس جگہ سے اُٹھتا تھا مگر نماز بھی اسی جگہ پر پڑھتا تھا جس قرآن شریف یاد کرتا تھا، رات کے آخر حصہ سے یاد کرنا شروع کرتا تھا اور اسی چوکی سے تراویح کے وقت اُٹھکر مسجد چلا جاتا تھا، دو چار پارے پڑھے نہ ہوتے تھے صرف سوا پارہ سنانا ہوتا تھا اور وہ بھی اس شکل سے، اس صورت میں اگر لوگوں کو میرے حافظ ہونیکا انکار تھا تو بیجا نہ تھا۔

رمضان کی چھبیسویں تاریخ اور ستائیسویں شب میں قرآن شریف ختم ہوا، والدین کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، میرے بڑے بھائی بھی خوش تھے ختم قرآن شریف کی اس رات کو اس طرح آرام سے سویا کہ سحر کے لئے مشکل سے اُٹھایا جا سکا اور پھر سو گیا، مجکو یاد نہیں کہ میں نے اُس روز صبح کی نماز پڑھی ہو والدہ مرحومہ خود بھی نماز کی پابند تھیں خصوصیت کیساتھ میری نماز کی نگرانی زیادہ کرتی تھیں، مگر میری تقریبًا ایک ماہ کی محنت کا خیال یا کم عمری کا لحاظ مجھکو جگانے سے مانع آیا، سو کر اُٹھا تو مکتب میں آیا اور اس اُمید پر آیا کہ آج مکتب کے بچے اور خود حافظ صاحب بھی میری تعریف کریں گے۔ مجکو یاد نہیں کہ حافظ صاحب نے میری موجودگی میں میری تعریف کبھی بھی کی ہو، مکتب میں حاضر ہوا تو ایک ساتھی نے آہستہ سے فقرہ چست کیا کہ چھبیس دن کے بعد گھر کے جیل خانہ سے انکی رہائی ہوئی۔ حافظ صاحب نے اپنی معمولی سادگی کے ساتھ فرمایا کہ اس حفظ قرآن کا کوئی فائدہ اسکے بغیر نہیں کہ حافظ اس کے معنی سے بھی واقف ہو اور معانی قرآن کا سمجھنا عربی پڑھنے ہی پر موقوف ہے۔

حافظ صاحب کی کرامت کہئے یا خدائی قدرت کا کرشمہ کہ میں نے اُسی وقت یہ عزم صمیم کر لیا کہ مجکو عربی پڑھنا ہے۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ میرے عربی پڑھنے کا محرک قرآن شریف ہی ہے۔

یہ ہے میری ابتدا۔

حافظ صاحب ہی نے فارسی کے سلسلہ میں مجکو آمدنامہ شروع کرایا، وہ فارسی کے ماہر نہ تھے مجکو یاد ہو کہ مجکو گلستاں پڑھاتے وقت مترجم گلستاں سامنے رکھکر ترجمہ کرایا کرتے تھے، اسی اثنار میں والد صاحب مرحوم کی تبدیلی قصبہ تلہر کی ہوئی، میں وہاں پہونچکر مدرسۂ گلشن فیض میں داخل ہوا، اس مدرسہ میں پچاس سے کچھ اوپر طلبہ پڑھتے تھے۔ ہر طالبعلم فیس ادا کرتا تھا اور رجسٹری سے بھی غالباً آٹھ روپے ماہانہ بطور امداد ملا کرتے تھے، اس مدرسہ میں ایک ہی مدرس جناب مولوی مقصود علی خاں صاحب رحمہ اللہ تھے، انکی صرف و نحو بہت اچھی تھی، طرز تعلیم اسی طرز کا تھا جس طرز کا اب سے سائھ ستر برس قبل پنجاب یا صوبۂ سرحد میں سنا گیا ہو، میزان الصرف تو اول سے آخر تک بالفاظ یاد تھی، منشعب کے ابواب اور صرف صغیر محفوظ تھے، زبدہ بھی بالفاظہا یاد تھا، نحو میں، نحو میر، اور کافیہ کے آخری چند اوراق کے علاوہ پورا کافیہ یاد تھا، اور اسمیں اسقدر شغف تھا کہ اکثر اوقات سونے کی حالت میں بجائے قرآن شریف کے میزان الصرف یا نحو میر کے الفاظ زبان سے نکلا کرتے تھے میں نے گلستاں بھی از سرِ نو شروع کی تھی، اس مدرسہ میں گلستاں کی جماعت بہت سے فارسی قواعد کے بعد گلستاں پڑھ سکتی تھی، مگر خدا کا شکر ہو کہ مجکو قواعد سمجھ لینے کے بعد گلستاں میں زیادہ دشواری نہوئی، اس اثنار میں والد مرحوم کی پنشن ہوئی اور میں پھر شاہجہاں پور آگیا، اسوقت میری تعلیم کے نگراں ایک ایسے بزرگ تھے جو عربی تعلیم سے قطعًا ناواقف تھے، ان کی نگرانی کے نقصان ہی نے میرے کئی سال ضائع کردیے، اپنی عمر کو ضائع بھی کرتا تھا، مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں آخر ایک تدبیر سمجھ میں آئی اور نگرانی کرنیوالے بزرگ سے میں نے کہا کہ میری فارسی کی کتابیں باقی ہیں۔ جن صاحب کے پاس آجکل پڑھ رہا ہوں ان کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہو اور شاید وہ فارسی بھی پڑھائیں، اسلئے سکندرنامہ پڑھنے کی اجازت مجکو دیجائے کہ مدرسۂ عین العلم واقع شاہجہانپور میں داخل ہوکر پڑھ لوں، حسن اتفاق سے یہ اجازت مل گئی، اور مدرسہ میں پہونچا تو وہاں کسی استاد کے پاس

زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ میری جدوجہد سے میری حالت پر رحم فرماکر حضرت مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ صاحب مہتمم مدرسۂ امینیہ دہلی نے آدھا گھنٹہ سکندر نامہ پڑھانے کے لئے عطا فرمایا میں نے اسی کو غنیمت سمجھا، چند ہی مہینوں کے بعد اساتذہ کی شفقت نے۔ دو درسوں کے چھ گھنٹے ایک جماعت میں داخل کرکے مجھے دیدئے۔ اب میری عربی کتابیں بھی اس مدرسہ میں ہونے لگیں، اساتذہ کی اس عنایت نے ہماری جماعت کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ تحصیل علم میں طلبہ کو کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں ہم آزاد تھے پڑھتے وقت جو چاہتے تھے دریافت کرتے تھے۔ پڑھنے کے بعد مدرسہ میں رفع شکوک تو معمولی بات تھی جب چاہتے تھے گھروں پر پہونچ جاتے تھے، اور حضرت مولانا سید بشیر احمد صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کو توبہت مرتبہ سوتے سے اُٹھاکر کتابوں کی عبارتوں کا مطلب دریافت کرنیکی نوبت آئی ہے۔ قادر مطلق انکی قبر کو انوار رحمت سے بھرے، انکو ہمارے اس طرز سے کبھی کوئی دل تنگی نہوتی تھی، خارج ازاوقات مدرسہ شرح وقایہ مجکو حضرت مفتی صاحب دہلوی مدظلہ نے دوپہر کا سونا چھوڑکر پڑھائی ہے۔

اس اثنا میں میرے لئے ایک اور عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ گھر کے قریب ہی بازار تھا، ایمیں آریہ عطار کی دوکان تھی، اسکی عمر غالباً ساٹھ برس سے کم نہوگی، میں جب کبھی اسکی دوکان پر جاتا تھا تو تھوڑے سے وقت میں بہت سے اعتراض اسلام پر اور سیرت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کرتا تھا، ان اعتراضوں کو بیچین ہوکر میں اپنے اُستادوں سے جواب حاصل کرنیکی کوشش کرتا تھا، قرآن شریف کی فصاحت وبلاغت کا مسئلہ میرے لئے لاینحل مسئلہ ہوگیا تھا، صرفی نحوی شذوذ قرآن میں موجود تھے ہی، مختصر المعانی اسوقت تک اگرچہ نہ پڑھی تھی، مگر فارسی قواعد تو معلوم ہی تھے، اسی حالت میں میں دارالعلوم دیوبند پہونچا، کچھ عرصہ کے بعد ضروری کتابوں سے فارغ ہوکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیضاوی شریف شروع کی، سورۂ بقرہ کے اول ہی میں حروف مقطعات کی بحث ہے مجکو حضرت قدس سرہٗ کی تقریر تو یاد نہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ اسکو سمجھنے کی مجھ میں اہلیت بھی نہ تھی، مگر اسقدر یقینی ہے کہ وہ پہلا دن تھا جسمیں قرآن شریف کی طرف سے

رہا ایک کھٹک میرے دل سے دُور ہوئی۔

یہ ہے میری انتہا!

اب غالباً میری گذارش سے واضح ہوگیا ہوگا کہ میرے علم ظاہری کا سبب بھی قرآن شریف ہو اور عقیدہ کی طہارت و نظافت کا سبب بھی قرآن شریف ہی ہے۔

قیام دار العلوم دیوبند میں ایسی حالت میں کہ میں نور الانوار پڑھتا تھا اور ایک اور صاحب شریک دورہ تھے، مجکو مقامات حریری پڑھانے کے لئے تیار ہوئے۔ انکی تعلیم نے علوم عربیہ سے محبت پیدا کر دی اور تو کچھ آیا نہیں مگر ادب کی عظمت دل میں اسقدر ہوگئی کہ حسن ظن رکھنے والے مجکو ادیب کہتے ہیں اور میں اپنے دل ہی دل میں کہا کرتا ہوں ؎

وہ صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں احمق نہیں ہم اسکو نہ سمجھیں اگر غلط

میں نے عرض کیا تھا کہ میری نحو و صرف کی تعلیم ایک ایسے اُستاذ سے ہوئی ہو جو اس طرز کے معلم تھے جس طرز کے معلم قدیم زمانہ میں صوبۂ سرحد یا پنجاب میں ہوتے تھے یعنی مشکل صیغوں کی باقاعدہ تعلیلیں، پیچیدہ عبارتوں کی باضابطہ ترکیبیں پوری پابندی کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، اسلئے میں شرح جامی کو ختم کر لینے تک بجز درس نظامی کی نحوی کتابوں کے اور کسی کتاب کا مطالعہ نہ کر سکا۔

دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونیکے بعد حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے مدرسۂ نعمانیہ واقع پوریتہ ضلع بھاگلپور کے مدرس ادبی کے لئے مامور فرمایا تو وہاں کچھ موقع ملگیا کہ قومی مدارس کی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کروں، اس زمانہ میں میں نے مفصل کو بھی دیکھا، اور اوضح المسالک کا مطالعہ بھی کیا۔ اور اسی زمانہ میں الفیہ کی شرح ابن عقیل کو بھی دیکھا۔ زمخشری کی علمی عظمت کا مقتضا یہ ہو کہ میں مفصل کے مقابلہ میں کسی کتاب کا نام نہ لوں، مگر اسوقت جو عرض کرنا ہو وہ یہ ہے کہ مجکو دلچسپی کس سے ہوئی۔

سچ یہ ہو کہ میں نے افادی حیثیت سے اوضح المسالک کو مفصل پر ترجیح دی اور اسکے بعد

جب ابن عقیل کا مطالعہ کیا تو مجکو اس سے محبت ہوگئی، اس کتاب کو میں نے متعدد بار دیکھا اور چاہا کہ طلبہ اس کتاب کو پڑھیں، مگر مدرسہ نعمانیہ مذکورہ ایک انجمن کے ماتحت تھا، ارکین انجمن سے حصول اجازت کے بغیر اس ارادے پر عمل کرنا خلاف ضابطہ تھا، اور وہاں کے قدامت پسند ممبر اسکی اجازت نہ دیتے تھے، اسلئے میں کامیاب نہوا۔ دار العلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو اپنے بڑے لڑکے کو پڑھانے کا موقع ملا، اس سلسلہ میں میں نے ایک جماعت کو ابن عقیل کی شرح پڑھائی، اور میرا خیال یہ ہو کہ پڑھنے والونکو بہت زیادہ نفع پہونچا، اور اسطرح میں نے اسکو خارج از اوقات مدرسہ کئی دفعہ پڑھایا، ابن عقیل کے اخلاص کی برکت کہ جس نے اسکو پڑھا وہ اس کا شیدا ہوگیا، آجکل بھی ہمارے یہاں ایک صاحب اطراف بمبئی کے ساکن جو انگریزی میں ایم اے ہیں، دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولوی فاضل (پنجاب) کو معقول تنخواہ دیکر میزان الصرف پڑھتے پڑھتے ابن عقیل تک پہونچے ہیں، اُن کی تعلیم میں میرے مشورہ کو بھی دخل ہو، وہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ مجکو تو ابن عقیل کا ایک ایک نقطہ پیارا معلوم ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہو کہ میرے نزدیک ایک زمانہ دراز تک سلاست بیان، مقاصد نحویہ کی تکمیل اور حسن تفہیم میں ابن عقیل کی نظیر نہ تھی، دار العلوم دیوبند کی حاضری کے بعد حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت میں نے کتاب سیبویہ کا مطالعہ کیا، اور آج تک چار دفعہ اُس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔

اب میرا عقیدہ یہ ہو کہ کتاب سیبویہ ہی ایک ایسی کتاب ہو جو طالبعلم کے سامنے نحو کے تمام علمی ذخائر رکھدیتی ہے اور متعلم اپنی قابلیت کے موافق اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہو۔

طلبہ کے درس میں اسکو داخل کر دینا تو شاید غیر مفید بلکہ مضر ہو، لیکن شاید یہ نامناسب نہو کہ جسوقت طالبعلم میں کافیہ واشالہا کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاوے طالبعلم کے مطالعہ میں یہ کتاب رہے اور کافیہ کے بجائے شرح ابن عقیل کو رکھا جاوے۔

نصاب کے متعلق میری ایک مستقل گذارش ہو، اگر موفق حقیقی نے توفیق عطا فرمائی تو کسی قریبی

فرصت میں الندوہ کے اہل علم ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا تاکہ اگر ان پریشان خیالات میں کوئی چیز عمدہ ہو تو عمل فرمائیں ورنہ "کالائے بد بریش خاوند"۔

ادب کے سلسلہ میں مجکو معذور سمجھا جاوے اگر میں یہ عرض کروں کہ "معشوق من است آنکہ بنزدیک تو زشت است۔" عصر حاضر کے علما مقامات حریری سے ناراض ہیں، صوبہ آسام کے سرکاری عربی مدارس کے ممتحن ہونیکی حیثیت سے مجکو علم ہو کہ ..... یہ مظلوم کتاب صرف پانچ مقاموں تک داخل ہو، انتخاب سوالات کے وقت میں اکثر متعجب ہوتا تھا کہ مقامات حریری کے ان چند اوراق کو داخل کرنیکی بھی کیا ضرورت تھی؟ اگر تبرک ہی حاصل کرنا تھا تو طلبہ کو اسکی فقط زیارت کرادی جاتی، اب سنا ہو کہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس خیرالاتحریر کو اپنے نصاب میں جگہ دیدی ہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ بعض حضرات تو حدود ادب سے متجاوز ہو کر کتاب و مصنف کتاب کی نسبت سقیم الفاظ استعمال کرنیسے بھی دریغ نہیں فرماتے ہیں، لیکن میں مقامات حریری کا مداح ہوں اور سمجھتا ہوں کہ خدا معانی لغات اور لغات کے مختلف استعمالات، علم بدیع کے تفننات وغیرہا کی حقیقت جسطرح یہ کتاب واشگاف کرتی ہے، دوسری کوئی کتاب اسکے مساوی میرے علم میں نہیں ہے، اسلئے کم از کم پچیس مقالے داخل درس ضرور رہیں، اسی کے ساتھ تاریخ یمینی کا کوئی معتد بہ حصہ بھی داخل درس رہنا ضروری ہے۔

متاخرین کے دواوین میں دیوان بحتری کو بارہا ذوق و شوق سے دیکھا، لیکن بالعموم شعرائے جاہلیت کے کلام میں+ میں ان اوصاف کو محسوس نہ کرسکا، شعرائے جاہلیت میں امرء القیس کا کلام مجکو زیادہ پسند ہو، متاخرین شعرا میں ابوالعلا معری کی سقط الزند مع اسکی شرح تنویر کے نیز ابن فارض کے قصائد آج بھی میرے سرہانے رکھے ہوئے ہیں، بہت سے علما سوتے وقت ادعیہ ماثورہ پڑھکر سوتے ہوں گے اور (افسوس) میں ان کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے سوتا ہوں۔

[× بجز دو اور [illegible]]

ادب کے لئے میرے خیال میں جس طرح صرف و نحو ضروری ہیں اسی طرح معانی و بیان بھی ضروری ہیں

معانی کے مصطلحات اور مختصر سی حقیقت سامنے آجانے کے لئے مختصر معانی (جو ہمارے قومی مدارس میں متداول ہو) پڑھ لینا طالب علم کے لئے ضروری ہو، اسکے بعد دلائل الاعجاز یا مطول کا مطالعہ کافی ہو۔

میری ذاتی رائے یہ ہو کہ طلبا کو اولاً سہولت اور اختصار کے ساتھ فن اور مصطلحات فن سے روشناس کرا دیا جائے اور اسی اثنا میں اساتذہ اپنے اثرات سے کام لیکر متعلمین میں وہ اہلیت پیدا کردیں کہ جسکی وجہ سے طلبہ شوق و رغبت سے مدرسہ میں آیا کریں اور ان کے تخیل میں مدرسہ اور جیلخانہ دو جدا جدا چیزوں کا نام ہو، اسباق کے اوقات ان کے لئے قید ہی کی مشقت کے اوقات کا نام نہو، بنا ءً علیہ جسوقت طلبہ میں مفردات لغت کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہوجائے ان کو اہل لغت کا مختصر طرز سمجھا کر مختار الصحاح یا اس جیسی کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرایا جاوے اور جب انمیں عربی دانی کی وسعت ہوجاوے تو منتہی الارب اسکے بعد لسان العرب سے کام لینا سکھایا جاوے۔

اقرب الموارد بر زیادت تسہیل کے باوجود مجکو بہت سے شبہات ہیں۔ اور منجد (جو آجکل قومی مدارس کے اکثر طلبہ کے پاس موجود ہو) بھی میرے نزدیک لغات جدیدہ کے لئے تو ایک حد تک مفید ہے مگر عربیت قدیمہ خصوصًا تفسیر و حدیث میں اس سے استمداد زہرلے ہوئے شہد سے کم نہیں ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا الحاج الحافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند قدس سرہٗ جب عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے منصب افتا پر فائز ہوئے تو اعزاز علی بھی ہمرکاب تھا، فتاوی نویسی کا اتفاق پہلا ہی تھا، اس زمانہ میں مجکو مجلہ علامہ اور الحجج الواضحہ فی البینات الراجحہ سے بہت مدد ملی جسکی وجہ سے میں آج بھی ان کے مصنفین کو دعائیں دیتا ہوں۔ اول الذکر کتاب تو آج بھی میرے پاس ہو اور کوئی نایاب کتاب نہیں ہو، سنا ہے کہ کسی عیسائی نے اسکی شرح بھی کی ہے۔ اس شرح کے ذریعہ سے حوالے بکثرت مل جاتے ہیں، مگر مؤخر الذکر کتاب جس کو فقہ کی انسائیکلوپیڈیا کہنا ناموزوں نہیں کمیاب ہو، ان دونوں کتابوں کا تعلق معاملات سے ہے

وسعت نظر کے لئے شاید یہ دونوں کتابیں معین نہ ہوں، مگر قضا کے مسائل بہت آسانی سے حل جاتے ہیں، وسعت نظر کے لئے میرے خیال میں بدائع سے عمدہ کتاب کوئی نہیں ہے۔

شرح وقایہ کا اگر میں بالکل ذکر ہی نہ کروں، کیونکہ پڑھنے کے بعد بار بار پڑھانیکی نوبت آئی لیکن اپنی عدم اہلیت کی بنا پر میں اُس سے زیادہ مستفید نہ ہوسکا تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

شرح نقایہ دو ہیں۔ ایک مُلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری شمنی کی، مؤخر الذکر نسخہ قلمی دارالعلوم دیوبند کے کتبخانہ میں ہے، اول الذکر قازان میں طبع ہوا۔ ہندوستان میں میں نے کئی جگہ نقلیں بھی دیکھیں مگر غالباً سب مطبوعہ قازان ہی سے منقول ہیں، کیونکہ اغلاط فاحشہ میں منقول اور منقول عنہ برابر ہیں۔ ایک نسخہ میرے پاس بھی ہے جسکو میں مدینہ منورہ سے خرید کر لایا تھا، وہ بھی مطبوعہ قازان ہی ہے ہندوستان میں اُسکی صرف ایک جلد تا آخر کتاب الحج طبع ہوئی ہے، دوسری تا آخر کتاب الوقف زیر طبع ہے۔

شرح نقایہ کے اس نسخہ کے متعلق میری تحسین اگرچہ ناشناس کی تحسین کیوں نہو مگر میں تو اس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ کے علوم کا طغرائے امتیاز سمجھتا ہوں، تقلید جس غلط معنی میں ہندوستان میں شائع ہوگئی ہے اسکا ازالہ اسی کتاب سے ہوسکتا ہے۔ میری رائے ہے کہ ابتدائے طفولیت ہی سے بچوں کو اخلاق و تصوف کی طرف مائل کیا جاوے، یہ امر آخر ہے کہ عملی ہو کتابی نہ ہو اور ان کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس تعلیم کا بھی نشو و نما ہو۔

مجکو اپنی کسی قریبی گذارش میں سلسلۂ اصلاح نصاب اسکے متعلق اپنے خیالات کو تفصیل کیساتھ پیش کرنا ہے، اسلئے اسوقت صرف اسپر ختم کرتا ہوں کہ اگر ریاض الصالحین جسکے مؤلف علامہ نووی ہیں داخل نصاب نہ کیجا سکے تو کم از کم درجہ وسطانی کے طلبہ پر اسکا مطالعہ لازمی کر دیا جاوے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کی تصنیفات کا مطالعہ میں اُن طلبہ کے لئے مفید سمجھتا ہوں جو فنون درسیہ سے واقف ہو چکے ہوں۔

یادِ ایّام

(۹)

از مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم۔ اے، انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد

کبھی کی باتیں کر کے یاد اب جو دل بہلتا ہے
تاثر لذت و غم کا اُبھر کر دل کو ملتا ہے

اگرچہ لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا ہی اجلاس زیر صدارت جناب مرحوم و مغفور منشی امتیاز علی صاحب قبلہ ہو چکا تھا مگر اب داعیان بالخیر کی دعوت پر پھر ۱۹۴۱ء میں اسکا اجلاس لکھنؤ میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ تعلقداریوں سے جگمگا رہا ہے۔ جناب مرحوم مغفور کی بدولت پرانے تعلقدار کچھ متوجہ ہو کر رہ گئے، اور وہ بھوپال تشریف لے گئے ورنہ علی گڈھ کی کافی تبلیغ اس گروہ میں ہو جاتی۔ یہ گروہ گورنمنٹ کے چندوں کا عادی تھا اور اس کا سارا روکا رکھا سرکار رکھا۔ اس سے باہر کی پبلک زندگی سے وہ محض نا آشنا تھا۔ خدا بخشے راجہ نوشاد علی خاں صاحب تعلقدار میلارائے گنج بڑے دریا دل، کھولٹ، زمانہ شناس اور تعلقداروں میں جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے، خود تعلیم یافتہ تھے اگرچہ سند یافتہ نہ تھے وہ اُردو کے اچھے شاعر تھے اور انگریزی لٹریچر پر نظر رکھتے تھے مشرقی ادبیات سے بھی انکو خاصی دلچسپی تھی انگریزی سوسائٹی اور اسکے لوازمات کے شوقین ماہر تھے اور انگریزوں کے انگریز تھے مگر رعونت سے پاک تھے، وہ علی گڑھ کے ٹرسٹی بھی تھے نواب محسن الملک جب لکھنؤ آتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے۔ ویسے تو جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ کا گھر اُسوقت ہر قومی تحریک کا مرکز تھا مگر اسمرتبہ سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس کی آسانی کی غرض سے نوشاد مرحوم کا گھر کانفرنس کا مرکز قرار پایا۔ یہ زمانہ وہ ہو کہ ہمارے مہاراجہ صاحب محمود آباد نئے نئے گدی نشین ہوئے ہیں قیصر باغ ان کے وجود سے باغ و بہار ہو رہا ہو اُنکی صحبت جدید تعلیم یافتہ

لوگوں سے بھری ہو رئیس کا دل قومی خدمت کی طرف آ رہا ہے۔

لیجئے کانفرنس بڑے آب و تاب سے شروع ہوگئی، گلی گلی، گھر گھر اسکا چرچا ہو جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ کے زیر اہتمام دیگیں کھنکنے لگیں، لکھنؤ کے رکابدار کانفرنسی مہمانوں کی ضیافت کو مستعد ہوگئے۔ اگرچہ پرانے کانفرنسیوں کو کہتے سنا کہ جو کھانا منشی امتیاز علی صاحب مرحوم نے کھلایا تھا اسکو یہ نہیں پہونچتا، مگر اسکی دو وجہیں ہیں، اول تو وہ ایک دریا دل کی شخصی فیاضی تھی دوسرے اب وہ رکابدار لکھنؤ میں کہاں میسر، پھر یہ دیگ چندہ کی محدود رقم کا کھیل تھا، تاہم مہمانوں کو انگلیاں چاٹتے ہی دیکھا۔ والنٹیروں کی دوڑ دھوپ شروع ہوگئی، مہمان قیصر باغ کے چاروں طرف کی عمارتوں میں آ آ کر اترنے لگے۔

چلئے کام میں رکاوٹ کچھ نہ کچھ اسکا زور بڑھا دیتی ہو۔ نہ جانے یاد نہیں آتا کس بات پہ علماء فرنگی محل بھڑک گئے، لکھنؤ کے عمائدین نے لاکھ کوشش کی اور منانے میں نواب محسن الملک کیا کم تھے مگر یہ روٹھے تو ایسے روٹھے کہ کسی کے منائے نہ منے اور خفا ہوکر آخرا بنا آلۂ حرب یعنی فتوی کانفرنس کے خلاف سرہی کر دیا۔ اب کیا تھا، ایک ہنگامہ برپا ہو گھر گھر کی رونق، اور اس نہ دلی کے زمانہ میں ہنگامہ نام ہے صرف زبانی جمع خرچ کا ورنہ اگر شاہی ہوتی تو تلواریں ضرور کھنچ جاتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی پبلک دو دل ہو کر رہگئی ورنہ لکھنؤ والوں سے بڑھکر ایسے میلوں کا قدر افزا اور دوسرا کون ہو سکتا تھا، جدید تعلیم یافتہ گروہ کی نظر میں فرنگی محل کی بھد ہوگئی۔ ادھر کانفرنسی پہلوان بھی کچھ کم نہ تھے، ابھی ابھی دنگوں سے اسی قسم کی بازی جیت کر آئے تھے، انھوں نے اپنے چشم و ابرو پر بل نہ آنے دیا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے تو گفتہ آید در حدیث دیگراں کے اصول پر ایک تقریر میں اپنی تشفی کرلی مگر شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد جنکوا و دھ پنچ نے قومی بھانڈ کا خطاب دیا تھا کس کی مان کے تھے خود بڑے جنگی مولوی تھے آواز وہ گھنگرج اور باٹدار کہ سفید بارہ دری میں تقریر کرنے

تو روشن الدولہ کی مسجد میں فتنہ آوازہ آتی ہوگی، عجب ہو کہ علامت وقت رجب پیر کرشن کبھی ہی ہو، انھوں نے اپنی بساط بھر اور بساط توان کے لئے کم ہوگی، اپنے حوصلہ بھر علماء کو خوب ہی ابھارا۔ اس سال کانفرنس کے صدر علی گڑھ کے پرانے رفیق اور پرنسپل مسٹر مارسین اپنی خدمات کے اعتراف میں الوداعی طور پر قرار پائے تھے۔ کانفرنس کی استقبالیہ کے صدر مہاراجہ صاحب محمود آباد تھے، اور یہ خطبۂ صدارت انکی پہلی پبلک تقریر تھی۔ اودھ پنچ نے تو اپنے انداز میں لکھا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بیگم کے جنازے کے سامنے تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ مگر اسکو کیا معلوم تھا کہ یہ قومی شیر آگے بڑھکر تمام ہندوستان بھر کو چھالے گا اور ہندو مسلمان دونوں اسکے سامنے سر جھکائیں گے۔ یہ کانفرنس میرے لئے تو گھر کا کھیل تھی، ہر جگہ پہونچ جانا ایک آسان سا تھا، نواب محسن الملک تو پہلے سے واقف تھا، اس زمانہ میں علی گڑھ میں سائنس کے شعبہ کو ترقی دینا منظور تھا ایسے لوگ کم تھے جو بغیر مذہبی خوف کے حاصل کرنے کی طرف ہاتھ بڑھاتے، سائنس کے لفظ سے لوگ بھڑکتے تھے اور اسکو غارتگر دین و ایمان سمجھتے تھے، اس لئے کانفرنس میں چند تقریریں مذہب اور سائنس کے اوپر بھی ہوئیں اسی ضمن میں نواب محسن الملک مرحوم نے ندوہ کا ایک طالب علم کہکر مجکو بھی پیش کیا اور میں نے اس موضوع پر تقریر کی، میرے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے، کانفرنس والوں نے وہ مجھ سے لے لئے مجھے تمیز نہ ہوئی کہ یہ چھپیں گے ورنہ تقریر لکھکر پڑھتا، اگرچہ یہ گناہ میں نے تمام عمر کبھی نہیں کیا چنانچہ انکی بدمذاقی دیکھئے کہ وہی نوٹ انھوں نے کانفرنس کی روداد میں چھاپ دیے۔ خود نواب محسن الملک مرحوم نے اسی موضوع پر ایک پرلطف تقریر شب کو کی۔ اس تقریر کی لذت آج تک یاد ہے انکی تقریریں فرید وجدی کا مواد بہت کچھ تھا۔ نواب محسن الملک مرحوم سنیوں میں تو آیات بینات کے مصنف ہونیکی حیثیت سے مولوی مانے جانیکے قابل ہیں اور نیچریوں میں تو علمی حیثیت سے یہی سرسید کا داہنا بازو تھے۔ ساری عمر باوجود معروفیت کے اور حیدرآباد کی معروفیت ان کا مطالعہ ہمیشہ جاری رہا۔ جس زمانہ میں حیدرآباد نہیں گئے تھے اور سرسید کا سایہ انپر نہیں پڑا تھا وہ مین پوری میں تحصیلدار تھے

تو ان کے شوق مطالعہ کا حال اپنے بزرگوں سے سنا ہو. جناب محسن کاکوروی وہاں وکالت کرتے تھے.
ان کا آبائی کتب خانہ وسیع تھا، نواب صاحب دن کو تو کام کرتے اور شب کو مولوی محمد محسن صاحبؒ کے
گھر آکر کوٹھے پر جہاں ان کا کتب خانہ تھا، ایک لالٹین لیکر چلے جاتے اور فجر کے وقت اُترتے، اس کو
کہتے ہیں شوق اور محنت! انگریزی برائے نام جانتے تھے مگر یورپ سے پورے یورپین بنکر ہو آئے تھے
حیدرآباد میں اپنے زمانۂ تموّل میں علی گڑھ کا کوئی قابل گریجوٹ اپنا ادبی سکریٹری بناکر رکھتے
یہ خدمت مرحوم خواجہ غلام الثقلین نے بھی انجام دی تھی، وہ انگریزی سے علمار و حکمار مغرب کی کتابیں
ان کے ذاتی مطالعہ کے لئے ترجمہ کرتے خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ بسبیل ذکر بیان کیا تھا گاگیزو کے
فلسفۂ تاریخ کا ترجمہ انگریزی سے انھوں نے نواب صاحب کے لئے کیا تھا. نواب صاحب کا مضمون
تہذیب الاخلاق میں ابن خلدون پر خوب ہو جو ان کے اس قسم کے مطالعہ کا پتہ دیتا ہو، باوجود اپنی سیاسی
اور قومی مصروفیتوں کے وہ اہل علم اور صاحبِ ذوق آخر عمر تک بنے رہے۔

شمس العلمار ڈاکٹر نذیر احمدؒ سے کون لڑکا یا لڑکی ہو جو ناواقف ہوگا، انکی تصانیف کے علاوہ
ان کے لکچروں کا مجموعہ بھی پڑھا تھا. اگرچہ دلی نژاد نہ تھے رہنے والے تو پورب کے تھے مگر دلی کچھ ایسی
بھا گئی کہ وہیں کے ہو رہے. انسے گفتگو کرکے یہ بات کھُلی کہ لکھتے تو ہیں دلی کی زبان مگر باتوں میں
وہ شہری لوچ اور کشش نہیں بلکہ مولوی پن زیادہ نمایاں تھا. علامہ فرماتے تھے کہ مولانا اعظم گڈھ میں ڈپٹی
انسپکٹر مدارس تھے میں جب لاہور سے مولانا فیض الحسن صاحب سے ادب پڑھکر واپس ہوا تو فرمانے لگے
"ابھی تم تو بڑے تگڑے نکلے میرے اُستاد سے بھی پڑھ آئے." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیض الحسن
صاحب کے شاگرد تھے. ادبیت کا نمونہ الندوہ کی منقبت میں دیکھ لیا جسمیں زور الینت نہیں ہو اسکی وجہ
یہ ہو کہ وہ کھرے مولوی تھے اور دست نظر سے جو پرداخت ذہنی ہوتی ہو اس سے محروم تھے، جو کچھ
پڑھا تھا وہ سب یاد تھا. بڑے قدآور آدمی تھے، داڑھی گھنی نہ تھی اور قدرتی فرنچ کٹ ہو کر رہ گئی تھی

رنگ سانولا تھا، جسم دُہرا تھا، ہڈیاں بڑی چکلی چوڑی۔ انگریزی سے خوب واقف تھے، بولنے میں بھی مکالے کی روح کو شرمندہ کرتے تھے۔ انکی جوش بھری گفتگو مولویوں کے متعلق جب انکو تیزی پر التہاب ہوا سننے کے قابل تھی. تقریر ہی میں کون دقیقہ اُٹھا رکھا تھا اور سچ کی گفتگو میں اس سے زیادہ بھر سے۔ ان سے کانفرنس بھر ملتا رہا۔ علامہ کے ندوہ آجانے سے وہ بہت خوش تھے۔ علامہ کی ایک خاص منزلت ان کے دل میں تھی اسوقت علامہ کے نہونے کا ان کو قلق تھا مگر وہ کچھ علیل تھے اور طبی مشورہ کی بنا پر جوبلی کی آب و ہوا کا لطف اُٹھا رہے تھے

اس کانفرنس میں سب سے پہلے لاہور کے جتھے میں میر نیرنگ قبلہ سر محمد اقبال شیخ محمد اکرام سے مُلاقات ہوئی ہاں سر عبدالقادر بھی تھے مگر میں ان کو پہلے سے جانتا تھا ان لوگوں کو لکھنؤ کے دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر بات بات پر یہ ضرور کہتے تھے کہ دیکھئے اُردو ہماری زبان نہیں ہو مگر ہم کو اُردو پر کتنی قدرت ہے، وہ وقت ان لوگوں کے جوانی سے بھرے ہوئے جوش کا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ادبی دُنیا کو ہلا ڈالیں گے اور ایک حد تک سچ بھی کر دکھایا، مخزن کی برابر کس رسالہ نے استقلال کے ساتھ اُردو کی خدمت کی ، مگر سر عبدالقادر جوانی میں بھی نہایت سمٹے ہوئے آدمی تھے اور ایسے جوش کے اظہار سے بری تھے۔ لکھنؤ کی سیر میں ان لوگوں کی ایک ملاقات منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ سے بھی ہوئی۔ اب اگرچہ لقوہ اور فالج کے دوروں کی وجہ سے انکی زبان وہ طرارے نہیں بھرتی تھی اور نہ قلم ہی میں وہ تیزی باقی رہ گئی تھی، بمشکل کچھ کہہ دیتے تھے مگر ذہن کی روانی میں کوئی کمی نہ تھی، ان لوگوں کی تھوڑی سی تعلی کا اظہار وہاں بھی ہو گیا، بھلا ان کا ذہنی بانکپن یہ کب برداشت کر سکتا تھا، آخر ایک صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "واللہ آپکی نظم ٹوپی پر بہت خوب تھی ابکی لنگوٹی پر طبع آزمائی فرمائیے گا۔" وہاں سے جب یہ لوگ باہر نکلے تو کہنے لگے۔ واللہ ظالم بڑے زور کی لگا گیا۔" سر محمد اقبال کی شاعری کا اسوقت عنفوان تھا، تخیل اچھی تھی مگر زبان میں خامیاں تھیں، وہ فارسی کے اُردو سے بہتر شاعر بلحاظ زبان کے ہوئے ہیں۔

انکی قومی اور جوشیلی نظموں کو تو جانے دیجئے اُن کا کیا کہنا، مگر بختہ رنگ ان کے کلام میں جرمن ادبیات کے مطالعہ کے بعد پیدا ہوا مجھ سے ایک مرتبہ ایک بزرگ نے اقبال کی شاعری کے متعلق سوال کیا میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ شاعر تو ضرور تھے مگر ان کی استعداد اور بلیغ علم کا شخص اب سو کم کیا شاعر ہوا خواجہ حافظؒ نہ سہی مگر مولانا جامیؒ تو تھے ہی۔

اس کانفرنس میں راجہ صاحب جہانگیر آباد اور محمود آباد نے بڑی بڑی رقمیں اور لکھنؤ کی پبلک نے بھی کثیر رقم چندہ میں دی اتنا بڑا چندہ کانفرنس کی زندگی میں کہیں اور اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ کانفرنس والے ہر طرح رطب اللسان لوٹے۔

لیجئے کانفرنس کا یہ روپ میلا ختم ہونیکو آیا شام کو حسام الملک نواب علی حسن خاں صاحب کی طرف سے قیصر باغ میں بارہ دری کے جنوبی لان پر پارٹی (بقول حیدرآبادیوں کے عصرانہ) تھی، لوگ رخصتی ملاقاتیں کر رہے تھے، کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر شمس العلما نذیر احمدؒ صاحب سے کھڑے ایک صاحبزادہ گورے گورے سیاہ ٹرکش کوٹ اور ایرانی ٹوپی پہنے چہرہ بڑا سا مگر قد بہ موزوں بظاہر برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن قطعف الذہور ہاتھ میں لئے نہایت طراری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں اپنے سن کی مناسبت کا دوسرا شخص پاکر رجحان طبعی ان سے ملنے کو ہوا، پاس قاری سرفراز شاہ ندوہ والے کھڑے تھے وہ بڑے جہانیاں جہاں گشت اور جہاں دیدہ تھے انسے پوچھا یہ کون صاحب ہیں، انھوں نے اُن کی پوری تاریخ بتا دی اب تو اور شوق ملاقات بڑھ گیا۔ ان کے مضامین رسائل میں دیکھے تھے چند ہی منٹ میں وہ کھنچ کر میری جانب آنکلے۔ قاری صاحب نے تعارف کرایا، انھوں نے کہا کہ میں علامہ سے ملکر مبئی سے آرہا ہوں، لیجئے دو دل ملگئے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جو ان سے کچھ بڑے معلوم ہوتے تھے تقطیع تو دونوں کی ملتی تھی مگر ان کا رنگ مدھم تھا دونوں کی ناکوں میں کثیر مشابہت تھی یہ دونوں بھائی تھے ان کے بھی مضامین رسالوں میں دیکھے تھے مگر وہ خاموش اور متین زیادہ تھے۔ کانفرنس کے خیال سے

بمبئی سے چلے تھے راہ میں نہ جانے کہاں اٹک گئے، سیلانی تو تھے ہی کانفرنس کی حالتِ نزع میں لکھنؤ پہنچے، خیر صورت دکھلی. تھوڑی دیر تک ہم لوگ ٹھہر کر ایک خیمہ میں باتیں کرتے رہے. اتنے میں ہمارے ایک اور عزیز آگئے، غرض وہ اٹھکر جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ کی کوٹھی پر آگئے! اب اطمینان سے ہم تینوں میں باتیں ہونے لگیں وہ پھر اپنا علمی رعب جمانے لگے بھلا میں کہاں پیچھے پڑا تھا رکھنے دینے والا تھا، اسمیں تو وہ کچھ ٹھہرے نہیں لیکن اہل فن قومیات اور نام معلومات اور سرسید اور انکے حواریں کے لٹریچر کے وہ حافظ ضرور تھے مگر بلا کے ذہین تھے، اشہب زبان اور اشہب قلم دونوں فرائے بھرتا تھا. بڑے بھائی کا نام ابو النصر غلام یٰسین آہ دہلوی تھا، اور چھوٹے کا ابو الکلام محی الدین آزاد تھا، ناظرین اس طوالت اسمی کو طوالت ریش پر قیاس نہ کرلیں نہیں وہ بہت فہمیدہ اور ہونہار تھے. ہمارے دوست مولانا ابو الکلام تو اسوقت ہندوستان کے سرتاج ہیں ان کی مزے مزے کی حکایتیں تو آگے چلکر بہت کچھ سننے گا مگر ابو النصر مرحوم کس کو یاد ہوں گے، ان کی یاد رکھنے کو ان کا ایک قطعہ لکھتا ہوں وہ سن لیجئے اور انکی روح پر فاتحہ پڑھئے. وہو ہذا ؎

عدو کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھنچوائیں　　نئے طریق سے اظہارِ رسم و راہ کریں
ہماری پاس بھی بھیجیں اسے شرارت سے　　کہ حالِ رشک سے رو رو کے ہم تباہ کریں
غضب ہوا سے زبانی پیام بھی آئے　　ہماری سر کی قسم ہو انھیں جو آہ کریں

ابو النصر مرحوم سے چند روزہ وہ پہلی اور آخری ملاقات رہی، اب انشاء اللہ آخرت میں پھر ہوگی مگر ان کا اثر دلپذیر ہو! اس زمانہ میں ہمارے دوست ابو الکلام ایک روٹھنے والے معشوق کی طرح ایک رسالہ لسان العصر بھی نکالتے تھے جس کو نو وم الضحیٰ کا مرض تھا.

کانفرنس بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی، ہم پھر اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف ہوگئے. علامہ فراہی تعطیل کلاں میں ہمارے علامہ کے پاس آجاتے اور ہم لوگوں کو کچھ نہ کچھ پڑھاتے. انھوں نے امین جکیس کی

مابعد الطبیعات عربی میں پڑھائی تھی، اگرچہ کتاب سمجھتا تھا مگر کچھ شوق سے نہ پڑھتا تھا کیونکہ مجھکو پوری مغربی تعلیم حاصل کرنیکا شوق تھا لہذا سمجھتا تھا کہ آگے چلکر دیکھا جائیگا میں ان سے قرآن پاک اور ادب کے نکات اخذ کرتا تھا کسی نکسی آیت کو لیکر مکالمہ چھیڑ دیتا تھا وہ خاموش آدمی تھے مگر طالبعلم کے لئے ایسے نہ تھے دل میں یہ تھا کہ انکی غیر مختتم تصانیف کے احوال اور تفسیر کا لب لباب ذہن نشین کر لوں علاوہ تھوڑی بہت تفصیلی معلومات کے ان کی تفسیر کا پورا مرقع ذہن میں آگیا تھا چنانچہ جب بعد کو بعض ٹکڑے انکی تفسیر کے شائع ہوئے تو معلوم ہوا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا، انکی کتابوں کا سمجھنا خاصکر جب وہ ٹکڑوں میں شائع ہوئی ہیں کچھ آسان نہیں ہے۔

شاگردانہ تعلّی پر ناظرین محمول نہ کریں مگر میں صدق دل سے کہتا ہوں کہ ادب قرآن اور قرآن فہمی میں وہ اپنی آپ ہی مثال تھے، مگر اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اگر انکی تعلیم اور مطالعہ مغربی اسمیں شامل نہ ہوتا تو یہ ذہن کی رسائی ان کو نصیب ہوتی انکی کمی علامہ کی تصانیف میں محسوس ہوتی ہے اگرچہ انکی قوت آخذہ نے مغربی پرواز مغربی صحبتوں میں رہکر کچھ نہ کچھ اخذ کرلیا تھا اور وہ کمی پوری کرنیکی کوشش کرتے تھے لیکن اگر وہ جدید فلسفہ سے واقف ہوتے اور فرید وجدی کے خوشہ چین نہ بنتے تو انکی الکلام پر ایک طالبعلم اتنا سخت حملہ نہ کرسکتا، کسی ایک مشرب سے تو واقف ہو جاتے اور اسکے ہو رہتے۔ یہی چیز ہے جس نے شرر صاحب کو اپنے ہم چشموں میں نمایاں کردیا وہ انگریزی جانتے تھے اور فرانسیسی سمجھ لیتے تھے، گو ان کی خدمات ادب لطیف ہی تک محدود رہے بشرر صاحب کا ذکر خیر کئی جگہ آچکا ہے میرے دل کو جو لگاؤ ان کے ساتھ ہے وہ کچھ اور وسعت بیان پر مجبور کرتا ہے لہذا اسلئے، مولانا شرر بڑے زندہ دل یار باش اور قوی الحافظ تھے۔ تھے تو کرسی کے قریب ہونے کے شاید رہنے والے مگر اس انگلے نام کی کچھ کشش ایسی ہے کہ گلزار نسیم کے مکالمے کے زمانہ میں یہ وطن ان کے اوپر ہمادیا گیا اور بات تھی لگتی ہوئی جیتیٹی جو اُن پر چھا گئی، ان کے والد کا اسم بسلسلۂ طبابت واجد علی شاہ کے درباریوں میں تھا اور مولانا کی پرداخت مٹیا برج میں ہوئی۔ بچپن کی تعلیم اور اسکی تفصیل تو ان کے سوانح نگار جانیں مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ عربی کے درسیات انھوں نے مولانا عبدالحی صاحبؒ فرنگی محلی سے ختم کی تھیں اور ادب

معلوم ہوتا ہے دل لگا کر منشی میر عباس مرحوم سے پڑھی تھی۔ عربیت انکی بہت اچھی تھی۔ میں نے جب ان کو دیکھا ہے تو وہ انگریزی خوب جانتے تھے اور فرنچ بھی سمجھ لیتے تھے۔ ان کے قلم میں زور اور روانی دونوں باتیں تھیں نظم سے نثر انکی بہت بلند تھی علامہ کے جدید میدان تصنیف میں آنے سے پہلے وہ مصنف مؤلف اور مضمون نگار بن چکے تھے۔ چنانچہ جب علامہ نے المامون لکھی تو پہلے اسکا مسودہ انھیں کو بھیجا تھا کہ اگر شائع کرنیکے قابل ہو تو شائع کیا جائے۔ شرر صاحب نے اسکو بیحد پسند کیا اور بہت زور اشاعت پر دیا۔ میرے بھائی منشی واحد علی صاحب مرحوم کے پاس وہ اکثر آتے تھے اور انسے وہیں کی ملاقات تھی مٹیا برج کے بعد ان کے دو وطن ہو کر رہگئے تھے ایک لکھنؤ دوسرا دکن۔ لکھنؤ آجاتے تو دکن جانے کا نام نہ لیتے۔ مثل ہے دکن کی کمائی کا ندوے کے نالے میں بہائی اور جب دکن پہونچ جاتے تو وہیں کے ہو رہتے۔ اگر مصر کے جرجی زیدان کو کہو کہ وہ اغانی سی دائرۃ الادب کا حافظ تھا تو شرر صاحب اس کا مثنی فی ہندوستان میں تھے عربوں کی تاریخ اور جغرافیہ پر انکی نظر بہت وسیع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جرجی زیدان اور شرر کے ناولوں میں توارد ہو گیا ہے۔ ان کا ایک کمال دیکھا جو کسی اور میں نہ دیکھا یعنی جب وہ کوئی مضمون لکھتے تو ایک ایک ٹکڑے کاغذ کے ان کے سامنے رکھے رہتے۔ ایک ٹکڑہ پر لکھکر کاتب کو دیدیتے اور مجھ سے آپسے باتیں کرتے رہتے جب کاتب لفظ "اور" کہتا تو معافی مانگ کر پھر تیزی سے وہ دوسرا ٹکڑہ بھر دیتے اور کام میں مصروف ہو جاتے کیا انضباط ذہنی تھا۔

نوٹ:۔ ماہ ستمبر میں گنجائش نہونیکی وجہ سے حالات ندوہ نہیں دیے جاسکے، انشاءاللہ آیندہ مہینہ میں ماہ ستمبر کے حالات بھی شامل کر دیے جائیں گے۔

"منیجر"

تاریخ تدوین اصول فقہ

از مولوی علی اسعد گیلانی متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء

مصر کے مشہور اسلامی مؤرخ حضری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انکی تاریخ الامم الاسلامیہ (تاریخ الامت) اور تاریخ التشریع الاسلامی (تاریخ فقہ اسلامی) کے ترجمے عرصہ ہوا ہو چکے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ فقہ اسلامی کی تاریخ کے ساتھ فن اصول فقہ پر بھی انکی ایک بہت اچھی تصنیف مصر کو شائع ہوئی ہو۔ کتاب کے مقدمہ میں اصول فقہ کی مختصر تاریخ اور اس فن کی اہم کتابوں پر تبصرہ بھی کیا گیا ہو۔ ذیل کی سطور میں اسی مقدمہ کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہو۔ اُمید کہ اہل علم خصوصاً عربی مدارس کے حلقوں میں اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

(۱)

شریعت اسلامیہ جو ہم تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پہونچی اسکی بنیاد کتاب اللہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اسکی تشریح کی کتاب و سنت میں سے ہر ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی ہیں پس گویا کہ کتاب و سنت دونوں دین کے اُصول ہوئے جن سے احکام شرعیہ ثابت ہوتے ہیں اور احکام کے استنباط میں مجتہدین کو انہی دونوں اصلوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہو اور چونکہ شریعت کے احکام کسی نہ کسی علت پر مبنی ہوتے ہیں اسلئے کتاب و سنت سے ایک تیسری اصل قیاس ثابت ہوئی۔

پس جہاں کہیں شارع نے کسی حکم کی علت بیان کر دی ہو یا اجتہاد سے وہ علت معلوم ہو جائے وہاں وہی حکم لگا دیا جائے گا کیونکہ علت ہی حکم کی بنا ہے۔

ائمہ کا متفقہ فیصلہ ہو کہ جب امت کے مجتہدین کی رائے کسی ایسے حکم پر متفق ہو جائے جو قرآن و حدیث یا قیاس سے ماخوذ ہو تو ان سے خطا نہیں ہو سکتی کیونکہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہو "لن تجتمع اُمتی

علی الضلالۃ" اسطرح ایک چوتھی اصل بھی ثابت ہوئی جس کو اجماع کہتے ہیں۔ حاصل یہ کہ فقہ کے چار اصول ہوئے۔ کتابؔ، سنتؔ، قیاسؔ، اجماعؔ، اگرچہ ان سب اصول کا مرجع دو ہی اصلیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسولؐ۔

(۲)

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا سنت رسولؐ نے اسکی تشریح عربی زبان میں کی صحابہ کرامؓ جو فتوی دیا کرتے تھے عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان کو شریعت کے رموز سے آگاہ کرادیا تھا انھیں شریعت کی روح سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی سلامت فہم اور ذکاوت طبع میں ممتاز تھے جسطرح انھیں اعراب و اشتقاق کے قواعد جاننے کی ضرورت نہ تھی، اسیطرح احکام کے استنباط میں بھی کسی دوسری چیز سے مدد لینے کی ضرورت نہ تھی جب کوئی مسئلہ پیش آجاتا جس کے حکم کی ان کو تلاش ہوتی تو وہ کتاب اللہ کی طرف دوڑتے اگر اسمیں کوئی واضح اور صریح حکم نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے اگر اس سے بھی انکی تشفی نہ ہوتی تو اجتہاد سے کام لیتے اور اشباہ کو اشباہ پر قیاس کرتے لیکن اس اجتہاد و قیاس میں وہ ان مصالح کا ضرور خیال رکھتے جنکی شریعت نے رعایت کی تھی، جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قضا کا منصب دیکر یمن بھیجا تو انسے پوچھا" بما تقضی؟ تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ انھوں نے جوابدیا۔ کتاب اللہ سے۔ آپنے فرمایا۔ اگر اسمیں نہ پاؤ۔ جواب دیا۔ سنت رسولؐ سے۔ آپنے پھر فرمایا۔ اگر اسمیں بھی کوئی حکم نہ پاؤ۔ کہا میں اجتہاد کرونگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جوابات سے مطمئن ہوئے، ان کی ترتیب کی تصدیق کی اور اسی ترتیب کو قائم رکھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ابو موسیٰ اشعریؓ کو قاضی بنایا تو انھیں حسب ذیل تحریری ہدایتیں لکھیں۔" القضاء فریضۃ محکمۃ وسنۃ متبعۃ الفھم الفھم فیما تلجلج فی صدرک مما لیس فی کتاب ولا سنۃ

فاعرف الاشباه والامثال وقس الامور عند ذالک واعمد الی اقربها الی اللہ واشبہا بالحق۔

قضا ایک محکم فریضہ اور واجب الاتباع سنت ہے جن مسائل کا حکم کتاب وسنت میں نہ پاؤ انہیں اجتہاد سے کام لو اور جو صورت اقرب الی اللہ اور اشبہ بالحق ہو اسے اختیار کرو۔

صحابہؓ کے بعد تابعین نے بھی انھیں اصول اور اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا۔

(۳)

یہ مبارک و مسعود زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا، اسلامی حدود میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا، عجمیوں سے اختلاط بڑھ رہا تھا، کثرت سے لوگ مسلمان ہو رہے تھے، ان نومسلموں کے لئے عربی زبان بھی دوسرے فنون کی طرح ایک فن تھی جو بغیر سیکھے نہ آسکتی تھی۔ اہل لغت کو زبان کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مبادا عجمی زبان غالب آجائے یا اسکی نسل بگاڑ دے انھوں نے قوانین وضع کئے اور کتابیں تصنیف کیں۔ یہ تو ان کے بس کی بات نہ تھی کہ بول چال میں بھی لوگوں سے انہی قوانین کی پابندی کرائیں، البتہ کتابت اور درس و تدریس کی زبان کو انھوں نے محفوظ کر دیا۔

سب سے بڑا محرک جس نے انھیں اسطرف متوجہ کیا کتاب وسنت کی حفاظت کا خیال تھا۔

(۴)

مجتہدین نے ایک دوسرا کام اپنے ذمہ لیا جس نے اہل لغت کے کام کو مکمل کر دیا انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ استنباط کے لئے کچھ اصول مقرر کر لئے جائیں اسمیں انھوں نے اہل لغت کے وضع کردہ اصول و قوانین سے مدد لی جو عربی زبان کے نکات و دقائق پر اچھی طرح نظر رکھتے تھے۔

(۵)

سب سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۲۰۴ھ نے اصطلاح فقہ کی بنا پر اصول فقہ میں ایک رسالہ لکھا، جسے انکی کتاب الام کا مقدمہ سمجھنا چاہئے اس مختصر سے رسالہ میں امام موصوف

نے بیان کی تعریف کی اسکے اقسام بتائے۔ پھر عام خاص ناسخ منسوخ، خبر واحد اجماع، قیاس، استحسان، اختلاف علماء وغیرہ بہت سے دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی۔

یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو اس فن میں لکھی گئی تھا ہے کہ سب سے پہلے جو کتاب کسی فن میں لکھی جاتی ہو وہ غیر مکمل اور ناکافی ہوتی ہے نحو کا ابتدائی تحریری سرمایہ وہ چند مختصر نکلے تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوالاسود دؤلی کو لکھوا دیے تھے پھر اہل فن نے اسمیں اضافے کئے اور بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں اسی طرح یہ رسالہ بھی اصول فقہ میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا جس نے فقہائی توجہ اسطرف مبذول کرائی۔

(۶)

اس فن کا مقصد یہ تھا کہ دلائل سے احکام کا استنباط کیا جائے اسلئے یہاں پر کئی چیزیں ہوگئیں۔ (۱) حکم (۲) دلیل (۳) استنباط (۴) مستنبط

اسی لئے علماء اصول نے اپنے مباحث کو چار ابواب میں محدود کر دیا جو

(۱) احکام یعنی وجوب، نہی، استحباب، کراہیۃ، اباحۃ، حسن و قبح، ادا و قضا صحت و فساد وغیرہ وغیرہ (۲) دلائل یعنی کتاب سنت، اجماع، قیاس۔ (۳) طرق استنباط۔ (۴) مستنبط یعنی مجتہد۔

(۷)

لیکن یہ سب علماء ان اصطلاحات پر متفق نہ ہو سکے جن سے معانی نفسیہ کی تعبیر کیجاتی ہے۔ انمیں سے ہر ایک کا راستہ الگ تھا ہر ایک کی سمت مختلف تھی، ہر فریق نے تصنیف و تالیف میں اپنے طریق خاص کی پیروی کی۔ سب سے زیادہ رائج دو طریقے ہوئے۔

(۱) متکلمین کا طریقہ (۲) احناف کا طریقہ۔

متکلمین کے طریقہ میں علم کلام کو بہت زیادہ دخل ہو وہ عقل اور اصول پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ فروعی مذاہب کی موافقت یا مخالفت ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی ان کا طریقہ یہ تھا کہ جن چیزوں کی تائید عقل اور ان کے وضع کردہ اُصولوں سے ہو جاتی ان کا اثبات کرتے اور جو چیزیں ان کے خلاف ہوتیں ان کا انکار کرتے۔ ان کے بھی مختلف گروہ تھے معتزلہ، مالکیہ، شافعیہ، احناف کے طریقہ میں فروع مذہبیہ کی تطبیق پر بجد زور دیا جاتا ہو یہاں تک کہ وہ اپنے اصولوں کو ان فروع سے مطابق کرنیکی کوشش کرتے ہیں جو انکے ائمہ سے منقول ہیں جب کبھی کوئی اصول انکی فقہی فرع سے مخالف ہوجاتا ہو تو وہ اس اصول کو فرع کے مطابق بنانیکی کوشش کرتے ہیں لیکن فرع کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے وہی اصول مدون کئے جنکی تفریع مسائل میں ان کے ائمہ نے اتباع کی تھی، یہی وجہ ہو کہ بعض اوقات احناف کے اصول بہت غریب ہوجاتے ہیں اور ان کے اصول بہت زیادہ فروع سے مملو ہوتے ہیں، کیونکہ یہی ان کی اصل ہوتے ہیں۔

(۸)

متکلمین کے طریقہ پر ائمہ متقدمین نے بہت سی کتابیں لکھیں جن بڑی بڑی کتابوں کا ہمیں علم ہو وہ تین ہیں:-

(۱) "المعتمد" یہ ابوالحسین محمد ابن علی بصری معتزلی شافعی المتوفی ۴۶۳ھ کی تصنیف ہے

(۲) "البرہان" یہ ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ نیشاپوری المتوفی ۴۷۸ھ کی تصنیف ہے جو امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں۔ (۳) "المستصفی" یہ ابوحامد محمد بن محمد غزالیؒ شافعی المتوفی ۵۰۵ھ کی تصنیف ہو۔ ان تینوں کتابوں میں سے میں نے بالاستیعاب صرف المستصفی کا مطالعہ کیا ہے۔ البرہان کے بھی بعض اقتباسات دیکھے ہیں جنھیں اسنوی نے منہاج کی شرح میں نقل کیا ہو اسلوب کے اعتبار سے مستصفی کی عبارت بہت ترقی یافتہ ہے ان بزرگوں کے زمانے میں تلخیص و اختصار کا

زمانہ نہیں شروع ہوا تھا، ان کا واحد مقصد یہ ہوتا تھا کہ معنی سامع کے ذہن نشین کرادیں، عبارت
طویل ہو یا مختصر، اسکے بعد دو جلیل القدر عالموں نے ان کتابون کا خلاصہ لکھا، ایک خلاصہ امام
فخرالدین رازیؒ المتوفی سنہ ۶۰۶ھ نے "محصول" کے نام سے لکھا، دوسرا خلاصہ علامہ سیف الدین
آمدی المتوفی سنہ ۶۳۱ھ نے احکام کے نام سے لکھا، دونوں کتابوں کی عبارت صاف اور واضح ہے
جسکے لئے کسی شرح کی ضرورت نہیں۔

اسکے بعد ان کتابوں سے کے اختصار کئے گئے، امام رازی کی کتاب محصول کا اختصار
دو بڑے عالموں نے کیا (۱) تاج الدین محمد ابن حسن ارموی المتوفی سنہ ۶۵۶ھ نے "حاصل" کے
نام سے اور (۲) محمد ابن ابی بکر ارموی المتوفی سنہ ۶۸۲ھ نے "تحصیل" کے نام سے مصنف نے اس
کتاب کی ابتدا میں بیان کیا ہے کہ "محصول" کو باوجود اسکی گوناگون خوبیوں کے لوگ بہت بڑی
کتاب سمجھتے ہیں بعض لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کا اختصار اپنی طرف سے کچھ اضافہ
کے ساتھ لکھوں قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی المتوفی سنہ ۶۸۵ھ کی کتاب منہاج الوصول الی
علم الاصول بھی الحاصل سے ماخوذ ہے اس کتاب میں اختصار ضرورت سے زیادہ برتا گیا ہے اسکی
عبارت پیچیدہ اور مطالب کو ادا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے شاید یہ کتاب اسلئے لکھی ہی نہیں گئی کہ
لوگ اسے سمجھ سکیں ان حضرات کی کتابوں سے شرح کے بغیر طالبعلم فائدہ نہیں اٹھا سکتا منہاج کی
سب سے اچھی شرح عبدالرحیم ابن حسن اسنوی شافعی المتوفی سنہ ۷۷۲ھ نے کی ہے اگرچہ یہ بھی نہایت
پیچیدہ اور مغلق ہے۔

باایں ہمہ اسنوی نے دعویٰ کیا ہے کہ (ان اکثر المشتغلین باصول الفقہ فی ہذا الزمان قد
اقتصروا من کتبہ علی المنہاج لکونہ صغیر الحجم کثیر العلم مستعذب اللفظ)
میں نہیں سمجھ سکتا کہ الفاظ کی گنجلکی کے باوجود یہ حلاوت کیسے پیدا ہوگئی العجب ثم العجب

ابھی تک محصول کے مختصرات کا بیان کیا گیا احکام کا اختصار ابو عمر و عثمان بن عمرو ابن حاجب المتوفی ۶۴۶ھ نے منتہی السوال والامل فی علمی الاصول والجدل کے نام سے کیا پھر اسکا بھی اختصار مختصر المنتہی کے نام سے کیا۔

اس کتاب کی عبارت منہاج سے بہت مشابہ ہے میں نے اسکی جن شروح کا مطالعہ کیا ہے انمیں سب سے بہتر شرح عضد الدین عبد الرحمن بن احمد المتوفی ۷۵۶ھ کی ہے۔ یہ شرح بہت اچھی ہے لیکن اسنوی نے منہاج کی جو شرح لکھی ہے اس سے کم درجہ کی ہے یہ سب مختصرات متکلمین کے طریقہ پر لکھی گئی ہیں انمیں مؤلفین نے صرف نقل پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے اور بعض مقامات میں انکی رائے اصل کتاب سے مختلف ہو گئی ہے۔

(۹)

احناف کے طرز پر بھی متقدمین و متاخرین نے کافی کتابیں لکھیں۔ متقدمین کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

(۱) ابو بکر احمد بن علی المتوفی ۳۷۰ھ جو جصاص کے نام سے مشہور ہیں۔

(۲) ابو زید عبید اللہ بن عمر قاضی دبوسی المتوفی ۴۳۰ھ

(۳) شمس الائمہ محمد ابن احمد سرخسی المتوفی ۴۸۳ھ

میں نے اس طرز کی جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا انمیں سب سے بہتر کتاب فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی المتوفی ۴۸۲ھ کی ہے۔ علاء الدین بن عبد العزیز بن احمد بخاری المتوفی ۷۳۰ھ نے اسکی بہت اچھی شرح کی ہے۔ متاخرین میں سے عبد اللہ بن احمد نسفی المتوفی ۷۱۰ھ نے ایک کتاب المنار کے نام سے لکھی جو مختصر ہے۔

(۱۰)

متاخرین احناف کی ایک جماعت نے کوشش کی کہ ان دونوں طریقوں کو جمع کر دیا

جائے اور ان میں مطابقت و ہم آہنگی پیدا کیجائے اگرچہ بعض دوسرے علمار نے بھی اس کوشش میں حصہ لیا، لیکن چونکہ یہ کوشش احناف کی طرف سے شروع ہوئی اور اسمیں نمایاں حصہ بھی انھوں نے ہی لیا اسلئے اس کام کا سہرا انھیں کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل علما اور انکی تصنیفات قابل ذکر ہیں۔

(۱) مظفرالدین احمد بن علی ساعاتی بغدادی حنفی المتوفی ۶۹۴ھ۔ آپنے ایک کتاب بدائع النظام الجامع بین کتاب البزدوی والاحکام لکھی۔

(۲) صدرالشریعۃ عبیداللہ بن مسعود بخاری حنفی المتوفی ۷۴۷ھ آپنے تنقیح الاصول کے نام سے ایک کتاب لکھی پھر خود ہی اسکی شرح کی جسکا نام توضیح رکھا، آپنے اپنی کتاب میں بزدوی محصول اور مختصر ابن حاجب کا خلاصہ کیا ہے۔ نیز توضیح پر سعدالدین مسعود ابن عمر تفتازانی المتوفی ۷۹۱ھ نے حاشیہ بھی لکھا۔

(۳) کمال الدین محمد بن عبدالواحد متوفی ۸۶۱ھ جو ابن ہمام حنفی کے نام سے مشہور ہیں آپنے تحریر کے نام سے ایک کتاب لکھی آپکے شاگرد محمد بن محمد ابن امیر حلبی متوفی ۸۷۹ھ نے اس کی شرح لکھی۔

(۴) تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی الشافعی متوفی ۷۷۱ھ۔ آپنے جمع الجوامع کے نام سے ایک کتاب لکھی جسکی ابتدا میں آپنے فرمایا ہو کہ میں نے اس کتاب کو تقریباً ایک سو مصنفین کی کتابوں سے جمع کیا ہے مذکورۂ بالا تمام کتابوں میں حد سے زیادہ اختصار ہو جو بعض اوقات اغلاق اور پیچیدگی کا موجب بنجاتا ہو اس صفت میں ابن ہمام کی التحریر سب سے بڑھی ہوئی ہو اگر کوئی شخص اسکو شرح سے الگ کرکے پڑھنا چاہے تو اسے محسوس ہوگا کہ وہ کوئی معمہ کی کتاب پڑھ رہا ہو اسکی عبارت پڑھکر بڑی الجھن اور اضطراب پیدا ہوتا ہو لیکن جمع الجوامع تو وہ تمامی اوائل کا مجموعہ ہے

جس سے نہ قاری کو فائدہ پہونچ سکتا ہو نہ سامع کو علاوہ ازیں یہ کتاب استدلال سے بھی یکسر خالی ہے۔

(۱۱)

اس جماعت کے بعد بحث و اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا، تفکیر کی قوت ختم ہو گئی بعد کے علماء نے صرف شروح و حواشی لکھکر ان کتابوں کو آسان اور عام فہم بنانیکی کوشش کی اپنی طرف کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور اب یہ فن آثار قدیمہ میں سے شمار ہونے لگا۔ متاخرین کی سب سے ادق کتاب مسلم الثبوت ہے جس کے مؤلف ملا محب اللہ بن عبد الشکور المتوفی ۱۱۱۹ھ ہیں۔ افسوس ہے کہ اصول فقہ پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں لیکن ابتک ان اصول پر کسی نے کوئی کتاب نہ لکھی جنکا شریعت میں شارع نے اعتبار کیا ہے۔ یہ اصول دلیل و قیاس کی بنیاد ہیں اسلئے کہ اس دلیل کی روح وہ علتیں ہیں جن کا شرع میں اعتبار کیا گیا ہے انمیں سے بعض بعبارۃ النص ثابت ہیں اور بعض بدلالۃ النص۔

حالانکہ معمولی معمولی مسائل میں اختلاف کرکے ان پر بحث و تکرار میں اپنا وقت ضائع کرنیکے بجائے اسطرف توجہ کرنیکی زیادہ ضرورت تھی تاکہ مجتہدین کے لئے یہ اصول و قواعد مشعل راہ بن سکیں غالباً علماء اصول نے یہ کام فقہا کے لئے چھوڑ دیا حالانکہ اس کا تعلق اصول فقہ سے زیادہ تھا۔

اس موضوع پر سب سے اچھی کتاب جو میں نے دیکھی ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ شاطبی المتوفی ۷۹۰ھ کی الموافقات ہے یہ کتاب بہت مفید ہے اسکی عبارت بہت سہل ہے یہ پڑھنے والوں کو تمام دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۲ نمبر ۱۰

رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۱ء

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

شذرات

مقام مسرت ہو کہ مسلمانوں میں دین سے براہ راست واقفیت کا شوق پیدا ہو رہا ہو، اس سلسلہ میں جا بجا قرآن مجید کے ترجمے کے حلقے قائم ہو رہے ہیں۔ پنجاب میں عرصہ سے اس قسم کا کام ہو رہا تھا اب ان اطراف میں بھی یہ چرچا ہونے لگا ہو، عموماً مسجدوں میں ہفتہ وار یا روزانہ ضروری تشریح کے ساتھ ترجمہ سنایا جاتا ہے جس کی حیثیت زیادہ تر وعظ و پند کی ہوتی ہو کہیں کہیں درس کی نوعیت بھی ہو گئی ہے لیکن اصل عربی زبان سے واقفیت اور اصول و قواعد کی مدد سے ترجمہ کا کام شاید کہیں بھی نہیں ہوتا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہو کہ عربی زبان کو بہت مشکل سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہو کہ برسوں کی محنت کے بعد مشکل سے اتنی استعداد پیدا ہو سکتی ہو کہ قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا جا سکے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے ایک اوسط درجہ کا اردو داں زیادہ سے زیادہ دس دن میں اتنی صلاحیت پیدا کر سکتا ہو کہ باقاعدہ قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر سکے اسکے ڈیڑھ مہینہ میں سورہ بقرہ ختم ہو جاتی ہے جس کے بعد آسانی سے پانچ چھ مہینے میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ ختم ہو سکتا ہو ذہین اور تعلیم یافتہ اصحاب اس سے بھی کم مدت میں اس منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔ ہمارے اس بیان کو مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے۔ دس برس کے تجربہ کے بعد ہم یہ رائے ظاہر کر رہے ہیں اگر کوئی صاحب اس طرز پر کام کرنا چاہیں تو خط و کتابت سے تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کی تعلیمی پس ماندگی محتاج بیان نہیں، اعلیٰ تعلیم یافتوں کا کیا ذکر ہو محض حرف شناسوں کا شمار کیا جائے تو ان کا تناسب بھی چند فی صدی سے آگے نہیں بڑھتا، اس صورت حال کی تبدیلی کے لئے عرصہ سے کوشش ہو رہی ہو اور چھوٹے بڑے ہزاروں ادارے اس کام میں مصروف ہیں

لیکن یہ ساری جد وجہد بچوں اور نابالغوں کی تعلیم کے لئے ہو رہی ہے حالانکہ بڑوں کی جانب اس سے زیادہ توجہ کی ضرورت تھی کیونکہ یہی ہماری تمام اصلاحوں کی بنیاد ہیں۔ بچے کل جن نقشوں میں رنگ بھریں گے ان کے خاکے آج انھیں بڑوں کے ہاتھوں بنیں گے اور مستقبل میں قومی اصلاح و ترقی کی جو عالیشان عمارتیں تعمیر ہوں گی ان کی داغ بیل حال ہی میں پڑیگی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب کچھ عرصہ سے اس جانب توجہ ہونے لگی ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے ماتحت کئی برس سے تعلیم بالغان کا ایک شعبہ ادارۂ تعلیم و ترقی کے نام سے قائم ہے جو اپنے پرجوش ناظم مولوی شفیق الرحمٰن صاحب بی۔ اے کی سربراہی میں خاصہ کام کر رہا ہے۔ اس ادارے نے اپنے کام کو کم خواندہ و ناخواندہ دو حلقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ کم خواندوں کے لئے آسان زبان اور واضح خط میں متعدد مفید و دلچسپ کتابیں اور نقشے شائع ہو چکے ہیں۔ ناخواندوں کے لئے شبینہ مدارس کا انتظام ہے، اس سلسلہ میں ادارہ کی جانب سے وقتاً فوقتاً مختلف مفید تجویزیں اور کارکنوں کے تجربے شائع ہوتے رہتے ہیں جن صاحبان کو ان مسائل سے دلچسپی ہو وہ ناظم صاحب ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ دہلی سے خط و کتابت کریں۔

دارالعلوم میں چھوٹے بچوں کے لئے دارالاقامہ کی ضرورت اور اسکی تعمیر کے خیال کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہے نقشہ بن چکا ہے اب عنقریب تعمیر کا کام شروع ہونیوالا ہے مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ کی تصنیف "رحمت عالم" کی فروخت سے یہ مختصر سا دارالاقامہ تعمیر ہو رہا ہے۔ ابھی ضرورت کے مطابق رقم پوری نہیں ہے، لیکن اللہ کا نام لیکر کام کا آغاز ہو رہا ہے امید کہ اہل خیر اس کار خیر میں سبقت کریں گے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا شاہ حلیم عطا صاحب استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء

میرے خاندان میں خدا کے فضل و کرم سے علم اور دین کئی صدی سے چلا آرہا ہے، مشیخت و سجادگی کے باوجود مشائخ کو علوم سے برابر اشتغال رہا اور بعض حضرات صاحب تصانیف بھی ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ابو الفضل ظہیر الدین عرف شاہ پناہ عطا صاحب کے نام جو خطوط بھیجے ہیں اور حضرت شاہ رفیع الدین علیہ الرحمۃ نے اپنے بعض علمی تحفوں پر جو الفاظ لکھے ہیں ان سے اس خانقاہ کے بزرگوں کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔

باایں ہمہ ماحول خانقاہی اثرات اور صوفیانہ خصوصیات سے خالی نہ تھا، خاندان کا عام ذوق اور رجحان طبع تصوف اور اسکے متعلقات کی طرف تھا، اس ماحول میں میرے عم محترم شاہ حسام عطا صاحب مرحوم خاص خصوصیات کے مالک تھے شب بیداری اور مداومت ذکر کے علاوہ وہ ایک سلیم الفہم حق شناس اور وسیع القلب بزرگ تھے معاصرین کے فضل کا کشادہ دلی سے اعتراف کرتے تھے سلسلہ اور خاندان کی عصبیت سے پاک تھے اور بعض متبع سنت اور متورع معاصر بزرگوں کا بڑی عظمت اور عقیدت سے ذکر کرتے تھے اور اکثر سلف صالحین اور صوفیہ کے تذکرے سنایا کرتے تھے، جس سے صلحاء کی محبت کی تخم ریزی ہوئی تھی۔

میری عمر دس گیارہ برس کی تھی کہ چچا مرحوم ہر جمعہ کو تفسیر فتح العزیز اور بخاری کی احادیث کا ترجمہ سنایا کرتے، ان سے سنی ہوئی حدیثیں آجتک دل پر نقش ہیں۔

میری عمر کا بارھواں یا تیرھواں سال تھا کہ عم محترم نے سورۂ جن کی آیت "وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا" کی تفسیر فتح العزیز سے پڑھکر سنائی، اس سے سب سے پہلے شرک کی حقیقت سمجھ میں آئی اور توحید کا پہلا نقش دل پر قائم ہوا۔

مولوی معین الدین صاحب ٹونکی نے والد رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ مہدی عطا صاحب سجادہ نشین خانقاہ کریمیہ سلون کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی "الدین الخالص" ہدیۃً بھیجی تھی طالب علمی کے زمانہ میں اسکا مطالعہ کیا اور اس سے اثر لیا۔

حدیث میں نے اپنے برادر اکبر مولانا شاہ نعیم عطا صاحب سے شروع کی جو حدیث میں استاد الہند حضرت شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی کے شاگرد ہیں، بھائی صاحب کو حدیث کا ذوق تھا سکے اثر سے مجھے بھی حدیث کا شوق پیدا ہوا، اسی زمانہ میں صحیح مسلم کو اسکی شرح کی مدد سے اور بخاری کو فتح الباری کی مدد سے دیکھتا، حدیث کے علاوہ ذاتی شوق سے سیوطی کی مزہر ثعالبی کی فقہ اللغۃ، نووی کی اذکار التبیان فی آداب حملۃ القرآن اور ریاض الصالحین کا مطالعہ کرتا تھا علامہ نووی کے کلام میں بالعموم بڑی حلاوت اور نورانیت معلوم ہوتی تھی۔

۱۳۲۹ھ میں میری خوش قسمتی سے خانقاہ میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب دہلوی کا وارد ہوا، آپ حدیث میں میاں سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے والد ماجد مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلیؒ کے اور ادب میں مولوی حامد حسین صاحب اور ان کے بھائی مولوی احمد حسین صاحب کے شاگرد تھے۔ لیکن آپ پر میاں صاحب کے تلمذ کے اثرات زیادہ غالب تھے، سلفیت کا رنگ بہت گہرا اور حدیث اور سلف کی کتابوں کا بڑا شغف تھا۔ نہایت عابد اور متورع بزرگ تھے۔ آپکی تحریک اور تشویق سے امام ابن جوزی کی تلبیس ابلیس اور صفۃ الصفوہ امام ابن تیمیہ کی الواسطہ بین الخلق والحق، امام ابن قیم کی زاد المعاد امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات اور محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل بار بار پڑھی اور دل میں اُتار لی اعمال صوفیہ کی بدعات کی ظلمت سے نکلنے میں کتاب الواسطہ اور تلبیس ابلیس سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ اسی زمانہ میں صحیحین اور مؤطا بالخصوص صحیح مسلم سے زیادہ اشتغال ہوا چونکہ نووی

کی شرح موجود تھی جو طلبہ کے لئے بڑی مفید سہل اور ایک حد تک دلچسپ بھی ہے اور چونکہ مجھے نودی سے عقیدت تھی اسلئے صحیح مسلم کو زیادہ ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ دیکھا۔

مولانا نابینا ہو جانے کے بعد مجھ سے تلبیس ابلیس، شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل (ابن قیم) اور غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی (الوسی زادہ) پڑھوا کر سنا کرتے تھے اسطرح ان سلفی عقائد و خیالات کے نقش گہرے اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔

۱۳۳۲ھ میں مولانا محمد سورتی صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے، انکی وجہ سے بڑی نادر علمی مجلسیں اور پرلطف صحبتیں رہتی تھیں جنہیں کثرت سے سلف کی کتابوں کا تذکرہ رہتا تھا، میں اور محب گرامی مولانا سید طلحہ اور صدیق محترم مولانا خلیل بن محمد عرب اور دوسرے ہم مذاق اور ہم خیال احباب ان مجالس میں شریک ہوتے اور علمی مذاکرہ اور گفتگو کرتے، انھیں مجلسوں میں علامہ ابن حزمؒ سے میرا خاص تعارف ہوا، مولانا سورتی انکی جامعیت اور تبحر کے بڑے معترف اور مداح تھے، انکی گفتگو سے مجھے ابن حزم کی تصنیفات کی طرف توجہ ہوئی، انکی کتاب الفصل فی الملل والنحل تو پہلے دیکھ چکا تھا اب انکی اور تصنیفات بھی دیکھیں۔

ابن حزم کی تحقیقات میں مسئلہ عصمت انبیاء اور قرآن مجید کے طرق نقل کی بحث کو میں نے بہت پسند کیا اور ان مسائل پر امام ابن تیمیہ اور بعض دوسرے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اسپر علامہ ابن حزم کی تحقیق اور بحث کو ترجیح دیتا ہوں۔

مولانا خلیل عرب صاحب کی گفتگو اور علمی مذاکرہ سے جرجانی کی تصانیف بلاغت اور امیر المومنین یحییٰ یمنی کی جلیل القدر تصنیف طراز سے اشتغال ہوا اور درس نظامی کی کتابوں سے طبیعت ہٹی اور انکی رہنمائی اور رفاقت میں ندوہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اسکے بعد مجھے سلف کی کتابوں کو خریدنے اور ان کے مطالعہ کا ولولہ پیدا ہوا خصوصیت

ساتھ جن علماءِ سلف کی اکثر تصنیفات کا میں نے مطالعہ کیا وہ حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن رجب، ابن عبدالہادی، ذہبی
ن حجر عسقلانی، محمد بن ابراہیم وزیر یمانی، محمد بن اسمٰعیل امیر یمانی، محمد بن علی شوکانی، نواب
مدیق حسن خاں۔

امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی جن تصنیفی خصوصیات نے مجھے متأثر کیا، وہ انکی
حید و سنت کی دعوت، دلچسپ اور آسان مگر پُرزور اور مدلل طرز بیان، اور قرآن و حدیث کا
نظیر استحضار و استدلال ہے۔

لیکن اس تاثر کے باوجود شیخین کی تصانیف میں چند مسائل شاذہ سے طبیعت کو اختلاف
ہا۔ ایک اثبات صفات میں ان کا مبالغہ جسکے متعلق محمد بن ابراہیم وزیر نے الروض الباسم میں
ھا ہے وبعض کلامہما یکاد یفضی الی التجسیم، اس بارہ میں امام بیہقی اور ابن جوزی کی روش زیادہ
رغوب رہی۔

اسی طرح بعض مسائل فقہیہ مثل مسئلہ طلاق و یمین وغیرہ اور دقائق معقولات، نیز ذات و
مفات کے مسائل میں انکی دقیقہ سنجیوں سے جو زیادہ تر منہاج السنہ اور کتاب العقل والنقل اور بعض
دوسری کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں، کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔

علیٰ ہذا القیاس شد رحال کے مسئلہ میں حافظ ابن حجر کا یہ قول کہ وہی من ابشع المسائل
لمنقولۃ عن ابن تیمیہ کو صحیح سمجھتا رہا۔

منہاج السنہ میں فضائل اہلبیت رضی اللہ عنہم کی احادیث پر جو متشددانہ کلام منہاج السنہ میں امام نے
لیاہے اس سے ہمیشہ تکلیف محسوس کرتا رہا وادّو لو محوتہا بیدی۔

مجھے امام ابن تیمیہ کے مختصر رسائل جنمیں توحید و سنت کی دعوت ہو وہ زیادہ پسند آئے

جواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، منہاج السنۃ کے بعض مباحث اور فصول اور الصارم المسلول علی شاتم الرسول، میرے نزدیک امام کی منتخب کتابوں اور مباحث میں سے ہیں۔

امام ابن قیم کی تصنیفات میں سے میرے مذاق کی مدارج السالکین، الجواب الکافی، عدۃ الصابرین، زاد المعاد ہیں، ان کی کتابوں اور کلام کے متعلق مجھے شوکانی کی اس رائے سے لفظ بلفظ اتفاق ہے۔ "طویل النفس فی کتبہ اذا تکلم اسہب وطول ذیولہ، وکلامہ فی کتبہ ما تعشقہ الافہام وتکاد تاکلہ العیون وتشرب القلوب۔

ابن قیم کی کتابیں میرے نزدیک امام ابن تیمیہ کے متن کی شرح ان کے اجمال کی تفصیل اور ان کا نقش ثانی ہیں۔

اگر کسی کو امام ابن تیمیہ کی سب کتابیں دیکھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ فتاویٰ اور مجموعۃ الرسائل کا مطالعہ کرے، انکی سب خصوصیات سامنے آجائینگی، اسی طرح سے امام ابن قیم کی زاد المعاد کا حال ہے۔ تفاسیر منقولہ میں اگر کسی کے پاس صرف تفسیر ابن کثیر اور کتب تاریخ میں صرف البدایہ والنہایہ ہو تو ان فنون میں وہ بہت حد تک مستغنی ہو سکتا ہے، ابن کثیر کی بڑی خصوصیت یہ ہو کہ وہ معرکۃ الآرا مسائل میں صرف صحیح روایات سے فیصلہ کرتے ہیں۔

نوٹ

باوجود کوشش کے بر وقت کاغذ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے رسالہ شایع ہونے میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی انشاء اللہ آئندہ ماہ سے رسالہ وقت پر شایع ہوگا اور خریداران صاحبان کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑیگی۔

منیجر

میرا طریق مطالعہ و تحریر

از مولانا سید طفیل احمد صاحب علیگ

آنکھوں کی مسلسل تکلیف کی وجہ سے بغیر تکمیل کئے کالج چھوڑنا پڑا۔ سالہا سال تک علاج کے بعد
ب آرام ہوا تو آنکھوں میں مطالعہ کی قوت رہی تھی بالخصوص انگریزی کتاب اور اخبار تو بالکل نہ پڑھ سکتا
تھا۔ تاہم علی گڑھ تحریک سے وابستگی کی وجہ سے کالج اور اولڈ بوائز کا لٹریچر پڑھتا رہا، اور باوجود
آنکھوں کی تکلیف سے دردسر رہنے کے اولڈ بوائز ڈائرکٹری کے دو ایڈیشن مرتب کئے۔ اسی حالت
میں عمر کے بارہ سال گذر گئے حتیٰ کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں جاکر اس قابل ہوا کہ انگریزی کتب اور اخبارات
پڑھ سکوں۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں بغیر آنکھوں اور سر کی تکلیف کے مسلسل ایک ہفتہ بھی کام
کرسکوں۔ ان حالات میں میں نے تعداد کے اعتبار سے کتابیں اسقدر کم پڑھی ہیں کہ وہ قابل تذکرہ
نہیں البتہ میرے پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ میں جو کتاب پڑھتا ہوں اُس کا خلاصہ ایک کاپی میں لکھ لیتا ہوں اور یہ
عادت اسقدر رسخیتہ ہوگئی ہے کہ کوئی کتاب بغیر خلاصہ کئے میں پڑھ نہیں سکتا۔ اس عادت کی وجہ سے
لمبے لمبے قصوں کی کتابیں اور ناول مجھ سے پڑھے ہی نہیں جاتے اور صرف ٹھوس مضامین کی کتابیں
پڑھ سکتا ہوں جن کا خلاصہ کرنا کارآمد ہو۔ ہر کاپی کے شروع میں اسکی فہرست مضامین ہوتی ہے
اور سب کاپیوں کی فہرستیں ایک اور کاپی میں مع نمبر کاپی و صفحہ مضمون درج ہوتی ہیں۔ اسکا فائدہ
یہ ہے کہ جب مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے تو اس ایک کاپی کے دیکھنے سے اپنی پڑھی ہوئی تمام کتابوں کے
مضامین سامنے آجاتے ہیں۔ مجھے یہ طریقہ اختیار کرنیکی ضرورت زیادہ تر اسلئے محسوس ہوئی کہ
میرا حافظہ کمزور ہوگیا۔ مجھے دنیا کے برفانی دور کے حالات معلوم کرنیکی ضرورت ہوئی خیال

آیا کہ شاید میں نے اس مضمون پر کوئی کتاب پڑھی ہے۔ اپنی کاپی اٹھا کر فہرست مضامین پڑھنی شروع کی۔ اسمیں کتاب کے خلاصہ کا پتہ چند منٹ میں چل گیا۔ اُسے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا پوری کتاب سامنے آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ اور اسطرح کہ چند منٹ میں اُسکی تمام معلومات دماغ میں آگئیں۔

جن اصحاب کا حافظہ قوی ہو وہ تو اپنی پڑھی کتابوں کے مضامین یاد رکھتے ہوں گے مگر میرا تجربہ یہ ہو کہ کتاب کا مضمون اُسی وقت ذہن نشین ہوتا ہو جبکہ پڑھنے کا کوئی مقصد ہو۔ طالبعلمی کے زمانہ میں تو مقصد امتحان ہوتا ہو مگر طالب علمی کے بعد پڑھنے کا بہترین مقصد تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری ہے۔ اگر یہ مقصد نہ ہو تو دماغ کے اندر تمام معلومات مثل ایندھن کے بے ترتیب پڑی رہتی ہیں۔ مگر کچھ لکھتے وقت اُسی ایندھن میں سے کارآمد چیزیں نکل نکل کر خود بخود مرتب اور آراستہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پس اگر کسی شخص کو اپنا علم محفوظ رکھنا ہو تو تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہونچانے کی کوشش کرتا رہے۔

دوسری بات یہ ہو کہ جو کچھ پڑھے یا لکھے وہ ایک خاص جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس سے پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے۔ لکھنے کے بارے میں مجھ میں احساس کمتری بہت زیادہ ہو اور میں ابتک سمجھتا ہوں کہ مجھ میں لکھنے کی قابلیت بالکل نہیں ہے۔ جو کچھ لکھتا ہوں وہ ہجوم خیالات سے مجبور ہوکر لکھتا ہوں۔ جس زمانہ میں رسالہ سود مند نکالتا تھا تو ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اچھا لکھنے کی ترکیب بتاؤ۔ اس سے مجھے حیرت ہوئی کہ میں تو اس فکر میں رہتا ہوں کہ مجھے اچھا لکھنا آجائے مگر ایک واقعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ خاص جذبات سے متاثر ہوکر کچھ لکھا جائے تو بلالحاظ زبان اور لٹریچر کی عمدگی کے پڑھنے والے پر اثر پڑتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہو کہ ایک بار میں زرورہ کی چھاؤنی پر جو ضلع بلند شہر میں واقع ہے گیا تھا۔ اُس زمانہ میں مجھ پر مسلمانوں کے افلاس کے خیالات کا ہجوم تھا

ال اُس زمانہ میں خشک پڑی تھی اور بڑے بڑے پرند سیکڑوں کی تعداد میں ہزاروں مچھلیوں پر
ٹ پڑے تھے اور چونچوں اور پنجوں سے پکڑ پکڑ مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ
ے کی سرمایہ دار قومیں غریب مسلمانوں کا اسیطرح شکار کر رہی ہیں۔ علی گڑھ واپس آکر "زورہ کی
ل سے ایک سبق" کے عنوان سے رسالۂ سود مند میں ایک مضمون لکھا۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ
ں مضمون کو پڑھکر کئی اصحاب علیٰحدہ علیٰحدہ زورہ کی جھال دیکھنے گئے۔ اُسوقت نہر میں پانی جاری
یا تھا اور اُس منظر کا پتہ نہ تھا جو مضمون میں لکھا گیا تھا۔ اُس مضمون میں زبان اور لٹریچر کی خوبی
ہ ہوتی جبکہ میں اس سے نابلد ہوں۔ البتہ مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی سے معلوم ہوا کہ
ریر کی یہ بڑی خوبی تھی کہ کچھ لوگ اُسے پڑھکر اسقدر متأثر ہوئے کہ اُس مقام کو دیکھنے بے اختیار
ہ گئے۔

ایک اور میرا معمول ہے جو میرے نزدیک مفید ہے۔ ۱۸۹۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب
دم کی پیروی میں میں نے اور خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب نے روزنامچہ لکھنا
روع کیا تھا۔ اور وہ ابتک جاری ہے جس کو اب باون سال ہو گئے۔ محض روزنامچہ لکھے چلے جانے
دہ فائدہ نہیں جبتک کہ اُسے دیکھا نہ جائے۔ میں ہر نئے سال کے شروع میں پچھلے سال کا روزنامچہ پڑھکر اُسپر تنقید لکھتا
ں جو کچھ پچھلے سال میں کیا ہے اُسکا خلاصہ لکھکر آئندہ سال کیلئے اپنے ارادے لکھتا ہوں اور اُن ارادوں کو پورا کرنیکی کوشش کرتا ہوں

ہ زمانہ وہ تھا کہ دماغ میں بہت سے کام آتے تھے اور ارادے کئے جاتے تھے اور وہ ارادے پورے نہ ہونے سے انتشار خیال رہتا تھا
ں کا اندازہ پچھلے روزنامچوں کے پڑھنے سے ہوتا ہے، مگر اپنے پچھلے کاموں پر نظر ڈالتے رہنے اور بنائے ہوئے
روگرام پر عمل کرتے رہنے سے اب دماغ اس قسم کے افکار سے پاک رہتا ہے اور طبیعت میں ایک قسم کا
رن محسوس ہوتا ہے اور زبان سے بے اختیار نکلتا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۔

ایمان کا زور

از مولوی سید حفیظ صاحب قدوائی متعلم دارالعلوم ندوہ

کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود آج مسلمان ہر جگہ ضعف و اضمحلال محسوس کر رہے ہیں، لیکن کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ چند سو ہونے کے باوجود دنیا کو زیر و زبر کرنے کی ہمت تھی ذیل کی سطروں میں اسی قسم کے چند جرأت آموز واقعات درج کئے جا رہے ہیں۔ ان سے اگر کسی ایک دل کا یاس و قنوط بھی دور ہو گیا تو غنیمت سعادت ہے۔

مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آگئے ہیں، مکہ سے تین سو میل دور ہیں، لیکن قریش کو اب بھی چین نہیں آتا کبھی یہود کو ابھارتے ہیں کبھی منافقین کو اکساتے ہیں۔ اور پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ ارادہ ہے کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ چند دن میں انکی فوجیں مدینہ کی طرف بڑھتی نظر آتی ہیں۔ آنحضرت صلعم صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کرتے ہیں، صحابہؓ کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ "ہم حضرت موسیٰ کی قوم نہیں ہیں کہ کہیں گے" فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ" جا تو اور تیرا خدا لڑے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ ہم آپکے دائیں سے لڑیں گے اور بائیں سے، آگے سے اور پیچھے سے یہانتک کہ اگر آپ سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔

اب قریش کا لشکر قریب آگیا ہے مجبوراً مسلمان مقابلہ کے لئے نکلتے ہیں لیکن اب بھی بے سروسامانی کا یہ حال ہو کہ قریش کی ایک ہزار آہن پوش فوج کے مقابلہ میں کل تین سو تیرہ نفوس ہیں اور وہ بھی اس حال میں کہ صرف تین گھوڑے اور ستر اونٹ ہیں، زرہ بکتر کا کیا ذکر، کسی کے پاس پورے ہتھیار بھی مشکل سے ہیں، اگر کوئی سہارا ہو تو اللہ کا، اور کوئی طاقت ہو تو ایمان کی۔ دل

خدا کی طرف متوجہ ہیں اور زبانیں اُسکی یاد میں مشغول۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں سر جھکائے لئے رہے ہیں کہ "خداوندا اگر یہ آج تیرے مٹھی بھر پرستار مٹ گئے تو پھر زمین پر تیری پرستش نہ ہوگی۔"

لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور چند گھنٹوں میں میدان دشمنوں سے خالی ہو جاتا ہے۔

ذرا آگے بڑھئے، بدر کے کچھ عرصہ بعد مدینہ میں مردم شماری ہوتی ہے اور مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار نکلتی ہے۔ ایمان کے جوش میں یہ الفاظ زبانوں پر آجاتے ہیں کہ "جب ہم کم تھے تو کوئی ہمارے ارادوں میں تزلزل نہ پیدا کر سکا، اب جبکہ ہم خدا کے فضل سے ڈیڑھ ہزار ہیں تو اب دُنیا کی کون طاقت ہمارا بال بیکا کر سکتی ہے۔

اس واقعہ کو کئی برس گذر گئے ہیں، قریش متعدد معرکوں میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکامیاب ہو چکے ہیں اسلئے تنہا نبرد آزمائی کی ہمت نہیں پڑتی، ساری جزائر میں گھوم گھوم کر قبائل کو اُکساتے ہیں، خود مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں کو سازش پر آمادہ کرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں فوجیں آکر مدینہ کو گھیر لیتی ہیں، مسلمان خندق کھود کر مدافعت کا بندوبست کرتے ہیں پریشانی کا یہ عالم ہے کہ نگاہیں کج ہیں، کلیجے منہ کو آگئے ہیں[1]۔

لیکن اس حال میں بھی ایمان کے جوش کا یہ حال ہے کہ زبانوں پر یہ الفاظ ہیں" ہم ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس پر بیعت کی ہو کہ جبتک جان میں جان ہے ہم خدا کی راہ میں لڑتے رہیں گے۔" انکی قوت ایمانی کا یہ حال ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی غطفان سے مدینہ کی کچھ سالانہ پیداوار دیکر معاملہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ قریش کا ساتھ چھوڑ دیں، صحابہؓ سے مشورہ فرماتے ہیں، انصاری عرض کرتے ہیں کہ" اگر حکم ہو تو مجال انکار نہیں، لیکن اگر ہماری خاطر یہ انتظام ہے تو اسکی ضرورت نہیں، خدا کی قسم جب جاہلیت میں ہم سے لوگ دبا کر نہ کچھ لے سکے تو اب

---

[1] زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر ۱۲

جبکہ اللہ نے ہمیں اسلام کی عزت بخشی ہو یہ ذلت کیونکر گوارا کر سکتے ہیں۔

بالآخر دشمنوں کی صفوں میں انتشار پھیل جاتا ہو اور وہ بیس بائیس دن کی لاحاصل مشقت کے بعد بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور اس بدحواسی کے ساتھ کہ ابوسفیان اونٹ پر سوار ہو اونٹ بندھا ہوا ہے لیکن ہوش نہیں آتا اور جابک پر جابک لگائے جاتا ہے۔

ایک سال کا زمانہ اور گذر جاتا ہو مسلمان حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ کی طرف رواں ہوتے ہیں، قربانی کے جانور ساتھ ہیں، احرام بندھے ہوئے ہیں، تلواریں میانوں میں ہیں، لیکن قریش کو اس پُرامن قافلہ کا داخلہ بھی مکہ میں منظور نہیں۔ آگے بڑھکر روکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح کی کوشش کرتے ہیں قریش کا سفیر خدمت مبارک میں حاضر ہوتا ہو تاکہ معاملہ کو طے کرے، یہاں ایک عجیب روحانی انقلاب کا منظر نظر آتا ہے۔ واپس جاکر قریش سے کہتا ہو کہ "میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، عقیدت اور محبت کی یہ تصویر ہمیں کہیں نظر آتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے ہیں تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہو۔ ادب کی وجہ سے کوئی اُن کو نظر بھر کے نہیں دیکھتا ہو وضو کرنے میں جو قطرے گرتے ہیں لوگ انھیں لیکر ہاتھ و چہرے پر مل لیتے ہیں۔" لیکن قریش اسکے باوجود لڑائی کی ٹھان لیتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تھوڑی دیر میں خبر پہنچتی ہو کہ قریش نے انھیں قتل کر دیا ہو۔ اب مسلمانوں کے دل جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جاتے ہیں، اور صحابہؓ سے جان نثاری کی بیعت لیتے ہیں، اس بیعت میں جس قوت ایمانی کا مظاہرہ ہوتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کو بیحد پسند آتا ہے اور ان الفاظ میں خوشنودی کا اظہار ہوتا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہوا جبکہ وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

اور اس بیعت کو خدا کی بیعت قرار دیتا ہے۔

ِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ　　جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ

ُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ۚ　　سے بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ انکے ہاتھوں پر ہے

اس صادقانہ جوش و خروش اور اس مجاہدانہ عزم و ہمت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ قریش ہمت
ہار جاتے ہیں، اور مسلمانوں سے دس برس کے لئے صلح کر لیتے ہیں۔ یہ صلح مسلمانوں کے لئے "فتح مبین"
ثابت ہوتی ہے اور دو برس بھی نہیں گذرنے پاتے ہیں کہ مسلمان مکہ میں فاتحانہ داخل ہو جاتے ہیں۔
ِانَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔

صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی تبلیغ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ہر جگہ اسلام کے سفیر پیام حق
لے کر روانہ ہو رہے ہیں۔ ایک قاصد بصریٰ کے باجگزار رئیس کے پاس بھی جاتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے
اس خونِ ناحق کا انتقام ناگزیر تھا۔ تین ہزار فوج مدینہ سے روانہ ہوتی ہے۔ دشمن کی ایک لاکھ
فوج مقابل ہے، وقت بہت نازک ہے۔ لیکن مسلمانوں کا ذوق شہادت توقف کا متحمل نہیں۔ حضرت
عبداللہ بن رواحہؓ بڑے جوش سے فرماتے ہیں: "ہم تعداد کی کمی و بیشی پر نہیں لڑتے ہم، تو مذہب کی
طاقت سے لڑتے ہیں۔" ان الفاظ سے ساری لشکر میں جوش کی لہر پیدا ہو جاتی ہے اور تین ہزار کا مختصر
لشکر ۔وہ ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوتا ہے۔ حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوتے ہیں، اب حضرت جعفرؓ
طیار نے بڑھ کر علم کو سنبھالتے ہیں اور اس شجاعت سے لڑتے ہیں کہ ایک ہاتھ کٹ جاتا ہے تو دوسرا ہاتھ
علم کی طرف بڑھتا ہے، آخر وہ بھی اس راہ میں قربان ہو جاتا ہے تو علم کو سینہ سے چمٹا لیتے ہیں بالآخر
برچھیوں کے نوّے زخم کھا کر گرتے ہیں۔ ان کے بعد عبداللہ بن رواحہؓ ہاتھ بڑھا کر علم سنبھالتے ہیں
آخرکار وہ بھی جام شہادت نوش کرتے ہیں! اب حضرت خالدؓ فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور فتح حاصل کرتے ہیں۱

۱ عام طور سے مشہور ہے کہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوئی۔ حضرت خالدؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو دشمنوں کی زد سے نکال لائے لیکن ابن کثیر نے
البدایہ والنہایہ میں اس سے اختلاف کیا ہے اور صحیح روایتوں سے ثابت کیا ہے کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تفصیلات کے لئے کتاب مذکور میں غزوہ موتہ کی
بحث دیکھنا چاہئے۔ ۱۲

تاریخ کے کچھ اور ورق اُلٹیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے، عرب میں ارتداد کی وبا شدت سے پھیل رہی ہے، متعدد جھوٹے نبی نبوت کے دعوے کر رہے ہیں، جو مرتد نہیں ہوئے ہیں انمیں بھی ایک بڑی جماعت زکوٰۃ کی ادائیگی سے منکر ہے، ایرانی اور رومی حکومتیں عرب پر حملہ کے ارادے کر رہی ہیں ان حالات میں لوگوں کی ہمتیں پست ہو رہی ہیں لیکن خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ابرو پر شکن بھی نہیں ہے۔ دل ایمان کی قوت سے معمور ہے اور قدم راہ حق پر استوار ہیں۔ ایک طرف حضرت اُسامہؓ کی سرکردگی میں شام کی طرف فوجیں بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف مُرتدین اور مانعین زکوٰۃ کی طرف تادیبی مہم جاری ہے اس عزم و ہمت کو دیکھکر حریفوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور گنتی کے چند دنوں میں ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو جاتا ہے۔

شام میں یرموک کا عظیم الشان معرکہ درپیش ہے، رومی فوجیں لاکھوں کی تعداد میں مقابل ہیں ایک بڑی تعداد مرمٹنے پر تیار ہے۔ پیروں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں تاکہ بھاگنے کا کوئی سوال ہی ذہن میں نہ آئے مسلمانوں کی مشکل سے تیس چالیس ہزار تعداد ہے۔ یہ منظر دیکھکر ایک سپاہی کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ اُفوہ، رومی کسقدر زیادہ ہیں، حضرت خالدؓ وہیں ٹوکتے ہیں کہ "فوجوں کی قوت تعداد کی کثرت پر نہیں ہے بلکہ دلوں کے استحکام اور ہمتوں کی بلندی پر فتح و شکست کا مدار ہے" فوجیں ملتی ہیں، گھمسان کا رن پڑتا ہے اور دنیا تعجب سے دیکھتی ہے کہ دشمنوں کی صفیں اُلٹ جاتی ہیں اور قلیل التعداد عرب رومیوں کی ٹڈی دل فوج پر غالب آجاتے ہیں۔

قادسیہ کے میدان میں ایران کی پوری قوت اُمنڈ کر آگئی ہے، فارس کا سپہ سالارِ اعظم رستم خود مقابلہ کے لئے نکلا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں فوجیں حکم کی منتظر ہیں، جنگی ہاتھیوں کے غول کے غول ہمراہ ہیں، حوصلے یہ ہیں کہ کوئی دم میں عربوں کا قلع قمع کر دیا جائے گا، مسلمان چالیس ہزار بھی نہیں ہیں، سامان جنگ کا یہ حال ہے کہ سیانیں بھی تیز نہیں، تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہیں، تیروں کی

یہ کیفیت ہو کہ ایرانی سپہ سالار محسوس کر کتا ہو کہ "یہ تنکے کیا کام دیں گے"۔

مسلمان سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ایسے بیمار ہیں کہ گھوڑے پر بیٹھنا ناممکن ہے، لیکن ہر سپاہی ایمان کے جوش سے معمور اور اسلام کی محبت میں سرشار ہو جنگ شروع ہوتی ہو، حالت اتنی نازک ہو کہ حضرت عمرؓ مدینہ میں بے چین ہیں، راتوں کو شعلوں کی روشنی میں جنگ جاری ہو، آخر ایمان کی طاقت غالب آتی ہو اور کئی دن کے خونریز معرکہ کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، انکی فوجوں میں ابتری پھیل جاتی ہو، اور عرب کے بے سر و سامان بدو ایران کی شوکت و عظمت کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

پایہ تخت مدائن فتح ہو چکا ہو، ایرانی منتشر فوجوں کو جمع کرکے پھر ایک کوشش کرنا چاہتے ہیں نہاوند میں زبردست معرکہ کارزار گرم ہے۔ نعمان ابن مقرنؓ اسلامی فوجوں کے قائد ہیں، جنگ بہت ہی سخت ہو مسلمانوں کے دل خدا کی طرف متوجہ ہیں، سپہ سالار کامیابی کی دعا مانگتے ہیں، اور ساتھ ہی اپنی شہادت کے متمنی ہیں۔ دن ڈھلے فتح کے آثار نظر آتے ہیں، حضرت نعمانؓ کے دل میں شہادت کی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے، تمنا پھر دعا کی شکل اختیار کرتی ہے، دعا قبول ہوتی ہو، کاری زخم کھاکر گرتے ہیں، ایک سپاہی سنبھالنا چاہتا ہے، مگر آپ منع فرماتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ "میدان کی طرف نظر رکھو۔" سپہ سالار کی موت سے عموماً فوج میں ہراس اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور فوجوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، لیکن یہاں مسلمانوں کے یہاں رنگ ہی دوسرا ہو، اس حادثہ سے جوش میں مزید اضافہ ہوتا ہے بالآخر شام کے قریب دشمن مفتوح ہو جاتا ہے۔ فتح کے بعد حضرت نعمانؓ لاشوں اور زخمیوں کے درمیان پڑے ہوئے ملتے ہیں، ابھی کچھ سانسیں باقی ہیں، ایک سپاہی سر زانو پر رکھ لیتا ہے، آنکھیں کھولتے ہیں اور جنگ کا حال دریافت فرماتے ہیں، فتح کا مژدہ سنکر مسکراہٹ آپکے لبوں پر کھیلتی ہوئی نظر آتی ہو اور فرماتے ہیں کہ اسکی اطلاع امیر المومنین کو دے بھیجنا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کا زمانہ ہے حضرت عقبہ ابن نافعؓ شمالی افریقہ کی مہم پر مامور ہیں، ملک کے ملک اور علاقہ کے علاقہ فتح کرچکے ہیں، اب اسلامی فوجیں بحر ظلمات کے کنارے پہونچ گئی ہیں لیکن انکے جوش کا یہ عالم ہے کہ بے تکلف سمندر میں گھوڑے ڈالدیتے ہیں، جب آگے بڑھنا ممکن نہیں نظر آتا تو کہتے ہیں کہ "خدایا اگر یہ سمندر روک نہ ہوتا تو اس سرے سے اُس سرے تک تیرے نام کی منادی کرآتے۔ اقبال نے اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

انھیں عقبہ ابن نافعؓ کا ایک اور واقعہ سُنئے۔ قیروان کی فوجی چھاؤنی بنانے کا ارادہ ہے یہ جگہ درندوں اور موذی جانوروں کا ایسا مسکن ہے کہ لوگ اس خیال کو دشوار سمجھتے ہیں، لیکن مجاہد حق کی ہمت بلند کے آگے کوئی چیز ناممکن نہیں، کھڑے ہوکر پکار دیتے ہیں کہ "ہم لوگ یہاں چھاؤنی قائم کرنا چاہتے ہیں، تین دن کے اندر اندر تمام جانور یہاں سے چلے جائیں ورنہ ہمارے ہاتھ سے کسی کو بھی امان نہیں ملیگی" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا کا سارا جنگل صاف ہوجاتا ہے اور کسی جانور کا کہیں پتہ نہیں چلتا[۱]۔

ولید بن عبدالملک کا زمانہ ہے، قتیبہ ابن مسلم ترکستان فتح کرچکے ہیں، اب چین فتح کرنیکا ارادہ ہے سفیر خاقان کے دربار میں روانہ ہوتا ہے، بادشاہ سے گفتگو ہوتی ہے، مسلمان سفیر گو اپنے مرکز سے ہزاروں میل دور ہے لیکن ہمت کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی خوف وہراس کے شہنشاہ سے گفتگو کرتا ہے، شاہ چین کو تعجب ہوتا ہے پُر رعب طریقہ سے کہتا ہے کہ "اگر ہم ایک ایک مٹھی خاک بھی ڈالدیں تو تم سب اسمیں دب کر رہ جاؤگے" لیکن سفیر نہایت ہی بیباکی سے جواب دیتا ہے کہ "موت کا ایک دن معین ہے تم اس قوم کو ہرگز فنا نہیں کرسکتے ہو جو دمشق سے لیکر چین تک پھیلی ہوئی ہے" بالآخر صلح کی گفت وشنید شروع ہوتی ہے، اسلامی سفیر شرائط پیش کرتا ہے، بادشاہ پوچھتا ہے کہ آخر تمہارے سپہ سالار کیا چاہتے ہیں، سفیر جواب دیتا ہے کہ "انھوں نے

---

[۱] مشہور مؤرخ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں بنائے قیروان کے موقع پر اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ ۱۲

قسم کھائی ہے کہ جبتک چین کی زمین کو پامال نہ کرڈالیں گے، شہزادوں پر جزیہ غلامی نہ ثبت کریں گے اور خراج نہ وصول کرلیں گے واپس نہ ہوں گے۔" بادشاہ شرائط تسلیم کرلیتا ہے، اپنے شہزادوں کو خراج کے ساتھ بھیجتا ہے اور ایک طشت میں چین کی مٹی ساتھ کردیتا ہے اور سفیر سے کہتا ہے کہ اپنے سپہ سالار کو عرض کیجئے کہ وہ اس مٹی کو اپنے قدموں سے پامال کرکے اپنی قسم پوری کریں۔

اسی عہد کا ایک اور واقعہ ہے، طارق ابن زیادؓ نے اسپین پر چڑھائی کی ہے، صرف بارہ ہزار فوج ساتھ ہے، شاہ اسپین ایک لاکھ فوج کے ساتھ مقابلہ کے لئے نکلتا ہے، طارق اپنی کشتیوں کو نذرِ آتش کردیتا ہے اور سپاہیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتا ہے۔

ایھا الناس العدو امامکم والبحر من ورائکم فاین المفر۔ "اے لوگو دشمن تمہارے سامنے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے، پس کہاں بھاگنے کی راہ ہے۔

فوج میں جوش و خروش چھا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسپینیوں کو شکست فاش ہوتی ہے ڈاکٹر اقبال نے ان اشعار میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطا است
دُوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا روا ست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اسی زمانہ کا ایک اور واقعہ سُنئے۔ سترہ سالہ نوجوان محمدؒ ابن قاسم سندھ کے دُور دراز علاقہ پر چڑھائی کرتا ہے، تھوڑی سی فوج ہمراہ ہے، دشمنوں کی صفیں کی صفیں مقابلہ کے لئے آئی ہیں، لیکن ساری کوششیں بیکار ثابت ہوتی ہیں اور مجاہدینِ حق کی یہ مختصر سی فوج تھوڑے سے عرصہ میں سندھ کے وسیع صوبہ پر قابض ہوجاتی ہے۔

محمدؒ ابن بختیار خلجی ایک مشہور اسلامی سپہ سالار ہے، صوبۂ بہار و بنگال پر حملہ آور ہوتا ہے۔

پایۂ تخت ندیا کی طرف دھاوا ہے، صرف اٹھارہ سوار ہمراہ ہیں، لیکن بے جھجک بازاروں سے گذرتے ہوئے راج محل کے سامنے پہونچ جاتے ہیں اور آناً فاناً اندر داخل ہو کر فتح کا جھنڈا نصب کر دیتے ہیں۔

یہ تاریخ کے چند مشہور واقعات ہیں جو سرسری طور پر ذکر کر دیے گئے ہیں، مسلمانوں کی ساری تاریخ اسی قسم کے ہمت آفریں اور ایمان افروز واقعات سے پُر ہے۔ فہل من مدکر۔

معاشی توازن کے نئے تخیل

از جناب مولانا سید شاہ عزالدین صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

شاہ عزالدین صاحب اسلام کے نظام زکوٰۃ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں ذیل کا مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے (مدیر)

دُنیا میں روٹی کا سوال کم و بیش ہر زمانہ میں رہا ہی، لیکن موجودہ دور جو گذشتہ زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی بے چینی، بے آئینی اور غیر تسکین بخش سرمایۂ حیات اپنے جلو میں لایا ہے، اسنے پیٹ اور اقتدار کی خواہشوں کے ماتحت نئے نئے بت تراشے ہیں، اشتراکیت، آمریت، فسطائیت اور جمہوریت سرمایہ داری وغیرہ کے نام سے مختلف نظام حیات کے بُت تراشے گئے ہیں اور انکی پرستش کیجا رہی ہے لیکن انمیں بعض تو اقتدار و حکومت کے نشہ نے پیدا کئے ہیں اور بعض روٹی اور سماج کی برابری کے جذبہ کے رہین منت ہیں، انمیں اشتراکیت یا سوشلزم کی زائیدگی صرف آخری مقصد کے لئے وجود میں آئی ہو۔

میں چاہتا ہوں تمام نو زائیدہ نظام آپکے سامنے آئیں پھر اشتراکیت کے نظام کو نمایاں کرکے اسلام کے اقتصادی اور فطری نظام کو پیش کروں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور معاشی نظام کی کتنی اعلیٰ و دلکش اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

نظام سرمایہ داری

ابتدائے دور جدید نے دولت کے حصول کے لئے مختلف مشینوں کی ایجاد کی جن سے زرخیز زمینوں شاداب پہاڑیوں اور وسیع کاشت کے علاقوں کی دولت کو نئی نئی صنعتی شکلوں کے ذریعہ قابو میں لایا جائے، اسطرح انھوں نے دنیا کی دولت سمیٹنا شروع کردی اور معاشی پیدا وار کے بے انتہا

اسباب پر جو انکی ضرورت سے کہیں زیادہ تھے قبضہ کرلیا اور یہ چیز سرمایہ داری کے نام سے موسوم ہوئی اسطرح سرمایہ داری معاشی پیداوار کے ایک ترقی یافتہ نظام کا نام ہوا لیکن پیداشدہ معاشی سرمایہ کو ملک کے افراد پر کس طرح تقسیم کیا جائے، یہ سوال کبھی اس کے پیش نظر نہیں رہا۔ اس نظام کی حکومت ملک و قوم کی معاشی ضروریات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے، جماعتی تفریق، شخصی ملکیت اور سرمایہ دار کا تسلط، معاشی ہیئت ترکیبی کی غیر مساویانہ صورت اسکا ناگزیر نتیجہ ہے۔

ان ترکیبوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز لیکن بہت عام (ربٰوا) سود کا کاروبار ہے، ربٰوا کا اصول یہ ہے کہ مال بغیر کسی محنت کے خود انتفاع حاصل کرے اور صاحب مال کسی نقصان کا ذمہ دار نہو، تاجر کتنی ہی ہوشیاری اور محنت سے کام کرے، کاریگر کتنی ہی جفاکشی اور دیدہ ریزی سے چیزیں تیار کرے لیکن نقصان سے بے خطر نہیں، لیکن سودخوار کسی قدر رکم سود لے اسکا نفع پائدار اور مستقل ہے اور اسکو کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں اور نہ اُسے کسی محنت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بیع کی وہ بیشمار تاجرانہ قسمیں جو صرف کشش زر کے لئے پیدا کی گئی ہیں، مثلاً سٹہ یا النیرال کے فرضی بیع اور بیع در بیع یہ سب محض سرمایہ جمع کرنیکا ذریعہ ہیں، حالانکہ یہ سب درحقیقت بیع نہیں ہے، لائف انشورنس یعنی زندگی کا بیمہ، چیزوں کا بیمہ، مکان کا بیمہ وغیرہ یہ سب بظاہر جان و مال کے تحفظ کا ذمہ ہے، لیکن اس ذمہ داری کے بدلے بیشمار دولت جمع کرلیجاتی ہے اور یہ دولت کہاں سے سمیٹی جاتی ہے؟ مزدور اپنا پیٹ کاٹ کر، کاریگر اپنا خرچ بچاکر تاجر اپنے نفع و نقصان سے بے پرواہ ہوکر اپنی پونجی ان سرمایہ داروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سرمایہ داری ایک معاشی نظام ہے پیداوار دولت کا جو اپنی ذاتی اغراض یا مخصوص افراد کے مفاد کا ضامن ہے، جسمیں عوام کا کوئی حصہ نہیں۔

اشتراکیت یا سوشلزم

اشتراکیت یعنی سرمایہ کی مساوی تقسیم کا تخیل کوئی بالکل نیا تخیل نہیں ہے، دنیا کی قدیم تاریخ

میں بھی اس قسم کی تحریک کا سُراغ ملتا ہو۔ ایک دور یونان پر بھی ایسا گذرا ہو جب وہاں اقتصادی مساوات کا گیت گایا گیا ہو اور پوری طرح اس معاشرتی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی گئی لیکن یونان کا عقل و تدبر اس چیز میں ناکام رہا، دوسری مرتبہ چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے مزدکیوں نے یہ اقتصادی مساوات پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور پورے ایران میں پوری قوت کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک اس کو جاری رکھا، یہی تحریک صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں اُبھری اور سوشلزم کے نام سے تمام یورپ پر چھا گئی اور پھر یہی تحریک علمی تبدیلیوں کے ساتھ روس کے نظامِ حکومت کی بنیاد قرار دی گئی، یورپ میں ابتداءً کارل مارکس اور انگلیز وغیرہ نے اسکا علم اپنے ہاتھ میں لیا، کارل مارکس کی کوششوں سے ۱۸۴۷ء میں لندن کے اندر اشتراکیوں کی ایک سوسائٹی قائم کی، پھر ان دونوں نے باہم مشورہ کرکے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی، اس کانفرنس کے بعد ایک اشتراکی انجمن قائم کی گئی جسکا مقصد بورژوا (متوسط) طبقہ کو بالکل نیست و نابود کرکے اسکے اثر کو زائل کر دینا تھا، اور ایک ایسی سطح پیدا کرنی تھی جسمیں غریب و امیر کی تفریق مٹ جائے، اور شخصی ملکیت کا خاتمہ ہو، ۱۸۴۸ء میں اشتراکیوں کا ایک منشور شائع کیا گیا جس کا اوّلین مقصد متوسط طبقہ کے مقابلہ میں کاشتکار اور مزدور یعنی طبقۂ عوام کو لانا تھا۔

"اس منشور کی اہم دفعات یہ تھیں"

(۱) جائداد کا بشکل زمین یا جاگیر خاتمہ کرنا۔

(۲) آمدنی پر مزید انکم ٹیکس

(۳) وراثت کے تمام حقوق کو ختم کرنا

(۴) لین دین کے تمام معاملات کو پورے اختیارات کے ساتھ حکومت کے ہاتھ میں بذریعۂ ایک قومی بینک کے دیدینا۔

(۵) حکومت کے مملوکہ و مقبوضہ کارخانوں نیز ذرائع دولت میں توسیع

(۶) تمام افراد کو یکساں کام کرنے کے لئے مجبور کرنا۔

(۷) نقل و حمل کے ذرائع و وسائل کا حکومت کے قبضہ میں ہونا

(۸) زراعت کا صنعتوں سے مدغم کر دینا

(۹) تمام بچوں کو عام مدرسوں میں مفت تعلیم دلانا اور کارخانوں میں بچوں سے کام لینے کے طریقہ کو ختم کرنا۔

اسکے بعد پہلی بین الاقوامی اشتراکی کانگریس لندن میں ہوئی اسکے بعد ۱۸۷۳ء تک مختلف کانگریسیں منعقد ہوتی رہیں جنمیں مختلف یورپین ممالک کے نمایندے شریک ہوا کئے اور کانفرنسوں کے نتیجہ میں مزدوروں میں سیاسی لہر دوڑ گئی اور سرمایہ دار و مزدوروں کی باہمی منافرت کا آغاز ہوگیا، اشتراکیت تمام یورپ میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگی اور چونکہ صنعتی اسباب انقلاب نے بڑی بڑی مشینیں ایجاد کر دی تھیں اسلئے کارخانہ دار سرمایہ دولت و زر کے مالک بن بیٹھے، لاکھوں مزدور ان کارخانوں میں کام کرتے تھے اور محض پیٹ بھرنے کے لائق اُجرت پاتے تھے، دوسری طرف سرمایہ دار اور مالکان مل اور کارخانہ دار کروڑوں روپے نفع میں کماتے تھے اور عالی شان محلوں میں رہتے تھے، اسکا قدرتی اثر یہ ہوا کہ سماج دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک سرمایہ دار دوسرا مزدور، یا کارکن طبقہ، مزدوروں کی زبوں حالی نے ان اشتراکیوں کے لئے میدان صاف کر دیا اور انھوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر کارخانہ دار اور سرمایہ دار کے خلاف یہ کہکر جذبۂ منافرت پھیلانا شروع کر دیا کہ کام تم کرو محنت تمہاری ہو لیکن یہ سرمایہ دار تمہاری محنت سے فائدہ اُٹھا کر داد عیش دیں تم ان سے انتقام لو۔

اشتراکیت کے اُصول

کارل مارکس نے ۱۸۶۷ء میں اپنی کتاب "کیپٹل" "سرمایہ" لکھی جو اشتراکیت کا اصل کہلاتی ہو

اور جس سے اشتراکی نظریہ کا ہمیں صحیح علم ہوتا ہو، اس کتاب میں اسکا بنیادی بیان یوں شروع کیا گیا ہو
قانونی تعلقات حکومت کی قسمیں، رسوم و عادات، مذہب و فلسفہ ہمیشہ اُن مادی حالات کا نتیجہ ہوتے
ہیں جنہیں انسانوں نے اپنے آپ کو گھرا پایا ہے، اُسکے نزدیک انسانی ارتقار او رنشو ونما کی تاریخ کوئی
خاص چیز نہیں، بلکہ یہ مختلف طبقات انسانی کے جنگ کی ایک داستان ہو جسمیں برسرِ اقتدار طبقہ نے
ہمیشہ اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھکر معاشرتی اور تمدنی اداروں کو بدل ڈالا ہے۔

الغرض کارل مارکس کے تین بنیادی نظریے یا اصول ہیں

(۱) قانونی تعلقات، حکومت کی شکلیں، رسوم و عادات، مذہب و فلسفہ محض ابتدائی مادی حالات کے نتیجے ہیں، انسانی ارتقار و نشو و نما مختلف طبقات کے جنگ کی ایک داستان ہو، برسرِ اقتدار طبقہ نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھکر معاشرتی اور تمدنی اداروں کو بدلا ہے۔

(۲) طبقہ وارانہ جنگ انسانی سوسائٹی اور انسانی ارتقار کے لئے ناگزیر ہو، موجودہ سوسائٹی میں سرمایہ کے ایک جگہ یا چند جگہ جمع کر دینے کے سبب دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں، ایک بورژوا یا سرمایہ دار دوسرا عامل اکارکن، ان دونوں طبقوں کے مفاد کبھی ایک نہیں ہو سکتے، نئی انسانی سوسائٹی اسوقت تک نہیں بن سکتی جبتک ایک ایسا انقلاب نہ پیدا ہو کہ بورژوا طبقہ پر کارکن طبقہ پوری طرح غلبہ پالے۔

(۳) محنت ہی دولت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہو، منافع اور بچت کی رقم پر مزدور طبقہ کا حق ہے نہ کہ سرمایہ دار طبقہ کا۔

"کیپٹل" میں اشتراکیت کا تیسرا نظریہ، یہ اشتراکیت کی جان ہے اسکا مطلب یہ ہو کہ محنت ہی دولت پیدا کرنیکا واحد ذریعہ ہو، اور دولت جس نے اسکے حاصل کرنے میں محنت کی ہو اسکی ملک ہو اسلئے سرمایہ دار مزدوروں سے محنت لیکر جو تھوڑی رقم مزدوری کی صورت میں ان کو دیدیتے ہیں اور بقیہ منافع و بچت خود ہضم کر جاتے ہیں یہ ان کی رقم نہیں کہی جا سکتی کیونکہ انھوں نے اسکے حاصل کرنے میں کوئی

محنت نہیں کی ہے اسلئے کل رقم مزدوروں کی ہے جنھوں نے اپنی محنت سے اُسے پیدا کیا ہے۔

یہ تو مارکس کے اصول تھے، جن سے آپ نے مذہب، فلسفہ، حکومت کی ہئیت ترکیبی اور رسُوم وعادات کے متعلق اسکی رائے معلوم کی، لیکن اخلاقیات کے متعلق بھی آپ اشتراکیت کے ایک ڈکٹیٹر کا نظریہ معلوم کرلیں۔ "لینن" نے اپنے دوست "کارگی" کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا اسکے پاس کوئی اخلاقی اصول نہیں ہے" کہا کہ میرے دوست تم سے کس نے کہا کہ میں نے کبھی اخلاق پر اعتقاد رکھا یا کوئی اخلاقی اصول اپنے پیش نظر رکھا۔

اسی لینن نے ایک دوسرے دوست کو یہ لکھنے میں کبھی کوئی تامل نہ کیا کہ اخلاق، اعزاز کا ہمارے آئین میں کوئی وجود نہیں[۱]۔

لینن کے خاص دوستوں اور دوش بدوش کام کرنیوالوں نے جب ناجائز رقم لینے کی مخالفت کی اور اسے جُرم ٹھہرایا تو اسنے کہا میں یہ روپے ضرور لوں گا، کیا تم بھی نیک چلنی اور دیانتداری کے معاملہ میں بورژوا طبقہ کے ہمخیال ہو، تم نے اسوقت مجھے کیوں سراہا جبکہ میں نے ٹیلے کے ڈاکہ زنی یہ دھاوا کرکے چند ہزار روبل حاصل کئے تھے، تم اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ روپے صرف متوسط طبقہ کے نہ تھے بلکہ غریب کسانوں اور تباہ حال مزدوروں کے بھی تھے، اسکے باوجود تم نے تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے دوستو! ان باتوں کو چھوڑو اور جائز وناجائز صحیح اور غلط کے متعلق سرگرداں اور پریشان نہ ہو۔

"ایف وائی آسن ڈاسکی" اپنی کتاب موسوم لینن میں لکھتا ہے، لینن نے واسس سے جعلی روسی نوٹ بنا دینے کی فرمائش کی، واسس نے ایسا کیا اور دس دس روبل کے پانچ سو جعلی نوٹ بنا دیے، لینن نے اسکا دلی شکریہ ادا کیا اور ان جعلی نوٹوں کو نائیڈ ون میں تبدیل کرکے لندن لگیا

---

[۱] پان اسلامزم اینڈ سوشلزم مسٹر شبیر حسین قدوائی۔ ۱۴

اور وہاں رچنبرز کا فرضی جرمن نام اختیار کیا، اتفاقاً ایک موقع پر ٹراٹسکی نے اظہار افسوس کیا کہ ہم اشتراکیوں کی حیثیت ایک باغی گداگر گروہ سے زیادہ نہیں تو لینن نے ان الفاظ میں اسے تشفی دی کہ گھبراؤ نہیں ہمارے پاس سرکاری مطبع ہے جو غیر ملکی نوٹوں کی کسی تعداد کو تیار کر سکتا ہے یعنی جعلی نوٹ بنا سکتا ہے۔

غور کیجئے وہ اشتراکیت جو انسانوں میں عدل وانصاف اور مساوات رزق کی عملی جلوہ گری کی خواہشمند ہے اخلاقیات کے بارے میں کس قدر تہی مایہ ہے۔

ہندوستان کا تقلیدی سوشلزم جسے بڑے لمبے چوڑے دعووں اور دلفریب فسوں کاری کے ذریعہ عوام کے دل ودماغ پر تسلط کرنیکی کوشش کیجارہی ہے وہ بھی اخلاقیات مذہب اور انسانی جوہر کمال سے بالکل عاری ہے اور اسکو کا یہ چھکڑا ہندوستان کے طول وعرض میں بڑی ہوشیاریوں چالبک دستیوں کے ساتھ تمام جذبات انسانیت پر خس وخاشاک ڈالتا ہوا کھیل رہا ہے اور لینن وٹراٹسکی کی ذریت اسے کامیاب ترین مقصود حیات بتارہی ہے لیکن اسکا پس منظر جو کچھ ہے وہ پیش نظر لایا جاتا ہے اگرچہ ہندوستان کے سوشلسٹ صاف لفظوں میں مذہب کی مخالفت کا اعلان کرنا نہیں چاہتے لیکن حقیقت کبھی نہ کبھی سورج کی طرح نمایاں ہو کر رہتی ہے، ایک سوشلسٹ نے ناچار اپنے ضمیر کی آواز عریاں کردی اور وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور تھا۔

میرٹھ کے مشہور مقدمہ سازش کے ایک ملزم مسٹر ادھیکاری نے عدالت کے سامنے جو بیان دیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

" مارکس کے پیرو اور مادہ پرست ہونیکی حیثیت سے ہم مذہب کے قطعی مخالف اور خدا کے منکر ہیں مگر ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہب کے خلاف ایک نظری اور خیالی پروپیگنڈا کرنے سے مذہب فنا نہیں ہوسکتا لینن اس بات پر زور دیتا ہے کہ مذہب کے خلاف جد وجہد طبقاتی جنگ کی بنیاد پر

ہونی چاہئے"۔

چنانچہ کارخانہ دار اور مزدور زمیندار اور کسان کی طبقاتی جنگ ہندوستان میں سوشلسٹوں نے شروع کر دی اور سامراج کے نام سے ہر قسم کے سرمایہ دار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا کھلے الفاظ میں درس دیا جانے لگا، آگے چل کر مسٹر ادھیکاری اپنے بیان میں کہتے ہیں۔

استیصال مذہب کی تبلیغ کے بارے میں ہماری جو روش ہو اُسے واضح طور پر اشتراکیوں کی انجمن کے پانچویں اجلاس نے حسب ذیل الفاظ میں صاف اور واضح کر دیا ہے۔

"بورژوا طبقہ کے پھیلائے ہوئے تعصبات و توہمات کے خلاف جد و جہد کے جتنے شعبے ہیں انمیں سب سے زیادہ ضرورت مذہب کے خلاف جنگ کی ہے۔ مگر یہ جنگ نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے ہونی چاہئے خصوصًا محنت کش عوام میں جنکی روزمرہ کی زندگی میں مذہب سرایت کئے ہوئے ہے اور انمیں اسکی جڑیں بہت گہری ہیں۔"

اشتراکیوں کے نزدیک مذہب بورژوا طبقہ کی پیداوار ہے، بورژوا طبقہ سے مراد اوسط درجہ کے خوش حال لوگ ہیں اسی طبقہ نے عوام کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے انکی آنکھوں پر مذہب کی پٹی باندھ دی ہے۔

مسٹر ادھیکاری کے بیان سے حسب ذیل باتیں بالکل صاف ہوگئیں۔

(۱) ہندوستان کے سوشلسٹ مذہب کے دشمن خدا کے منکر اور مارکس کے پیرو ہیں۔

(۲) مذہب کو فنا کرنے کے لئے محض پروپگنڈا کافی نہیں بلکہ اسکے لئے عوام و خواص کے درمیان غریبی اور روٹی کے نام سے طبقاتی جنگ برپا کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۳) ادنیٰ طبقہ کی روزمرہ کی زندگی میں اوسط طبقہ کے زور سے مذہب نے اسقدر گہری جڑ پکڑ لی ہے کہ مذہب کے خلاف نہایت احتیاط سے جنگ کرنی چاہئے ورنہ کھلے لفظوں میں مذہب کی

مخالفت سے وہ بھڑک اُٹھیں گے اور کام خراب ہوجائے گا۔

(۴) مذہب کے لانیوالے خدا کی طرف سے کچھ برگزیدہ اور مقدس ہستیاں نہ تھیں بلکہ پرانے طبقہ کے خود غرض دنیا دار تھے، اسلئے اشتراکی جدوجہد میں سب سے زیادہ اہم کام مذہب کی بیخکنی ہو۔

مسٹر ادھیکاری کے اس بیان کی روشنی میں جو شخص یہ کہکر سوشلزم کی حمایت کرے کہ وہ مذہب کا مخالف نہیں وہ جھوٹا دغاباز یا کم از کم اناڑی ہے۔ وہ تمام ضرور ہو کہ مذہب سے کھلی بغاوت کرکے مذہب پرست ہندوستانیوں میں نکو بننا نہیں چاہتا ورنہ مذہب سے زیادہ غریبوں کا غمخوار اور مسکینوں کا دستگیر اور کون ہوسکتا ہے۔

دار العلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ

"دار العلوم"

مدت مدید سے مخلص اور دیندار مسلمان اپنے دینی و علمی مرکز دار العلوم دیوبند کی طرف سے ایک علمی و مذہبی رسالہ کے اجراء پر مُصر تھے۔ الحمد للہ کہ انکی یہ آرزو پوری ہوگئی اور بلا واسطہ دار العلوم کی ملکیت اکابر علماء دیوبند کی سرپرستی و نگرانی میں رسالہ "دار العلوم" جاری ہوگیا۔ رسالہ کے معیار کی بلندی اور اسکی خوبیوں کا اندازہ صرف اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسمیں جماعت دیوبند کے جلیل القدر علماء کے بیش قیمت مضامین مسلسل شائع ہوں گے۔ رسالہ "دار العلوم" کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان جس صحیح اور قابلِ اعتماد مذہبی رہنمائی کی اُمید اپنے مذہبی مرکز دار العلوم دیوبند سے رکھتے ہیں اُسے صرف یہی رسالہ پورا کرسکتا ہے۔ اس رسالہ کا کوئی تعلق کسی شخص کی ذات سے نہیں بلکہ براہِ راست دار العلوم سے ہے، یہی اسکی ساکھ اور استحکام کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ مخلص اور دیندار مسلمانوں سے توقع ہے کہ وہ اس رسالہ کے معاونین میں شامل ہونا اپنا ایک ضروری جماعتی فریضہ تصور فرمائیں گے۔ کاغذ وغیرہ کی انتہائی گرانی کے باوجود سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ہے، نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ وی پی طلب کرنیکے بجائے اپنا اور اپنے احباب کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔ (عبد الوحید ناظم و مرتب رسالہ دار العلوم دیوبند)

الندوہ کو پڑھکر

(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

آپنے یہ ہمارے گم شدہ مخدوم دوست مولوی ضیاء الحسن علوی کو تو خوب ڈھونڈھ نکالا اُن کا مسلسل مضمون ماشاءاللہ، اور سبحان اللہ! مغز و معلومات کے لحاظ سے خوب، اور زبان و انشا کے لحاظ سے خوب تر! الندوہ دورِ جدید کی کوئی اور خدمت بالفرض نہ بھی ہو، تو یہ خدمت بجائے خود کیا کم ہے! البتہ کتابت کی غلطیاں تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام کے پرچہ کا نام "لسان العصر" نہیں (یہ تو بہت بعد کو سہ ماہی کی صورت میں قاضی تلمذ حسین نے نکالا تھا)" لسان الصدق" تھا، قصبۂ کرسی ہونے سے تو ایسا قریب نہیں، البتہ شرر مرحوم کا ننہیال غالباً کرسی میں تھا۔ بس اتنا سہارا "اودھ پنچ" کی ہجو گوئی کے لئے کافی تھا۔

اسی پرچہ میں مولانا اعزاز علی کا مضمون بھی ہم طالبعلموں کے بڑے کام کا ہے، کم سے کم میں تو اس سے بہت مستفید ہوا۔ یہ سلسلہ بھی آپ خوب نکال رہے ہیں اور بڑے بڑے چھپے رستموں کو گوشہ سے باہر لا رہے ہیں۔ والسلام

دریاباد۔ بارہ بنکی عبدالماجد

۷/ اکتوبر ۴۱ء

حالات ندوہ

رمضان کی تعطیل کے بعد ۵ رشوال (۲۷ اکتوبر) کو دارالعلوم کھل گیا اور نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوگیا، طلبہ تقریباً سب آگئے ہیں نئے داخلے بھی ہو رہے ہیں دارالعلوم میں تعلیم کی کوئی فیس نہیں لیجاتی البتہ جو طلبہ دارالاقامہ میں قیام و طعام کا انتظام چاہتے ہیں انھیں سیر ماہوار ادا کرنے پڑتے ہیں، مزید معلومات کے لئے مہتمم صاحب دارالعلوم سے مفصل دستور العمل طلب کیا جائے۔

پہلے درجہ سے پانچویں تک کے نتائج تعطیل سے پہلے ہی شائع ہوگئے تھے، اوپر کی جماعتوں کے نتائج آخر رمضان میں شائع ہوئے۔ کامیابی کا تناسب حسب ذیل ہے۔

کامیاب	۹۷
ناکام	۲۴

امتحان کے بعد حسب معمول طلبا درجہ ہشتم کی الوداعی دعوت ہوئی، اس موقع پر متعدد وداعی تقریریں ہوئیں اور کئی پراثر نظمیں پڑھی گئیں، جنہیں نذیر علی متعلم دارالعلوم کی نظم بہت پسند کی گئی، آخر میں اساتذہ اور منتظمین دارالعلوم کی جانب سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے ایک مختصر تقریر میں طلبہ کو بیش قیمت نصیحتیں فرمائیں۔

پچھلے دو مہینوں میں متعدد دوستوں اور بزرگوں نے اپنی مہمانی کا شرف بخشا جنہیں مولانا شاکر علی صاحب ندوی سیاح جاپان، مولانا ریاست علی صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین دعال مدیر نیم گیا

اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کیٹلاگر اورینٹل لائبریری پٹنہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں شاکر علی صاحب ایک مدت کے بعد تشریف لائے تھے لیکن دل ندوہ کی محبت سے خالی نہ تھا، گوشہ گوشہ کی سیر کی، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ندوی دوستوں سے ملاقات کی، طلبہ کے اصرار پر ایک دن انھیں جاپان کے سلسلہ میں تجارتی معلومات سنائے۔ ریاست صاحب بھی عرصہ کے بعد آئے تھے مگر دل بدستور ندوہ کی محبت سے معمور تھا، گو بعض مجبوریوں کی بنا پر قیام مختصر رہا۔ لیکن اسکی خوشگوار یاد ہنوز تازہ ہے۔

---o---

مسعود صاحب اپنے ساتھ ایک بڑی طویل تاریخ رکھتے ہیں جسکی یاد آج بھی وجہ اشتیاق ہے۔ لیت الزمان یعود غالباً ۱۹۲۸ء کے اوائل میں وہ ندوہ آئے اور یہاں کی زندگی میں اسطرح گھل مل گئے کہ پچھلے دس بارہ برس کی تاریخ کا کوئی ورق ان کے ذکر سے خالی نہیں، الاصلاح، النادی العربی، بزم ادب، بزم مجلی، مجلس پرلمان، مجلس اصلاح خیال، حلقۂ رفقا رخاص، سبھی میں برابر کے شریک تھے۔ اس عرصہ میں شکل سے کوئی تحریک ایسی ہوگی جسمیں وہ ندوہ کی پوری روح کے ساتھ شریک نہ ہوں، الضیاء کی ادارت اور دارالعلوم کی مدرسی تو بہت بعد کی چیزیں ہیں انکی ندویت اسی دن سے آشکارا تھی جب انھوں نے پہلی مرتبہ ندوہ میں قدم رکھا۔ ادھر تقریباً تین برس سے اورینٹل لائبریری پٹنہ میں کام کررہے ہیں لیکن اس دوری کے باوجود ندوہ کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ شاید بعد منزل نے آتش عشق کو اور فروزاں کر دیا ہے، یہاں کی انجمن طلباء قدیم اور حلقۂ معین الندوہ اس کا تازہ ثبوت ہیں۔ اس ہفت روزہ قیام نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کردی، عہد ماضی کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے دوستوں کی پرلطف محفلیں ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے آگئیں اور بے اختیار جی چاہنے لگا کہ۔۔

اک بار ہوں پھر جمع وہ احباب پرانے
باتیں ہوں وہی پھر وہی قصے ہوں پرانے

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ شوال المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء نمبر ۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں عربی مدارس کی اصلاح اور علما کی ازسرنو تنظیم کے متعلق لکھا جا چکا ہے۔ اس عرصہ میں پے بہ پے حالات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ یہ خیالات روز بروز پختہ ہوتے گئے زمانہ کے رجحان کا تقاضا ہے کہ علما اور منتظمین مدارس جلد سے جلد بیدار ہوں، گردوپیش کا جائزہ لیں اور اپنی اصلاح وتنظیم کے بعد آئندہ حوادث سے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ہمارے یہ دینی مدارس اسلام کے قلعے اور مسلمانوں کے مدافعتی مرکز ہیں، ان قلعوں کی رخنہ بندی اور ان مورچوں کی پختگی وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے

عربی مدارس کے قیام کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین وملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کرسکیں اور الحاد وبیدینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں۔ آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس زمانہ کے حالات کے مطابق مفید ومؤثر لائحۂ عمل تیار کیا تھا۔ اور نصاب ونظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے۔ جب تک وہ فضا قائم رہی یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جبکہ عرصہ سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم وتربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کرسکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علما ہوں گے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتی ملت کے ناخدا ہوں گے۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند دعاؤں اور عبادتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے

تمام گوشوں پر محیط ہو۔ دین و دنیا کی راہبانہ تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں۔ ضرورت ہو کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب و لائحۂ عمل ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ آئیندہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہو سکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں۔ آج جو فتنے اُٹھ رہے ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہو تو صرف اسی وقت جبکہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کر لیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈال لیں۔

یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بیقرار نہ ہو ضرورت ہو کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے، دین و ملت کے خدمت گزار کسی جگہ جمع ہوں جزئی اور فروعی اختلافات نظر انداز کرکے مستقبل کی فکر کریں اور آنیوالے خطرات کے پیش نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہو وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے تیار ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

عربی تعلیم کے سلسلہ میں عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی ایسا نصابی سلسلہ مرتب ہو جس کی مدد سے ترجمہ و انشاء کی مشق آسانی سے کرائی جا سکے۔ کمپوزیشن کی بعض مصری ریڈریں ملتی ہیں، لیکن وہ ہماری ضرورت کے لئے ناکافی ہیں، طلبہ اور معلّمین کو یہ سنکر مسرت ہوگی۔ مولانا محمدؐ ناظم ادیب دارالعلوم ندوۃ العلماء ایک اسی قسم کا سلسلہ مرتب کر رہے ہیں، پہلا حصہ پریس میں جا چکا ہے، دوسرے کا خاکہ تیار ہو رہا ہے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبدالعزیز صاحب میمن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

پہلے پہل جب میں کاٹھیاواڑ سے دہلی آیا تو چونکہ اردو اور فارسی دونوں سے نابلد تھا اس لئے تین سال صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم میں ضائع ہوئے، اور شرح جامی تک پہونچا اس کے بعد یکایک توفیق الٰہی نے رہنمائی کی اور معلوم ہوا کہ میں غلط راستہ پر جا رہا ہوں، چنانچہ یہ سب میں نے چھوڑ دیا، اساتذہ کو بہت کم تکلیف دی، اور زیادہ تر اپنی کاوش پر اعتماد کیا اور حسب ذیل کتابوں کو مع شروح کے بہت غائر نظر سے مطالعہ کیا، صرف میں شرح شافیہ، نحو میں شروح الفیہ اور مفصل الاشباہ والنظائر اور بعض قلمی متون اسفرائنی کا لب الالباب اور تسہیل الفوائد وغیرہ، الغرض فقہا اور منطقیین کی نحو سے نجات ملی کافیہ کے بعض غلط سلط مسائل نے ہم کو نحو سے بیزار کیا، مثلاً لا یضاف موصوف الی صفتہ ولا صفتہ الی موصوفہا و جامع الغربی و نحوہ شاذ حالانکہ پوری عربی زبان ان اضافتوں سے لبریز ہے، نیز بعض اس قسم کی چیزیں جن میں تاویلات کا دروازہ کھولا گیا ہے اور ناحق ایک متعلم نحو کو فضول کی کنج کاوی اور مدافعت یا حملہ کی مصیبت میں پھنسایا ہے ان کتابوں سے بدظن کر دیا کہ طالب علم کا مقصد اپنی عربیت کی اصلاح ہے نہ کسی شخص کی جنبہ داری۔

پھر مفصل اور کتاب سیبویہ کے مطالعہ نے ادب کی طرف متوجہ کیا۔ شواہد نحویہ کی تلاش نے ان دیوانوں اور ان کی شروح کی طرف پہونچایا، ادب کے سلسلہ میں معلوم یہ ہوا کہ ہم غلط راستہ کی طرف جا رہے ہیں، ہم کو مفردات یاد کرنے چاہئیں، اور مفردات سے بھی پہلے ضرورت ہے کہ ثلاثی مجرد کے ابواب یاد کئے جائیں یہ سب سے مشکل کام ہے اس لئے کہ اس میں قیاس کوئی مدد نہیں کرتا، اس کے بعد پھر مفردات لغویہ کو یاد کرنے کے لئے ان ان کتابوں پر نظر رہی اور یاد کیں کفایۃ المتحفظ، فقہ اللغۃ ثعالبی، الفاظ الکتابیہ

(ہمدانی)، نظام الغریب وغیرہ، اور اس سے آگے بڑھ کر اصلاح المنطق اور تہذیب الالفاظ وغیرہ وغیرہ کسی زمانہ میں معلقات عشر اور پانچ سات اور قصیدے جن کو عربی میں بہترین کہا جاتا ہے اور معلقات کے درجہ کے سمجھے جاتے ہیں ان کو یاد کیا، علاوہ بریں مجامع ادبیہ اور دواوین شعریہ جن کا بیشتر حصہ یاد کیا وہ حسب ذیل ہیں دیوان متنبی اور حماسہ (تقریباً مکمل حفظ) جمہرۃ اشعار العرب مفضلیات نوادر ابی زیدہ کامل مبرد کتاب البیان والتبین، ادب الکاتب مع اقتضاب۔

میں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند، ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم سے پڑھی ڈپٹی صاحب کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی، ان کو عربی نظم کا بہت عمدہ مذاق اور اس پر زبردست قدرت تھی مگر ان کی ادبی قابلیت، کچھ خداداد تھی، کتابوں کی رہین منت نہیں معلوم ہوتی تھی، وہ میرے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آتے، افسوس ہے کہ سقط الزند کے ایک شعر پر میری ان کی مفارقت ہوگئی سقط الزند میں تین شعر ہیں۔

وعلی الدھر من دماء الشہید — ین علی ونجلہ شاھدان

فھما فی اواخر اللیل فجرا — ن وفی اولیاتہ شفقان

ثبتا فی قمیصہ لیجیئ الحشـ — ـر مستعدیا الی الرحمٰن

ثبتا (تثنیہ مذکر غائب) کو ڈپٹی صاحب نے ثبتاً (مصدر) پڑھا میں نے کہا کہ یہ شعر نثر ہوگیا پھر میں نے تقطیع کرکے بتایا ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔

شعر می گویم بہ از آب حیات — من ندانم فاعلاتن فاعلات

میں نے کہا "لیکن من می دانم فاعلاتن فاعلات چہ کنم" یہ سنہ ۰۷-۱۹۰۶ء کی بات ہے پھر میں نے ڈپٹی صاحب کو تکلیف نہیں دی اگرچہ ان کی تواضع سے مجھے امید تھی کہ وہ مجھے استفادہ کا موقع دیں گے،

ڈپٹی صاحب مرحوم کو عربی نظم پر جو قدرت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ

سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں امیر حبیب اللہ خاں تشریف لانے والے تھے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے ایک عزیز صاحبزادہ ایف اے میں پڑھتے تھے اس وقت منتخب دیوان ابی العتاہیہ نصاب میں داخل تھا جس میں سے وہ قصیدہ امیر صاحب کے سامنے پڑھنے کے لئے انتخاب کیا گیا جس کا مطلع ہے۔

لاایذ هبن بلك الامسل　　حتی تقصر فی الاجسل

طالب علم نے کہا کہ میں یہ ابیات تین منٹ میں ختم کروں گا آپ کچھ اشعار کا اضافہ فرما دیجئے چنانچہ ڈپٹی صاحب نے یہ گرہ لگائی، اور حق یہ ہے کہ خوب لگائی۔

اللہ قدر فی الازل　　الا نجاۃ بلا عمل

النصر لیس بنا فعم　　والسیف قد سبق العذل

والمرء لیس یحالب　　والعیش امر محتمل

کن حیث شئت من السمو　　ل وفی البروج وفی الفلل

یدرکک موت فی المنا　　ن ولا یزیدک فی الاجل

لذات دنیا کلھا　　سم مشوب بالعسل

العمر فان فانجا　　والموت آت فاعجل

حتی متی تقلید الھوی　　والی متی تجلد ید الحیل

المبتلی بعلائق الدنیا　　حائر فی الوحل

ڈپٹی صاحب کی حاضر دماغی اور ادبیت کا اندازہ اس لطیفہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملے اتفاق سے عید کا دن تھا ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور وجہ حبیب والا مشہور شعر پڑھا۔

عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے اس شعر میں خاص نکتہ پیدا کر دیا اور امیر صاحب

بہت محظوظ ہوئے۔

اب میں بعض مشہور ادبی کتابوں کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتا ہوں،

میرے نزدیک الغریب المصنف ابن سلام اور اصلاح المنطق وہ کتابیں ہیں جن کا یاد ہونا ایک ادیب کے لئے نہایت ضروری ہے،

ہمارے ہاتھ میں اس وقت کوئی اتنی جامع کتاب نہیں ہے جس سے مصنف کو اتنے اعلیٰ آخذ ملے ہوں اور آپ نے ہر نحوی مسئلہ کے متعلق جس کا تعلق کسی بیت سے ہو، نیز شعر و شاعری کے متعلق قدیم ترین ماخذوں سے انتہائی محنت کے ساتھ اتنا ضروری مواد فراہم کردیا ہو جتنا کہ خزانۃ الادب میں ہے مصنف کو اولیں و آخریں نحویوں کے کلام پر اتنا عبور حاصل ہے اور اس کے پاس اتنا ذخیرہ موجود ہے جس کی مثال ہم کو نہیں ملتی، گویا ہنوز اس کے پیدا ہونے کا زمانہ نہیں آیا اس کو اکیسویں صدی میں پیدا ہونا چاہئے تھا،

حماسات میں انتخاب ابوتمام کا سب سے بہتر ہے لیکن ترتیب و تبویب اور گندگی سے پاک ہونے کے اعتبار سے بحتری کے حماسہ کو فوقیت ہے، نوادر کے اعتبار سے خود ابوتمام کا وحشیات جو الحماسۃ الصغریٰ کے نام سے مشہور ہے ممتاز ہے اور شعر و شاعری کی تنقید میں حماسۃ الخالدیین سے بہتر کوئی کتاب نہیں حماسۃ البصری اور حماسۃ مغربیہ بہت معمولی چیزیں ہیں اول الذکر قسطنطنیہ کے کتبخانہ میں ہے اور آخر الذکر حیدرآباد میں اور میرے پاس بھی اس کے دو نسخے ہیں،

نقد الشعر کے موضوع پر قراضۃ الذھب ابن رشیق اور رسالۃ الانتقاد لابن شرف حماسۃ الخالدیین، شرح المختار من اشعار بشار، ہر مضمون کے متعدد شعروں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین کتابیں ہیں اور بعض حیثیتیں جو نقد الشعر کی ہیں ان کے لئے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے، الموشح فی ماخذ العلماء علی الشعراء للمرزبانی بھی اچھی کتاب ہے، فہم شعر کے لئے لآلی بہترین کتاب ہے،

ابن خلدون نے جن کتابوں کو اصول فن ادب قرار دیا ہے ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ الکامل للمبرد ایک مبتدی کے لئے زیادہ مفید ہے، ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے، کتاب البیان والتبیین میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں اور نوادر لغت و شعر امالی لابی علی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔

قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط و موانع

از۔ ابوالحسن علی ندوی

قرآن مجید کی مخاطب پوری نوع انسان ہو لیکن جسطرح زمین کے مختلف قطعے اپنی صلاحیت کے مراتب اور اپنی پیاس اور پانی کی طلب کے درجہ کے اعتبار سے اور پھر اُس سے فائدہ اُٹھانیکی قوت کے لحاظ سے اس باران رحمت سے فائدہ اُٹھانے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اور جسطرح صالح سے صالح غذا مختلف انسانی معدوں میں جاکر مختلف اثر کرتی ہے اسی طرح قرآن مجید کا خطاب سب سے یکساں ہو لیکن اسکو قبول کرنے اور اس سے مستفید ہونیکی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی۔ چیز ایک ہو لیکن اسکے انسانی ظرف اور محل باہم متفاوت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اثر و نتائج کا یہ اختلاف قرآن میں خود بیان کیا ہے اور اسکے دو متضاد اثرات کو ساتھ ہی ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (اسراء)	اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن کو جو شفا اور رحمت ہو ایمان والوں کے لئے اور ظالموں کیلئے وہ خسران ہی کا باعث ہوگا
قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ	آپ کہہ دیجئے کہ وہ ایمان والوں کے لئے ہدایت اور شفا ہو، اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے انکے کانوں میں بوجھ ہو اور وہ ان کے لئے نابینائی اور گمراہی کا باعث ہے۔ ان کو دور سے آواز دی جا رہی ہے۔
وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا	اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو انہیں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسنے تم میں سے کس کے

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○ (توبہ ۱۶)

ایمان میں زیادتی کی؟ پس وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے ایمان میں تو زیادتی ہوئی اور وہی عنقریب خوش ہوں گے لیکن جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے ان کی خباثت ہی میں اضافہ ہوگا ... میں مریں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ○ (البقرہ ۲)

اللہ تعالیٰ کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ وہ کوئی مثال بیان کرے، مچھر کی یا اس سے بھی چھوٹی بیں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے اور کافر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مثال سے کیا مراد لی ہے؟ گمراہ کرتا ہے اس سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے بہتوں کو اور گمراہ صرف نافرمانوں ہی کو کرتا ہے۔

بعض آیات میں مومنین اور کفار پر قرآن مجید کے الگ الگ اثر کو بیان کیا ہے۔ مومنین کے متعلق

هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (البقرہ ۱)

یہ قرآن ہدایت ہے اہل تقویٰ کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور نماز کے پابند ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ

مسلمان تو صرف وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل کانپ جائیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں

زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُوْنَ (انفال ع۱)

ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے خدا ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا
مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ
جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ
اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ
مِنْ هَادٍ ۝

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جسکی آیتیں ایکدوسرے سے مشابہ ہیں اور جو بار بار دہرائی جاتی ہیں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس سے ان لوگوں کے جو اپنے خدا سے ڈرتے ہیں، پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے جسم اور دل اور وہ اللہ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جسے چاہتا ہے راہ راست پر لاتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے راہ راست پر لانیوالا کوئی نہیں۔

کا نزول کے متعلق۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ
يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (حج ع۹)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف اور واضح طریقہ پر پیش کی جاتی ہیں تو آپ کافروں کے چہروں پر برائی محسوس کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں جو ان کے سامنے ہماری آیتیں بیان کرتے ہیں۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ
اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (زمر ع۶)

اور جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل تنگ ہونے لگتے ہیں۔

وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُم مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (توبہ ۱۲۷)

اور جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگتے ہیں کہ تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہو، پھر چل دیتے ہیں، اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہو کیونکہ یہ بے سمجھ لوگ ہیں۔

لیکن قرآن مجید نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مومنین کی اس اثر پذیری اور نفع اندوزی اور کفار کی اس بے اثری اور گمراہی میں ترقی کے ذکر کے موقع پر مومنین اور منکرین کے کچھ متقابل اخلاق و صفات اور عقائد و اعمال کا بھی ذکر کیا ہو جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان متقابل اوصاف کو مختلف نتائج میں ضرور دخل ہو ان اوصاف کی روشنی میں ہم قرآن سے استفادہ کے شرائط اور قرآن سے استفادہ کے موانع مرتب کر سکتے ہیں اور یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کس قسم کے اخلاق اور کس قسم کی ذہنیت اور تربیت قرآن سے مناسبت رکھتی ہو اور اسکے سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کے لئے معاون ہو، اور کس قسم کی ذہنیت اور سیرت قرآن کی منافی ہو، اسکے لئے حجاب بنتی ہو اور اسکے متوقع اصلاحی اور انقلابی نتائج پیدا کرنے میں مزاحم ہے، اسکو مختلف عنوانوں کے ماتحت ذکر کیا جاتا ہے۔

وہ صفات جو قرآن کے فہم اور اس سے استفادہ کیلئے معاون ہیں

(۱) طلب، قرآن سے منتفع ہونیکی پہلی شرط یہ ہو کہ اسکی طلب پیدا ہو، جس کو سرے سے اس کی طلب نہیں اسکے لئے قرآن کیا مؤثر ہو سکتا ہو! اللہ کی سنت یہی ہو کہ وہ طلب پر دیتا ہو، اور طلب کی اسکے یہاں بڑی قیمت ہو۔ موجودہ حالت پر بے اطمینانی اور عدم قناعت، اصلاح حال کی کوشش اور راستہ کی تلاش، اسکے یہاں سعادت کا پہلا قدم ہو۔ پہلی چیز انابت ہو، دوسری چیز تغیر حال۔

ویھدی الیہ من اناب

اللہ لوگوں کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہو جو اس کی طرف رجوع ہوں۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم — بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں

دین میں استغنا اور بے نیازی محرومی اور بدبختی کی نشانی ہے۔

ومن یستغن فان اللہ غنی حمید — اور جو اللہ سے بے نیاز ہونا چاہیگا تو اللہ سب سے بڑھکر بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔

یا ایھا الناس انتم الفقرآء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید — اے لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی مستغنی اور لائق حمد ہے۔

جن لوگوں میں دین کی طلب نہیں اور دین کی صدا میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی ان کیلئے فرماتا ہے۔

افانت تسمع الصم ولو کانوا لا یعقلون — کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں خواہ وہ بے عقل ہوں

افانت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون — کیا آپ ہدایت دیسکتے ہیں گمراہوں کو اگرچہ وہ دیکھتے نہ ہوں

فانک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعآء اذا ولوا مدبرین وما انت بھٰد العمی عن ضلٰلتھم ان تسمع الا من یؤمن بایٰتنا فھم مسلمون — آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جن کے دل مردہ ہوچکے ہیں نہ آپ بہروں کو آواز سنا سکتے ہیں آپ انہیں لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ فرمانبردار ہیں

(۲) استماع و اتباع — قرآن بہرحال ایک صحیفہ اور ایک تعلیم ہے اس سے منتفع ہونیکا پہلا ذریعہ یہی ہے کہ اسکو غور سے سنے جو سرے سے کان لگا کر سنتا ہی نہیں اسکے بعد کے مراحل کیلئے کرے گا۔

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک — آپ بشارت دیدیجئے میرے ان بندوں کو جو کان لگا کر بات سنتے ہیں اور اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں

الذین ھدٰھم اللہ واولٰئک — یہی وہ لوگ ہیں جنکو اللہ نے ہدایت دی اور یہی
ھم اولوالالباب ۵ (زمر ع ۲) — صاحب عقل ہیں۔

لیکن صرف غور سے سن لینا کافی نہیں جو حصہ عمل کے قابل ہو اُسپر عمل کرنا ضروری ہو علم بلا عمل ایک دماغی تعیش ہو اسلئے استماع کے بعد اتباع کا ذکر کیا۔

(۳) **خوف** قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اور اسکے خوف پر ہو جس کا دل بالکل خدا کے خوف سے خالی ہو اور جس کے لئے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں اسمیں درحقیقت دین کا مادہ نہیں اور وہ گویا کہ دین کے حاسہ سے محروم ہو اور جب کسی کا کوئی حاسہ کم ہو تو اُسکے محسوسات کا وہ کسی طرح حس اور ادراک نہیں کرسکتا۔ قرآن نے اپنے کو اُن کے لئے مفید بتایا ہو جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہو اور ان کے خاکستر میں کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہو باقی جن کے دل کی انگیٹھیاں بالکل سرد ہوچکی ہیں وہ قرآن ٹھنڈے دل سے سنتے ہیں اور اُن میں کوئی گرمی نہیں پیدا ہوتی۔

فذکر بالقرآن من یخاف وعید (ق) — آپ نصیحت کیجئے ان لوگوں کو جو میری وعید سے ڈرتے ہیں

انما تنذر من اتبع الذکر — آپ اُنہیں کو ڈرا سکتے ہیں جو قرآن کی پیروی کریں
وخشی الرحمٰن بالغیب (یٰس) — اور خدا سے بن دیکھے خوف کریں۔

سیذکر من یخشیٰ (اعلیٰ) — عنقریب نصیحت حاصل کریں گے وہ لوگ جن کے دل میں خشیت الٰہی ہے۔

فویل للقاسیۃ قلوبھم — پس تباہی ہو ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کے
من ذکر اللہ (زمر) — ذکر کی طرف سے سخت ہوچکے ہیں۔

(۴) **ایمان بالغیب** دین کا ایک بہت بڑا اور اہم حصہ وہ ہو جو انسان کے حواس خمسہ اور اسکی عقل کے حدود دسترس سے باہر ہے۔ یہ دین کے وہ بہت سے حقائق ہیں، جن کا ادراک انسان اپنے حواس ظاہری سے

نہیں کرسکتا۔ نہ وہ چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں نہ چھوئی جاسکتی ہیں؛ نہ سونگھی جاسکتی ہیں اور نہ چکھی جاسکتی ہیں اور نہ اُنہیں عقل کام دےسکتی ہو، اسلئے کہ عقل کا کام صرف یہ ہو کہ وہ محسوسات اور معلومات اور تجربات کے ذریعہ غیر محسوس اور غیر معلوم چیزوں کا علم حاصل کرے جن چیزوں کا علم حواس اور تجربات کے ذریعہ سے ممکن نہ ہو، اس کے مبادی تک حاصل نہ ہوں، اور وہاں قیاس کی بنیاد سرے سے موجود نہ ہو، وہاں عقل کیا کام دےسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفات وحی، فرشتے، آخرت، جنت اور دوزخ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو خلاف عقل نہیں، لیکن ورائے عقل ضرور ہیں۔ یہ سب غیب میں شامل ہیں جس کے لئے انبیاؑ پر اعتماد کرنا، اور جو کچھ وہ کہیں اُسکو قبول کرنا، یہی ایمان بالغیب ہو۔ جو لوگ اپنے یقین اور اعتقاد کے لئے مادیات اور محسوسات کے پابند ہیں اور جو چیز ان کے عقل و قیاس میں نہ آئے ان کا انکار کردیتے ہیں وہ حقیقت میں دین کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ اُن کے لئے دین کی سرحد میں داخل ہونا ہی مشکل ہو۔ وہ قرآن سے منتفع نہیں ہوسکتے اور ان کے لئے قرآن مجید میں قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ مگر جو لوگ حواس پرست نہیں ہیں اور ممکنات کے دائرہ کو وسیع سمجھتے ہیں، موجودات اور محسوسات میں محصور نہیں سمجھتے، دین کی حقیقت سے آشنا ہیں صحیح اور قطعی علم کا سرچشمہ ان کے لئے صرف وحی الٰہی ہو۔ وہ انبیاؑ کی اطلاع اور تعلیم پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہیں، اُن کیلئے کوئی مشکل مشکل نہیں، دین پورا اُن کے لئے ایک مفہوم حقیقت ہو، اور قرآن اُن کے لئے سراپا ہدایت ہو۔

ھدیً للمتقین الذین یؤمنون بالغیب (البقرہ)	یہ قرآن ہدایت ہو پرہیزگاروں کیلئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں
فاما الذین آمنوا فیعلمون انہ الحق	پس وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ
من ربھم واما الذین کفروا فیقولون	حق ہو ان کے پروردگار کی طرف سے اور کافر کہتے ہیں کہ
ماذا اراد اللہ بھذا مثلا یضل بہ	اس مثال سے اللہ کی کیا مراد ہو؛ بہتوں کو اسکے
کثیرا ویھدی بہ کثیرا وما یضل	ذریعہ گمراہ کرتا ہو اور بہتوں کو ہدایت دیتا اور گمراہ
بہ الا الفسقین (البقرہ)	صرف نافرمانوں ہی کو کرتا ہے

وہ لوگ جن پر مادیت اور حسیت پوری طور پر طاری ہوتی ہو اور ایمان بالغیب کے بغیر دین کے اور عقل حقائق کی گرہ کشائی کی کوشش کرتے ہیں، اُن کی کوشش اُس شخص کی طرح ہوتی ہو جو بغیر کسی زینہ کے بلندی کی طرف جانا چاہے یا بغیر پر اور بازو کے اُڑنا چاہے۔ وہ جسقدر اوپر جانیکی کوشش کرتا ہو اسکی مادیت اور کثافت اسکو نیچے کی طرف لاتی ہو اور اسکا حال وہ ہوتا ہو جو قرآن مجید نے اپنے بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء کذالک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون (انعام)

جس کو اللہ ہدایت دینا چاہتا ہو اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہو اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اسکا سینہ تنگ بنا دیتا ہو گویا کہ وہ آسمان میں اڑا جارہا ہے اسی طرح اللہ خباثت میں ڈال دیتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان نہیں لاتے۔

(۵) تدبر قرآن سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تدبر بھی شرط ہو۔ قرآن نے جابجا تدبر کی ترغیب دی ہو اور مومنین کی تعریف کی ہو جو قرآن مجید کو سوچ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اُس پر اندھے بہرے ہوکر نہیں گرتے۔

والذین اذا ذکروا بایٰت ربھم لم یخروا علیھا صُمًّا وعمیانا (الفرقان)

اور وہ لوگ کہ جب اُن کو اللہ کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ اُن پر بہرے اور اندھے ہوکر نہیں گرتے۔

افلا یتدبرون القراٰن ام علی قلوب اقفالھا (محمد)

یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے، کیا ان کے دل بند ہو چکے ہیں؟

افلا یتدبرون القراٰن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً

یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو ان کو اس میں بہت بڑا اختلاف ملتا۔

(۶) مجاہدہ　　قرآن کے فہم اور تدبر میں اور اُسپر عمل کرنے میں مجاہدہ اور مشقت بہت مفید ہو۔ قرآن ان انسانی کتابوں میں سے نہیں ہو جنکے مضامین کا احاطہ اور ان کے مصنفین کا مقصد آدمی محض اپنی ذہانت یا علم کی بنا پر معلوم کرلیتا ہو، اللہ کا منشا معلوم کرنے کے لئے اللہ کی رضا اور اعانت کی ضرورت ہو۔ جب انسان اسکے لئے تکلیف اُٹھاتا ہو، طہارت اخلاق، تزکیۂ نفس سے کام لیتا ہو تو اللہ کی رحمت بھی اسکی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اللہ اپنی کتاب کے لئے اسکا سینہ کھول دیتا ہو اور اسکو فہم عطا کرتا ہو۔ قرآن چونکہ نہایت لطیف چیز ہے اسلئے جسقدر انسان کی مادی کثافت کم ہوتی ہو اُسی قدر قرآن سے مناسبت پیدا ہوتی ہے اور قرآن کا جمال اسکو بے نقاب نظر آتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہو کہ جب کوئی انسان کسی مقصد کے لئے تکلیفیں اُٹھاتا ہو اور قربانیاں کرتا ہو تو اسکی کیفیتیں اُسکے اوپر پوری طرح طاری ہوجاتی ہیں اور اسکو صحیح لذت و حلاوت ملتی ہے۔

تیسرے یہ کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ عملی ہے وہ محض نظری طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا، الفاظ و معانی کا علم تو حاصل ہوسکتا ہو لیکن صحیح تحقیق اور مشاہدہ، عمل اور کافی تجربہ کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرامؓ کے فہم قرآن کا یہی ایک امتیاز تھا۔

قرآن سے استفادہ کے موانع

قرآن سے استفادہ اور ہدایت کے موانع کو قرآن نے کفار کی محرومی کے تذکرہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ قرآن سے فائدہ اُٹھانے اور اسکے روحانی و اعتقادی انقلاب و اصلاح کے راستہ میں یہ اخلاق و اعتقادات سخت مزاحم ہیں۔ کفار کے علاوہ اگر مسلمانوں میں بھی یہ موانع پائے جائیں گے تو قرآن مجید سے فائدہ اُٹھانے میں حائل ہوں گے۔

(۱) تکبر　　انبیاء کرام کی تعلیم کو قبول کرنے اور انکی غلامی کی سعادت سے محرومی کا بڑا سبب اکثر تکبر، جھوٹی عزتِ نفس اور خودداری کا جاہلی جذبہ ہوتا ہو، کبھی یہ انکار اور استکبار براہِ راست قبول حق سے ہوتا ہے، کیونکہ

اسکی وجہ سے اپنے جاہ واقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا ہو جاہلی عادات و رسوم چھوڑنے پڑتے ہیں. بہت سے فوائد سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہو، آزادی اور خودسری کی زندگی کے بجائے پابندی اور قانون کی زندگی گزارنی پڑتی ہو. بہت سے لوگوں پر یہ انقلاب حال بہت شاق گزرتا ہو اور ان کا تکبر قرآن کے انکار پر ان کو آمادہ کرتا ہے۔ مندرجۂ ذیل آیات میں انھیں کا تذکرہ ہے۔

سأصرف عن آیتی الذین یتکبرون	میں عنقریب اپنی آیتوں سے ان لوگوں کے دل
فی الارض بغیر الحق وان یروا	پھیردوں گا جو بغیر حق کے زمین میں تکبر کیا کرتے ہیں اور
کل آیۃ لا یومنوا بہا وان	اگر وہ تمام معجزات دیکھ لیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے.
یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ	اور اگر یہ بھلائی کی راہ دیکھتے ہیں تو اسے اپنا راستہ
سبیلاً وان یروا سبیل الغی	نہیں بناتے اور برائی کی راہ دیکھتے ہیں تو اسے اپنا راستہ
یتخذوہ سبیلا ذلک بانہم	بنا لیتے ہیں اسکی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے ہماری آیتوں
کذبوا بآیتنا وکانوا عنہا غافلین (مومن)	کی تکذیب کی اور ان سے غافل رہے.
ویل لکل افاک اثیم یسمع	ہلاکت ہو ہر بہتان تراش اور گنہگار کے لئے.
آیت اللہ تتلی علیہ ثم یصر	جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے پھر تکبر کرنے لگتا ہے گویا کہ
مستکبرًا کان لم یسمعہا فبشرہ	اس نے سنا ہی نہیں آپ اسے بشارت دیدیجئے دردناک
بعذاب الیم (جاثیہ)	عذاب کی۔
ثم ادبر واستکبر فقال ان ہذا الا سحر	پھر اس نے پیٹھ پھیری اور تکبر کیا پھر کہا کہ یہ تو ایک
یوثر ان ہذا الا قول البشر (مدثر ۱۲)	جادو ہے جو چلا آرہا ہے اور یہ تو انسان ہی کا قول ہو.

کبھی پیغمبر کی ظاہری حالت اور غربت کو دیکھکر وہ اُسکے پیغام اور تعلیم سے انکار و استکبار کرتے ہیں اور اسکی پیروی میں اپنی اہانت محسوس کرتے ہیں. فرعون نے کہا تھا۔

ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین فلولا القی علیہ اسورۃ من ذھب او جاء معہ الملائکۃ مقترنین (زخرف)

کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور اچھی طرح بات بھی نہیں کرسکتا؟ پس کیوں نہ اُن پر سونے کے زیور اُتار دیے گئے یا ان کے ساتھ بہت سے فرشتے بھیج دیے جاتے۔

وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم (زخرف ع ۳)

اور ان کافروں نے کہا کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔

کبھی محض انکی بشریت ان کے لئے عذر بنجاتی ہے۔

ذالک بانہ کانت تاتیھم رسلھم بالبینٰت فقالوا ابشر یھدوننا فکفروا وتولوا واستغنی اللہ واللہ غنی حمید (تغابن ۱۲)

یہ اسلئے کہ ان کے پاس پیغمبر معجزات لیکر آتے تھے انھوں نے کہا کہ کیا کوئی انسان ہمیں ہدایت دیگا؟ پس اُنھوں نے کفر کیا اور روگردانی کی اور اللہ بے نیاز تھا ان سے بیشک وہ بے نیاز اور قابل ستائش ہے

وقالوا مال ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرا (فرقان ۱۶)

اور ان کافروں نے کہا پیغمبر کیسا ہے جو کھانا کھاتا ہو اور بازاروں میں چلتا ہے کیوں نہ اسکے ساتھ کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو لوگوں کو ڈرایا کرتا۔

کبھی رسول کے پیرووں کی معاشی پستی ان کے پیشوں کی حقارت انکی کم نسبی کا وہ عذر کرتے ہیں۔ اور جماعت میں شرکت کے لئے اُسی کو مانع بنالیتے ہیں۔

قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون

انھوں نے کہا کہ کیا ہم تم پر ایمان لائیں، حالانکہ تمہاری پیروی صرف ادنیٰ لوگوں نے کی ہے۔

فقال الملا الذین کفروا من قومہ

انکی قوم کے کافروں کی ایک جماعت نے کہا کہ ہم تو

ما نراك الا بشرا مثلنا وما نراك	تم کو اپنے ہی جیسا ایک انسان دیکھتے ہیں اور تمہاری
اتبعك الا الذين هم اراذلنا	پیروی بھی انہی لوگوں نے کی ہو جو ہم میں پست درجہ کے
بادی الرای وما نری لکم علینا	لوگ ہیں اور ہمارے خیال میں تمکو ہمپر کوئی فضیلت بھی نہیں
من فضل بل نظنكم كاذبين (ہود ع ۳)	بلکہ ہم تو تم کو نرا جھوٹا سمجھتے ہیں۔

کبھی یہ رُکاوٹ اس بنا پر ہوتی ہو کہ ان لوگوں نے اپنی دُنیاوی اقبالمندی اور قسمت کی یاوری کی وجہ سے یہ فرض کر لیا ہوتا ہو کہ دنیا میں ہر اچھی چیز کے مستحق ہم ہیں اور وہ چیز خیر ہی نہیں ہو جو پہلے ہمکو نہ ملے۔

وقال الذين كفروا للذين آمنوا	اور کافروں نے ایمان والوں کے متعلق کہا کہ اگر کوئی
لو كان خيرا ما سبقونا اليه واذ لم	بھلائی ہوتی تو یہ ہمپر سبقت نہ کر پاتے اور چونکہ انکو اس سے
يهتدوا به فسيقولون هذا افك	ہدایت نہیں حاصل ہوئی اسلئے وہ کہیں گے کہ یہ تو پُرانا
قديم (احقاف ۱)	بہتان ہے۔

یہی اسباب ہیں جنکی بنا پر بستی کے آسودہ حال اور فارغ البال لوگ انبیاؑ کی تکذیب اور ان کی دعوت و تحریک کی مخالفت میں سب سے پیش قدمی اور تیز دستی کرتے ہیں۔

وما ارسلنا فی قریة من نذير	اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسُول بھیجا وہاں کے
الا قال مترفوها انا بما ارسلتم	آسودہ حال لوگوں نے کہا کہ ہم تو تمہاری رسالت کے
به كافرون (اعراف)	منکر ہیں۔
وكذلك جعلنا فی كل قرية اكابر	اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے بڑے لوگوں کو
مجرميها ليمكروا فيها (انعام)	پاپی بنایا تاکہ وہ فتنہ پردازی کرتے رہیں۔

بہرحال تکبر خواہ اسکی وجہ کچھ ہو اور اسکے مظاہر کتنے ہی مختلف ہوں قرآن مجید سے کمل فائدہ اُٹھانے میں سخت مزاحم ہوتا ہو قرآن مجید کی تعلیم قبول کرنے میں اُسکو اپنے نفس پر جاری کرتے میں لوا

اسکو اپنی زندگی کے معاملات میں حکم بنانے کے لئے اور انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے تو اضع تسلیم و رضا اور ایثار کی ضرورت ہو۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (نساء ع ۹)

قسم ہے آپکے پروردگار کی کہ یہ لوگ اسوقت تک مومن نہیں ہوسکتے جبتک آپکو اپنے تمام تنازعات میں حکم نہ مان لیں اور اپنے دلوں میں آپکے فیصلے سے کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور بالکل فرمانبردار ہوجائیں۔

(۲) مجادلہ قرآن مجید کے بارے میں بغیر کسی روشنی کے بحث و مباحثہ کرنا اسکو اپنی لسانی لفاظی سے مغلوب کرنیکی کوشش کرنا اسکے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا قرآن کی ہدایت سے محروم رکھتا ہو اور سینہ کے چھپے ہوئے تکبر کا پتہ دیتا ہو۔

ان الذین یجادلون فی آیت اللہ بغیر سلطن اتٰھم ان فی صدورھم الا کبر ما ھم ببالغیہ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع البصیر ٥

بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی دلیل کے جھگڑا کیا کرتے ہیں ان کے دلوں میں کبر ہے اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ پس اللہ سے پناہ مانگئے وہی سمیع و بصیر ہے۔

والذین سعوا فی آیتنا معٰجزین اولئک لھم عذاب من رجز الیم ٥

اور جو لوگ ہماری آیتوں میں ہرانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہو۔

الذین یجادلون فی ایت اللہ بغیر سلطن اتٰھم کبر مقتا عند اللہ و عند الذین اٰمنوا کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار (مومن ع ۴)

جو لوگ اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی حجت کے جو انہیں ملی ہو جدال کرتے ہیں یہ چیز اللہ اور ایمان والوں کے نزدیک بہت مبغوض ہے اسی طرح اللہ ہر سرکش اور متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

وکذلک جعلنا لکل نبی عدوًا شیاطین — اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لئے جن و انس کے
الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض — شیطانوں میں سے دشمن بنائے جو ایک دوسرے
زخرف القول غرورا — سے دھوکہ دینے کے لئے ملمع باتیں کیا کرتے ہیں۔

(۴) انکارِ آخرت و دنیا پرستی عقائد کفر میں سے آخرت کا انکار قرآن سے متاثر ہونے اور اس سے فائدہ اُٹھانے سے بہت مانع ہوتا ہے، اسلئے کہ قرآن مجید کی ترغیب و ترہیب اور وعظ و اصلاح کی اساس اہم نبأ و آخرت ہے، وہ آخرت سے ڈراتا ہے، آخرت کے ثواب کی اُمید دلاتا ہے، اور اس اہم سفر کے تمام ضروری معلومات اور اسکی پیش آنیوالی منزلوں کو صحیح اطلاع اور ضروری ہدایت دیتا ہے، اسلئے جو لوگ آخرت کے متوقع ہیں وہ قرآن مجید سے کسی حال میں مستغنی نہیں ہو سکتے، اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

والذین یؤمنون بالآخرۃ یؤمنون — اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی
بہ وھم علیٰ صلاتھم یحافظون (انعام ۱۱) — ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنی نماز کے محافظ ہیں۔

لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں، یا عقیدۃً منکر نہیں ہیں مگر عملاً اُن پر دنیا پرستی اور دنیا غالب ہو اور زندگی کے تمام مسائل میں ان کا نقطۂ نظر بالکل مادی ہو، ان کے لئے قرآن بے اثر یا کم اثر ہے۔

واذا قرأت القرآن جعلنا بینک وبین الذین — اور جب آپ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ہم آپ کے
لا یؤمنون بالآخرۃ حجابًا مستورًا — اور منکرین آخرت کے درمیان ایک حجاب قائم کر دیتے ہیں
وجعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ — اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے کہ وہ اسے
وفی اذانھم وقرًا واذا ذکرت — سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ایک بوجھ ڈال دیا
ربک فی القرآن وحدہ ولّوا علیٰ — اور جب آپ قرآن میں توحید کے ساتھ اپنے خدا کا
ادبارھم نفورا — ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہیں۔

ان الذین لا یؤمنون بالآخرۃ — بیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اللہ

لا یهدیهم الله ولهم عذاب الیم
فالذین لا یؤمنون بالآخرة قلوبهم
منکرة وهم مستکبرون
فاعرض عن من تولی عن ذکرنا
ولم یرد الا الحیوة الدنیا ذلک
مبلغهم من العلم ان ربک هو
اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم
بمن اهتدی (النجم ع ۲)

انھیں ہدایت نہیں دیتا اور انکے لئے دردناک عذاب ہو.
جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل منکر
ہیں اور انہیں تکبر ہے.
آپ اپنی توجہ ان لوگوں سے ہٹا لیجئے جنھوں نے
ہمارے ذکر سے توجہ ہٹا لی ہے اور انھیں صرف
دنیا ہی زندگی کی طلب ہو یہ انکی مقدار علم ہو بیشک آپکا
خدا ان لوگوں سے خوب واقف ہو جو اسکی راہ سے بہک
گئے ہیں اور وہی ان لوگوں سے بھی واقف ہو جو اسکی راہ پر ہیں

مادیت کا غلبہ انہیں ایسی بلادت اور غباوت پیدا کر دیتا ہو کہ غیر مادی چیزوں کے بارہ میں ان کا دماغ کام ہی نہیں کر سکتا. اور وہ ان چیزوں کا انکار کر دیتے ہیں.

ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا
بالحیوة الدنیا واطمانوا بها
والذین هم عن آیاتنا غافلون (یونس ع ۱)

جو لوگ ہم سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے اور انھوں نے
دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا اور اسی پر مطمئن
ہو گئے وہ ہماری آیتوں سے غافل ہو گئے ہیں.

بل ادارک علمهم فی الآخرة بل
هم فی شک منها بل
هم منها عمون

بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم تھک کر رہ گیا ہے
اور وہ اسکی طرف سے شبہ میں ہیں بلکہ وہ اسکی طرف
سے اندھے ہیں.

ایک چیز جو کفار سے مخصوص نہیں وہ قرآن کی آیات متشابہات سے اپنے اغراض کے لئے استدلال کرنا اور لوگوں کو تحریف اور غلط تاویل سے گمراہ کرنا جس کا سبب دلوں کی کجی اور بدنیتی ہو

منه آيت محكمت هن ام الكتاب
واخر متشابهت فاما الذين في
قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه
ابتغاء الفتنة وابتغاء تاويله (آل عمران)

کچھ آیتیں محکمات ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ
ہیں بس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہو وہ متشابہات
کی ٹوہ میں لگ جاتے ہیں فتنہ کے لئے اور ان کی حقیقت
جاننے کے لئے۔

عربی زبان کے طریق تعلیم پر ایک ماہر فن کی رائے

ترجمہ

از مولوی عبداللہ صاحب پھلواروی معلم دارالعلوم ندوۃ العلماء

"الضیاء" مرحوم میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاذ ادب مولانا تقی الدین الہلالی مراکشی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے زبان کی تعلیم پر اپنا خاص نظریہ پیش کیا تھا استاذ تقی الدین الہلالی عربی کے ممتاز ادیب اور زبان کے تجربہ کار معلم تھے جن کی قابلیت کا اعتراف ممالک عربیہ میں بھی کیا جاتا ہے ان کو عربی زبان کی تعلیم کا وسیع اور عملی تجربہ تھا، امید ہے کہ عربی مدارس کے حلقہ میں اس مسئلہ پر ان کے خیالات توجہ اور غور سے پڑھے جائیں گے۔ (مدیر)

عربی ہی زبان پر منحصر نہیں بلکہ ہر اجنبی زبان انگریزی ہو یا جرمنی، ترکی ہو یا ایرانی جو بھی ہو اسکے سیکھنے کا صحیح اصول کیا ہے، ایک تو طریقہ مروجہ ہے یعنی پہلے صرف و نحو کی مکمل تعلیم اور اس کے بعد بتدریج ادب کی دوسری کتابیں ترجمہ کے ساتھ، لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ زبان کی تعلیم کے لئے یہ طریقہ مفید نہیں، مفید ہی نہیں بلکہ بے فائدہ اور نقصان رساں ہے، طالب علم اس طریقہ پر ادب کی انتہائی کتابیں پڑھ جاتا ہے لیکن جیسی کہ چاہئے صلاحیت مفقود ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ چند صحیح جملے بولنے یا چند سطریں لکھنے پر بھی قادر نہیں ہوتے، یہ افسوسناک نتائج اسی بے اصول تعلیم کا نتیجہ ہیں، جو ہمارے عربی مدارس میں (خصوصاً) رائج ہے، ورنہ آج ہمارے پیش نظر انگریزی مدارس ہیں جہاں انگریزی لٹریچر نے کافی ترقی کی اور وہاں ابتدائی درجوں ہی سے یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ طالب علم لکھ بول سکے،

اب سوال یہ ہے کہ وہ صحیح اصول کیا ہے جس سے طالب علم کم وقت میں ایک اجنبی زبان سمجھ اور بول سکے، یا محنت کر کے اس زبان کا ادیب بن سکے، ــــ ؟ جواب یہ ہے کہ زبان کی تعلیم کا طریقہ فطری ہونا چاہئے، اور اس میں ترجمہ کی مدد بالکل نہ لی جائے مثلاً اگر عربی زبان سکھانا ہے تو مبتدی کو عربی ہی میں بولنے

اور سننے کا موقع دیا جائے۔ پڑھاتے وقت رفتہ رفتہ ایک لفظ بھی اردو یا فارسی کا نہ آئے،

بعض لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی بلکہ اکثر حضرات تصور بھی شاید نہ کر سکیں کہ اجنبی زبان کی تعلیم میں ترجمہ کے بغیر کیونکر چارہ کار ہے، لیکن اگر ہماری ان دلیلوں پر غور کیا جائے تو شاید مسئلہ بہت جلد واضح ہو جائے۔ فطری طریقۂ تعلیم یہی ہے کہ زبان بغیر کسی دوسری لغت کی مدد کے حاصل کی جائے۔ چنانچہ بچہ ایام رضاعت ہی سے افہام و تفہیم کے لئے جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ مادری ہوتے ہیں، جو بلا واسطہ کسی زبان کے اپنی ماں سے سیکھتا ہے، اگر اس کے علاوہ کوئی سہل طریقہ اقرب وقت میں ممکن ہوتا تو وہ بھی یقیناً ذریعۂ فطرت ہوتا یا ارباب حل و عقد ایجاد کرتے۔

(۳) یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ طریقہ صرف بچوں ہی کے لئے فطری طریقہ ہے ورنہ وہ لوگ جن کی مادری زبان پہلے سے کچھ اور ہے ان کے لئے بلا ترجمہ کسی زبان کا حاصل کرنا عبث ہے، اس کے جواب میں ہم ان لوگوں کی مثال پیش کریں گے، جو ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں پھر تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں کی زبان بلا واسطہ کسی لغت کے حاصل کر لیتے ہیں اور بسا اوقات اس زبان کے ادیب بن جاتے ہیں۔ حضرت بلالؓ صہیبؓ سلمانؓ رضی اللہ عنہم عجمی ہی تو تھے لیکن ان کی زبان آج ہمارے لئے معیار ہے، حالانکہ انھوں نے عربی کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے نہیں سیکھا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی انسان کسی حرف کے ادا کرنے سے قاصر ہو جیسے حضرت بلالؓ شین کے بجائے سین کہتے تھے اور اذان میں اسھد کہتے جس کے متعلق حدیث مرفوع میں ہے سین بلال عند اللہ شین، تو یہ بات انکی عجمیت کی وجہ سے نہ تھی ــــ انھیں پر کیا موقوف واصل بن عطا مشہور شاعر و مقرر تھا جس کا خطبہ بے را مشہور ہے جو ر، راء کا تلفظ نہیں ادا کر سکتا تھا، حالانکہ اس کی مادری زبان عربی ہی تھی، اسی طرح مراکش میں ایک شخص تھا جو راء تلفظ ادا کرنے سے قاصر تھا اس سے کسی نے کہا کہ یہ کہو:۔ امرك الامیر ان تحفر بئرا فی الطریق المراکشی لیشرب منہ الراکب علی فرسہ وغیرہ۔

اس نے فی البدیہ کہا ۔ اذن الملک ان تبتدع حیاتی المعاجم العباسی یستقی منہ الجائز علی جوادہ و من سواہ ،

(۳) ترجمہ کرتے وقت مفہوم کے بجائے الفاظ کا ترجمہ ذہن میں آتا ہے۔ اور یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ اس میں دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات چند مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو جہل تہتک کے مرادف ہیں مثلاً کسی نے "اس سے کہو" کا ترجمہ کرانا چاہا تو پہلے وہ "اس سے" کا ترجمہ " منہ "کہو" کا ترجمہ " قل "یوں پورا جملہ قل منہ کے بجائے قل منہ ہوا اور اسی بنا پر سلہ کے بجائے سال منہ اور راعرفنک کے بجائے انا انت بعرف ترجمہ کر دیا جاتا ہے پھر اس سے بھی دو قدم آگے بڑھئے تو فی ۔ الصدیق وفعلت الوضوع کی مثال سامنے آجائے گی ، افسوس تو یہ ہے کہ ایسی فاش غلطیاں طلبہ کی کاپیوں پر ہی نہیں بلکہ علماء درس و تدریس کے یہاں بھی نظر آئیں گی ۔

(۴) اسی طرح ترجمہ کرتے وقت طلبہ پر عربی کی ترکیبیں بہت گراں گزرتی ہیں اور اس کا سبب بھی یہی ہے کہ طالب علم چاہتا ہے کہ ترکیب بالکل اسی طرح ہو جس طرح اردو یا فارسی میں ہے مثلاً "میں نے تم کو دیکھا" کے ترجمہ کے لئے میں نے انا تم کو ایاک ، دیکھا رائی) ان سب الفاظ کا جملہ میں استعمال ضروری معلوم ہوگا۔ حالانکہ ترجمہ اس کا صرف رائیک ہوگا ، اگرچہ یہ آسان ترین ترکیب ہے لیکن طالب علم اس کو مغلق سمجھے گا۔ اور اس سے الجھن پیدا ہونا لازمی ہے ، کیا یہ تعلیم بالترجمہ کا نقصان نہیں ہے ؟

(۵) بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا صحیح ترجمہ جو پورے مفہوم کو ادا کرے اردو میں نہیں ہے مثلاً اِن ، اَن بلی ، کلا ، الا ، ھلا ، لبیک ۔ واضح رہے کہ ان کا ترجمہ جو کیا جاتا ہے وہ پورے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے ،

(۶) طلبہ کا بہت سا وقت لغت و معاجم کی تلاش و جستجو میں بے کار صرف ہوتا ہے چنانچہ جب انھوں نے کوئی لفظ سمجھنے کے لئے لغت کی طرف مراجعت کی ، وہاں ان کو ایک لفظ کے کئی معنی نظر آئے ، پھر کافی دیر سرگرداں

ہنے پر بھی شاید ہی وہ اپنے معنی مراد تک پہونچ سکیں اور اس میں عجیب عجیب الجھنیں ہوتی ہیں جن کو طلبہ ہی جانتے ہیں مثلاً العیلی کا ترجمہ النبع الجاری، العریف، النقل ین، الجارحہ

(۷) دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی عمریں عربی علوم پر صرف کر دیتے ہیں اگر ان کو بوقت ضرورت کوئی مختصر عربی تحریر یا گفتگو کرنا ہو تو ایک عجیب الجھن اور ایک خاص پریشانی محسوس کرتے ہیں، اور جہاں اس سے فرصت پائی تو گویا انھوں نے ایک مہم سر کرلی یا کسی بڑی مصیبت سے نجات حاصل کرلی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس کو ایک غیر طبعی امر سمجھتے ہیں اور بلاشبہ تعلیم بالترجمہ جیسے غیر فطری طریقہ تعلیم کا لازماً یہی اثر ہوگا۔

(۸) زبان کی تعلیم کا یہی طریقہ ابتدائے تعلیم سے ہونا چاہئے، ورنہ جنھوں نے کچھ عرصہ تک کچھ کتابیں ترجمہ کرکے پڑھی ہیں نہ ان کی زبان اس نحت پر ٹوٹے گی نہ ان کا قلم رواں ہوگا، جیسا کہ ایک طبعی زباندان کیلئے ہونا چاہئے

اگر کسی نے دو سال تک کچھ کتابیں ترجمہ کی مدد سے پڑھی ہیں، اور اس کے بعد صحیح نہج پر تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اس میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں گی، اس لئے کہ اکثر الفاظ کے تراجم اس کے ذہن نشین ہونگے اور بھی بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہونے کا سبب ہوگا۔ اس لئے ابتدائے درس ہی سے تعلیم کا طریقہ درست ہونا چاہئے۔ (خشت اول چوں نہد معمار کج، تا ثریا می رود دیوار کج۔ مترجم)

(۹) ترجمہ کا سب سے بڑا نقصان تضیع اوقات ہے اس کے علاوہ طالب العلم کو جو الجھن اس سے پیدا ہوتی ہے وہ اسے یہ سمجھنے پر مجبور کرتی ہے کہ زبان بہت ہی دشوار اور ثقیل ترین ہے، اور یہ اعتقاد جازم تحصیل علم کے لئے کہاں تک مفید ہوسکتا ہے ظاہر ہے۔ یہی سبب ہے کہ علمائے ادب نے اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد جو تجربہ حاصل کیا وہ یہ ہے کہ زبان کی تعلیم کا دارو مدار صرف سماعت و تکلم پر ہے جس سے آسان اور کم وقت کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

(۱۰) یہ صرف خیال ہی نہیں بلکہ آج دوسری ترقی یافتہ زبانیں اسی طرح پھیلی ہیں۔ زبان کی تعلیم کا یہ ناقص طریقہ صرف ہندوستان کے لئے مخصوص ہے۔

حالات ندوہ

دارالعلوم کو کھلے ہوئے بیس پچیس دن ہوگئے ہیں تمام شعبے پوری سرگرمی سے کام کر رہے ہیں مہتمم صاحب دارالعلوم کی رہنمائی میں اساتذہ اور نگران ہائے دارالاقامہ تعلیم و تربیت کی جانب خاص توجہ کر رہے ہیں سابق تیزی سے ہو رہے ہیں طلبہ کا معیار بلند کرنے کے لئے بعض اہم اصلاحات عمل میں آرہی ہیں جن سے مستقبل میں بہترین نتائج کی توقع ہے۔

اس مرتبہ مدرسین کی جماعت میں مولانا حمید الدین صاحب کا اضافہ ہوا ہے آپ کو فن حدیث سے خاص ذوق ہے حضرت مولانا انور شاہ مرحوم سے تلمذ کی نسبت ہے عرصے سے مدرسۂ نور العلوم بہرائچ میں حدیث و تفسیر کی اعلیٰ کتابوں کا درس دیتے تھے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی نظر دوربیں نے آپ کو ندوہ کے لئے منتخب فرمایا شروع شوال سے آپ یہاں آگئے ہیں اور حدیث و تفسیر کی کتابوں کا درس دے رہے ہیں۔

سال کے آغاز میں حسب دستور مجلس نقبا کا نیا انتخاب ہوا اس مرتبہ حسب ذیل طلبہ اس خدمت کیلئے منتخب ہوئے ہیں۔

نقیب عام	نجم الدین برمی	نقیب صحت	محمد منظور، خالد، عبدالسلام کوہاٹی
نقیب شرقی	عبداللہ پھلواروی	نقیب تعلیم	ابوالعرفان، صدرالدین
نقیب غربی	معین اللہ	نقیب صلوٰۃ	مجیب اللہ، اجمل راندھیری

---

۸ نومبر کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن اور مولانا صبغۃ اللہ بختیاری استاذ تفسیر

دار السلام عمر آباد و مدارس لکھنؤ تشریف لائے کئی دن دار العلوم میں قیام رہا شہر میں متعدد تقریروں کے علاوہ "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی یونین میں ایک مدلل و مؤثر مقالہ پڑھا ۱۰ نومبر کو مولانا ابوالحسن علی کی صدارت میں طلباء دار العلوم کی انجمن الاصلاح کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں متعلقین ندوہ کے علاوہ معززین شہر کی بھی بہت کافی تعداد موجود تھی اس موقع پر مودودی صاحب نے اسلامی نظام جماعت کی ضرورت و اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا آخر میں علی صاحب نے زمانہ کے انقلاب انگیز حالات کی طرف اشارہ کیا اور مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلائے اور کہا

معمار حرم باز بہ تعمیر حرم خیز — از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

---

۱۱ نومبر کو الگزنڈرا ہائی اسکول بھوپال اور ندوہ کی ٹیم کے درمیان ایک فٹ بال میچ ہوا طرفین کی جانب سے مقابلہ میں نہایت مستعدی اور جانفشانی سے کام لیا گیا لیکن ندوہ ٹیم کامیاب ہوئی اور الگزنڈرا ہائی اسکول کو دو گولوں سے شکست ہوئی طلباء دار العلوم نے مہمانوں کی ضیافت کی شب میں ایک پرتکلف دعوت دی اور کھیل کے بعد چائے اور تنقلات سے تواضع کی۔

طلباء قدیم کا سالانہ اجتماع قریب آرہا ہے پچھلے سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں جلسہ ہوا تھا اب کی بعض اصحاب سردی کے خیال سے مارچ کا مہینہ پسند کر رہے ہیں مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جارہا ہے ان کے فیصلہ پر انعقاد جلسہ کی صحیح تاریخ سے اطلاع دی جائے گی،

نقد و نظر

خطوط غالب غالب کے خطوط اردو ادبیات میں جو حیثیت رکھتے ہیں، اس سے اہل علم اور اہلِ ذوق ناواقف نہیں، لیکن افسوس ہو کہ انکی شان کے مطابق انکی علمی خدمت نہیں کیگئی تھی، جناب مہیش پرشاد صاحب (مولوی فاضل) صدر شعبۂ اردو و فارسی بنارس یونیورسٹی تمام اردو داں طبقہ کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ بڑی تحقیق و جستجو اور بڑی محنت و قابلیت سے ان خطوط کو فراہم اور مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا، ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی صدر شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی کی امداد و مشورہ سے کتاب میں تصحیح، رسم خط، اور طباعت کی وہ خصوصیات موجود ہیں، جو ایک بلند پایہ علمی تصانیف کی اشاعت کے شایانِ شان ہیں، اردو مطبوعات میں غالباً بہت کم کتابیں اس دیدہ ریزی باریک بینی اور احتیاط کے ساتھ شائع ہوئی ہوں گی، جیسے خطوط غالب کا یہ اڈیشن شائع ہوا ہے۔ کتاب میں غالب کی دستی تحریر کا فوٹو بھی شامل ہو، کتاب اہلِ ذوق کی قدردانی کی مستحق اور مرتب و ناشر تمام اہل علم کی طرف سے لائق ستائش ہیں، قیمت غیر مجلد للعہ مجلد صہ

ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد

ندائے حرم مدرسۂ صولتیہ مکۂ معظمہ میں قدیم تعلیمی اور دینی مرکز، اور مشہور ہندوستانی عالم اور مناظر اسلام مولانا رحمت اللہ صاحب اظہار الحق وغیرہ کی یادگار ہو، اس مرکز کا تعلق عالم اسلام کے مرکز میں ہونیکی وجہ سے تمام دنیائے اسلام سے ہو، لیکن ہندوستان سے اس کا خاص تعلق ہو، اس تعلق کی بنا پر ہندوستان کے مسلمانوں کے اسکے حالات سے مطلع رکھنے کی ضرورت تھی، ندائے حرم اسی خدمت کو انجام دیتا ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے اس قابل فخر ادارہ کی خدمت کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہو۔ رسالہ مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی کی رہنمائی میں سلیقہ اور خوش اسلوبی سے نکلتا ہو اور اسکی امداد

ایک بینی سدست ہو۔ سالانہ اشتراک سے (۱۰ سا)

پتہ:- صدر دفتر مدرسہ صولتیہ (مکۂ معظمہ) قرولباغ ، نئی دہلی

ایمان، تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام، کلیہ عقائد، سائنس اور اسلام، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کچھ عرصہ سے ایک مجلس انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کے نام سے قائم ہے۔ اس انجمن کے ماتحت سال میں ایک مرتبہ اسلامی ہفتہ منایا جاتا ہے جس میں ملک کے مشہور صاحب تعبیر اور اہلِ نظر علمار کو دعوت دیجاتی ہے کہ وہ مختلف مسائل اور عنوانات پر اپنے خیالات اہلِ مجلس کے سامنے پیش کریں، یہ تقریریں بعد کو کتابی شکل میں انجمن کی طرف سے شائع کیجاتی ہیں تاکہ حاضرین کے علاوہ غائبین بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔ مذکورۂ بالا رسائل جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا قاری محمد طاہر صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، اور مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی ان تقریروں پر مشتمل ہیں جو ان حضرات نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر اسلامی ہفتہ کے سلسلہ میں کی تھیں، اب انجمن نے ان تقریروں کو کتابی شکل میں علٰحدہ علٰحدہ شائع کر دیا ہے تاکہ ان کے افادہ کا دائرہ وسیع اور دیرپا ہو سکے۔

اصلاح مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تقریباً تیس برس پہلے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی کوششوں سے یہ درسگاہ قائم ہوئی تھی تاکہ کم مصارف اور سادہ ماحول میں ، زمانہ کے حالات کے پیش نظر اسلامی تعلیم اور دینی تربیت کا انتظام کیا جائے رسالۂ اصلاح اسی مدرسۃ الاصلاح کا آرگن ہے پہلے اس نام سے ماہوار علمی رسالہ نکلتا تھا لیکن موجودہ بد مذاقی کے دور میں کسی علمی رسالہ کا جاری رہنا جس قدر دشوار ہے ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اس ماہوار رسالہ کو بند کر کے عام فہم زبان میں سہ ماہی رسالہ نکالا گیا ہے چندہ بھی صرف عہ رکھا گیا ہے خدا کرے اس تخفیف کے بعد یہ رسالہ چل جائے۔ (ع - ق)

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ نمبر ۱۲

ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۱ء

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت و ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

"الندوہ" کے صفحات میں مولانا محمد الیاس صاحب کی تبلیغی تحریک کا ذکر کئی بار آچکا۔ میوات کے علاقہ میں (جو اس تحریک کا مرکز ہی) اسکے جو اصلاحی اثرات ظاہر ہوئے ہیں الندوہ کے ناظرین ان سے بھی بیخبر نہ ہوں گے۔ یہ تحریک اتنی نازک اور گہری اور اتنے دقیق اصولوں اور حاوی ہو کہ تحریراً اُس کا تعارف نہیں کرایا جا سکتا، البتہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل کے الفاظ میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ "یہ سلوک راہِ نبوت" ہو۔

ان تمام لوگوں کے لئے جو دین کا ذوق اور فہم رکھتے ہیں اور اس زمانہ کی ہنگامہ آرائیوں اُکتا چکے ہیں اور جن کے نزدیک طریق نبوت ہی عمل کا صحیح راستہ ہی، نیز ان لوگوں کے لئے جو اپنے کی دینی ویرانی پہ حسرت کرتے ہیں مخلصانہ مشورہ ہو کہ وہ دہلی بستی نظام الدینؒ میں مولانا محمد الیاس کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کے ساتھ کچھ وقت صرف کریں اور میوات میں جا کر تبلیغ کا کام نظام بھی دیکھیں اور اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیں۔ تعجب ہو کہ لوگ تاریخ کے آثار قدیمہ یادگار منہدم عمارتیں اور شکستہ مقبرے دیکھنے دُور دُور جاتے ہیں لیکن قرن اول کے زندہ نمونے اور جیتی جاگتی تصویریں دیکھنے کا شوق نہیں ہوتا اور اس کے لئے سفر کی زحمت گوارا کرنے والے ہیں حقیقت یہ ہو کہ معاصرت بڑا حجاب ہے۔

نومبر کی آخری تاریخوں میں میوات کے علاقہ تحصیل نوح (ضلع گوڑگانوہ) میں عظیم الشان تبلیغی جلسہ ہوا، میوات کے علاوہ ملک کے مشاہیر علما شریک ہوئے۔ دار العلوم ندوہ

بھی تیرہ ۱۳ آدمیوں کی ایک جماعت نے جو مدرسہ کے طلبا اور بعض مدرسین پر مشتمل تھی شرکت کی، یہ جلسہ اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے بالکل منفرد تھا۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ میں تیس برس سے جلسوں میں شرکت کرتا ہوں اور اس طویل مدت میں میں نے سیکڑوں جلسے دیکھے لیکن یہ جلسہ اپنی شان کا بالکل نرالا جلسہ ہے میں نے ایسا جلسہ نہیں دیکھا۔

اس جلسہ میں وہ چیزیں نہ تھیں جو عموماً جلسوں میں ہوا کرتی ہیں اور جو جلسوں کی کامیابی کی علامت سمجھی جاتی ہیں آٹھ دس ہزار آدمیوں کا یہ اجتماع (جسمیں بکثرت تیس اور چالیس کوس سے پیدل چلکر آنیوالے تھے) کسی جلسہ سے زیادہ ایک زندہ خانقاہ معلوم ہوتا تھا جسمیں عبادت و ذکر نمازوں کی پابندی اور نوافل کے ساتھ چستی و مستعدی، جفاکشی و مجاہدہ، سادگی و بے تکلفی، تواضع و خدمت اور اسلامی اخلاق کے نمونے بکثرت دیکھنے میں آتے تھے اور بغیر کسی دعوے اور مطالبہ کے ایک حقیقی دارالاسلام کا نمونہ تھا جلسہ کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار آدمیوں نے چار چار مہینہ کے لئے یو-پی وغیرہ میں پیدل چلکر اپنا خرچ کرکے گاؤں اور قصبوں میں اور جگہ جگہ خدا کا پیغام پہونچانے کا ذمہ لیا۔ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور ان کی کوششوں میں برکت دے، ناظرین کو غور کرنا چاہئے کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اس کام میں ہم کیا مدد کرسکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کو حافظ محمد الیاس خاں صاحب نے ایک طویل علالت کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما میں انتقال کیا جناب حافظ صاحب مرحوم بڑے باوضع اور بزرگانہ صفات کے بزرگ اور قدیم تہذیب کا نمونہ تھے آپ عرصہ دراز تک ریاست بھوپال میں مساجد و اوقاف اور مناصب کے مہتمم رہے اگست ۱۹۴۰ء میں آپ اپنے عہدہ سے بڑی نیکنامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے ندوۃ العلماء کے کاموں سے آپکو بڑی دلچسپی تھی۔ بھوپال میں معین الندوہ کا قیام آپ ہی کی توجہ اور کوشش کا نتیجہ تھا عرصہ سے آپکو ضعف معدہ اور اسہال کی شکایت تھی اپنے صاحبزادہ مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب قائم مقام مہتمم دارالعلوم کی خواہش پر بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور دارالعلوم میں قیام فرمایا اور وہیں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اپنے باپ، ماں بلکہ ان سے زیادہ اپنے دادا کی سب سے لاڈلی اولاد ہوں، میرے باپ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے علاوہ انکی سات لڑکیاں تھیں جن میں ایک کے سوا سب میرے والد کے بعد پیدا ہوئیں اسلئے قدرتی طور پر وہ میرے والد، اور میرے والد کی اولاد سے انتہائی محبت رکھتے تھے، اتفاق سے میرے والد کی اولاد کا سلسلہ لڑکیوں سے شروع ہوا اور چند سال کے عرصے میں پے بہ پے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، اس کے بعد میری ولادت ہوئی، اب غور کیجیے کہ جس شخص کے گھر میں پے در پے سات لڑکیاں پیدا ہو چکی ہوں، اور اس کے بعد اس کے محبوب لڑکے کی صلب سے بھی متصل تین لڑکیاں پیدا ہوں وہ اس کی اولاد نرینہ کی پیدائش کا کس قدر مشتاق اور خواہشمند ہوگا؟ ایسی حالت میں میری ولادت نے میرے دادا کی اشتیاق آمیز مسرت میں غیر معمولی اضافہ کیا، خوش قسمتی سے اسوقت خاندان فارغ البال تھا کاشتکاری اور زراعت کے علاوہ جو آبائی پیشہ تھا نیل اور شکر کی تجارت ہوتی تھی اس لئے دیہاتی نقطۂ نظر سے گانوں میں ہمارا خاندان ایک دولتمند خاندان شمار کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ میرے دادا ایک باحوصلہ اور فیاض شخص تھے اس لئے انھوں نے میری ولادت پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا، غربا، اور رعایا کو دیہاتی پیمانے پر روپئے، پیسے، اور کپڑے تقسیم کئے، اور گانوں بھر کی دعوت کی، اس سے اتنا نتیجہ تو ہر شخص نکال سکتا ہے کہ میں اپنے بھائی بہنوں میں اپنے باپ ماں کی سب سے محبوب اور سب سے خوش قسمت اولاد ہوں میری اس خوش قسمتی کا آغاز یوم ولادت ہی سے ہوا اور الحمدللہ کہ اب بھی مختلف حیثیتوں سے اپنے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت اور ممتاز ہوں، اس پر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں، اور دل میں یہ حسرت رکھتا ہوں کہ میرے اور بھائی بہن کم از کم میرے برابر خوش قسمت کیوں نہ ہوئے؟ گذشتہ اور موجودہ خوش قسمتی کو اگر صغریٰ و کبریٰ بنایا جائے تو کم از کم شاعرانہ طور پر اس سے یہ نتیجہ بھی نکلے گا کہ اگر توفیق الٰہی نے مدد کی اور ابر رحمت کی چادر نے اپنے سائے کو پورے طور پر پھیلایا

توانشاءاللہ آخرت میں بھی خوش نصیب ہی رہوں گا۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

لیکن اس خوش نصیبی کے ساتھ یہ افسوس ہے کہ میری پیدائش کے چند ہی سال بعد میرے دادا کا انتقال ہوگیا، اسوقت مجھکو صرف اس قدر ہوش تھا کہ ابتک اونکی صورت مجھے یاد ہے، باتیں یاد نہیں، اون کی وفات کے بعد کا ایک اور واقعہ یاد ہے، میرے دادا کی قبر ایک مختصر سے باغ میں ہے جو ہمارا خاندانی قبرستان ہے، خاص میرے دادا کی قبر پر آم کا ایک درخت سایہ افگن ہے، ایک بار اپنے بچپن میں آموں کی فصل میں اس قبرستان میں گیا تو اپنے دادا کی قبر پر ایک پختہ آم گرا ہوا دیکھا، ساتھ میں ایک عزیز تھے، انھوں نے آم اٹھاکر مجھکو دیا اور کہا کہ لو اس کو تمھارے دادا نے تم کو دیا ہے اس پر مجھے انتہائی مسرت ہوئی، اور آج اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مسرت کے ساتھ حسرت بھی ہوتی ہے، غرض میری تعلیم کا سلسلہ میرے دادا کی زندگی میں شروع نہ ہوسکا بلکہ میرے والد نے میری تعلیم کا انتظام کیا، اس موقع پر صداقت کے ساتھ مجھکو یہ بتا دینا چاہئے کہ میرے دادا ایک دیہاتی ان پڑھ شخص تھے، صرف زراعت و تجارت کے ذریعے سے دولت پیدا کی تھی، ملازمت اور دوسرے علمی ذرائع معاش سے ہمارا خاندان ناآشنا تھا، لیکن میرے والد نے کسی قدر ترقی کی، اور قدیم مکاتب میں فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی، تجارتی اغراض سے ہندی بھی پڑھی، اور قدیم ہندوانہ حساب سیکھا جس کے وہ بڑے ماہر تھے، اونکو اس سے بڑی چڑھ تھی کہ کوئی شخص کاغذ قلم دوات، اور پنسل سے حساب لگائے، وہ ہر چیز کا حساب زبانی کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اس دیہاتی سادہ تعلیم سے کوئی سرکاری اور قومی ملازمت نہیں مل سکتی تھی اس لئے وہ بھی اپنے قدیم پیشہ زراعت و تجارت میں مشغول رہے، اس لئے اس مختصر تعلیم کے بعد بھی ہمارا خاندان ملازمت سے ناآشنا رہا، میرے چچا نے جو میرے دادا کے بھائی کی اولاد تھے، تعلیم میں اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور غالباً شرح جامی تک عربی پڑھی، اور چونکہ اہلحدیث تھے، اس لئے حدیثوں کے شروح و ترجمہ سے اپنی استعداد زیادہ بڑھالی، اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے لکھنے لگے۔ جن کے قلمی مسودات اب تک موجود ہیں، اس طرح رفتہ رفتہ ہمارا خاندان علم سے آشنا ہوا اور یہ آشنائی فارسی اور عربی زبان کے ذریعہ سے ہوئی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا، اس لئے میرے والد نے

میری تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا، خود تو دو دو کوس کے فاصلے پر جا جا کر دوسرے گانوں کے مکاتب میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن میرے لئے باقاعدہ اپنے دروازہ پر ایک مکتب قائم کیا اور ایک فارسی خواں معلم کو میری تعلیم کے لئے مقرر کیا، جس کو ہمارے یہاں سے دو روپیہ ماہوار تنخواہ اور کھانا ملتا تھا، اس کے علاوہ گانوں اور آس پاس کے دیہاتوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور دو دو، چار چار آنے ماہوار دیتے تھے، اس طرح میرے گانوں اور آس پاس کے دیہاتوں کے بہت سے لوگ خواندہ ہوگئے، اور مجھے مسرت ہے کہ میری وجہ سے اس زمانے میں ابتدائی تعلیم کی تھوڑی سی اشاعت ہوگئی، اس لحاظ سے میں یوم خواندگی منانے والوں سے اپنے آپ کو زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہوں، غرض میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں بجائے کسی عالم دین کے ایک ایسے معلم سے پڑھیں جس کو اس زمانے کی اصطلاح کے موافق ہم لوگ میاں صاحب کہتے تھے، میں بذات خود اس زمانے میں نصاب تعلیم کے لفظ سے نا آشنا تھا، البتہ اس زمانے کے رواج کے مطابق میں نے آمد نامہ، صفوۃ المصادر، کریما، مامقیماں، اللہ خدائی، بوستاں گلستاں، اخلاق محسنی اپنے میاں صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد ان کا سرمایۂ علم ختم ہوگیا اور ان سے بہتر معلم کی تلاش ہوئی، اس وقت میرا سن تیرہ، چودہ سال کا تھا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق میری شادی اسی سن میں ہوگئی تھی خوش قسمتی سے میرے خسر صاحب ایک سند یافتہ عالم تھے، اور مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی سے تمام درسی کتابیں پڑھی تھیں، انھوں نے مختلف مقامات پر درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی تھی، لیکن اس وقت بیکار تھے، اور خود اپنے دروازہ پر ایک مکتب قائم کر کے حسبۃً للہ اپنے گانوں اور اپنے خاندان کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے، اس لئے میں نے دو برس تک اپنی سسرال میں رہ کر ان سے فارسی کی انتہائی کتابیں مثلاً انوار سہیلی سکندر نامہ، بہار دانش، مینا بازار، شبنم شاداب، دیوان غنی اور دیوان ہلالی وغیرہ پڑھیں، اس کے بعد عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اگرچہ میں خود اپنی سسرال میں رہ کر اپنے خسر سے عربی تعلیم حاصل کر سکتا تھا، تاہم گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کے بعض ذرائع پیدا ہو گئے، میرے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی، اے، کانپور کے مشن کالج میں ایف، اے کلاس میں پڑھتے تھے، اس وقت کانپور عربی تعلیم کا مرکز تھا، اور جامع العلوم اور فیض عام کی شہرت مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا احمد حسن صاحب کی ذات کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، میں یا میرے والد تو بذات خود کانپور کی اس

علمی مرکزیت سے واقف تھے، البتہ مولوی محبوب الرحمان تعلیم کے ساتھ کی وجہ سے میرے والد نے مجھکو ان کے ہمراہ کردیا، لیکن میں نے بذات خود کانپور کے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں حاصل کی، بلکہ خود ہمارے ہم وطن مولوی بخشش احمد صاحب جو اس وقت مدرسہ اصلاح المسلمین سرائے میرہ میں مدرس ہیں کانپور مشن اسکول میں مدرس تھے اور مولوی محبوب الرحمان کے ساتھ رہتے تھے، ہم نے عربی کی ابتدائی کتابیں مثلاً میزان منشعب، زبدہ، پنج گنج، صرف میر، نحو میر، ہدایۃ النحو، قال اقول، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، شرح تہذیب وغیرہ ان سے اور فیض عام اور جامع العلوم کے بعض فارغ التحصیل طلبہ سے پڑھیں، اور جو کتاب پڑھی پوری پڑھی اور بعض کتابوں کو ازبر یاد کیا، لیکن ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد مولوی محبوب الرحمان صاحب آگرہ سینٹ جانس کالج میں داخل ہوگئے، اور میں بھی ان کے ساتھ گیا، آگرہ کی جامع مسجد میں ایک بڑے نام عربی کا مدرسہ قائم تھا، اور مولوی محمد رمضان مدرس تھے، میں نے ان سے کافیہ، شرح جامی، اور قدوری وغیرہ پڑھیں، اسکے بعد مولوی محبوب الرحمان صاحب بی۔ اے۔ پاس کرکے علی گڑھ چلے گئے، اور میں نے غازی پور کا رخ کیا، جہاں مدرسہ چشمۂ رحمت مدت سے قائم تھا، اور اعظم گڈھ کے عربی خواں طلبہ کا قرب مسافت کی وجہ سے سب سے بڑا مرکز تھا، خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے عزیز و برادر محترم مولوی شبلی صاحب جو اس وقت دارالعلوم ندوہ کے فقیہ ہیں مدرسہ چشمۂ رحمت میں مدرس تھے، میں نے ان سے قطبی، میر قطبی، شرح وقایہ، میبذی، نورالانوار، رشیدیہ، سعیدیہ اور ملا حسن وغیرہ پڑھیں اور ہر کتاب پوری پڑھی، اور میں نے اپنے اساتذہ میں ان کو سب سے بہتر پایا لیکن اس وقت بھی میں مدرسہ میں داخل تھا بلکہ ان سے گھر پر پڑھتا تھا، ان کے علاوہ چشمۂ رحمت میں ہمارے ضلع کے ایک اور عالم مولوی لعل محمد صاحب مدرس اول تھے، ان کے اسباق میں بیقاعدہ شریک ہوتا رہا اور اسی طرح میرزاہد وغیرہ کے جستہ جستہ مقامات سنے، ان واقعات سے معلوم ہوا ہوگا کہ میری تعلیم مدرسہ کی چاردیواری سے باہر قدیم طرز پر ہوئی، اور اب بھی میں خانگی تعلیم کو مدرسوں کی تعلیم سے بہتر سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک کتابوں کے انتخابات کا درس تعلیمی قابلیت کے لئے سم قاتل ہے، ہر کتاب پوری پڑھنا چاہیئے۔

کانپور، آگرہ اور غازی پور میں تعلیمی سلسلے کے علاوہ کچھ ادبی مشاغل بھی جاری تھے، ہمارے عزیز مولوی

محبوب الرحمان کلیم شاعر تھے، اس لئے ان کی صحبت میں رہ کر میں نے بھی شاعری شروع کی اور ان ہی کے تخلص کی مناسبت سے شمیم تخلص اختیار کیا، اس وقت پیام یار، پیام عاشق، اور دامن گلچیں وغیرہ متعدد شاعرانہ رسالے نکلتے تھے جن میں بہت سے شعراء کی ہر طرح منتخب غزلیں شائع ہوتی تھیں میں ان رسالوں کو بشوق پڑھتا تھا، اور انہیں اپنی غزلیں اشاعت کے لئے بھیجتا تھا، پہلے مولوی محبوب الرحمان سے اصلاح لیتا تھا، غازی پور آیا تو مدرسہ چشمۂ رحمت کے منیجر اور غازی پور کے سب سے بڑے شاعر مولوی عبدالاحد شمشاد منیجر مدرسہ چشمۂ رحمت سے اصلاح لینے لگا، مولوی عبدالاحد صاحب شمشاد نے فارسی اور اردو کی کتابوں کا ایک بڑا کتب خانہ بھی جمع کیا تھا اور طلبہ اور اپنے تلامذہ کو نہایت فیاضی کے ساتھ کتابیں دیکھنے کو دیتے تھے، اور میں ان کے یہاں سے اردو اور فارسی کے دواوین لاکر بشوق ان کا مطالعہ کرتا تھا، اس وقت تک تو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری محسن کتابیں کون کون سی ہیں، یا یہ کہ مجھکو کسی زمانے میں اس موضوع پر لکھنے کی تکلیف دعوت دیجائیگی، لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری محسن کتابیں سکندر نامہ، دیوان غنی، دیوان حالی اور اخلاق محسنی وغیرہ تھیں، کیونکہ فارسی دواوین کے سمجھنے میں مجھے ان سے بڑی مدد ملی اور شاعرانہ تلمیحات، تشبیہات، استعارات اور صنائع و بدائع کے سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے میں انھوں نے میرے ساتھ خاموش احسان کیا، اس وقت تک میں نے نثر کی کتابوں کا بہت کم مطالعہ کیا تھا، لیکن میرے عزیز مولوی محبوب الرحمان کلیم مضمون نگار بھی تھے، اور ان کی صحبت میں سر سید، مولانا حالی، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ کا نام اکثر سنتا رہتا تھا اور مولانا شبلی مرحوم تو ہمارے ہم وطن ہی تھے، ان سے میں پہلے ہی سے واقف تھا اور ان کی شکل و صورت دیکھنے کا مشتاق تھا، خوش قسمتی سے کانپور میں ان کی صورت دیکھی اور ان کی ایک مختصر سی تقریر بھی سنی، لیکن اب تک میں نے ان ادبائے ہند کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن جب آگرہ میں تھا تو اسی زمانے میں الفاروق نکلی، اور آگرہ اخبار کے اڈیٹر نے مولوی محبوب الرحمان صاحب کو ریویو لکھنے کی غرض سے وہ کتاب دی وہ اس کو گھر لائے تو میں نے اس کو بغور پڑھا اور یہ پہلا دن تھا کہ دور جدید کی تصنیفات میں ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور ادیب کی ایک ممتاز تصنیف میری نظر سے گذری اسی زمانے میں رسائل شبلی کا مجموعہ بھی شائع ہو

اور میں نے اس کو بھی بشوق پڑھا اس کے بعد مجھے ایک عجیب قسم کی بدقسمتی سے ازخود عربی زبان کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا، ہندوستان میں طاعون نمودار ہوا اور ہر جگہ شدت کے ساتھ پھیلا، میں طاعون کے خوف سے سلسلۂ تعلیم کو چھوڑ کر گھر پر بیٹھ گیا، لیکن یہ بیکاری میرے لئے مفید ثابت ہوئی، اعزہ واقارب میں چند لوگ عالم تھے، ان کے کچھ کتابیں جن میں زیادہ تر حصہ درسی کتابوں کا تھا جمع کر لی تھیں، میں ان کے اس مختصر کتاب خانہ سے منطق و فلسفہ کی کتابیں، مثلاً شرح مطالع، ملا جلال حمد اللہ، میرزاہد امور عامہ وغیرہ مانگ لاتا تھا اور ان کا تفریحاً مطالعہ کرتا تھا زیادہ تر کتابوں پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حاشیے ہوتے تھے، اور وہ اپنے تبحر علمی اور طرز تحریر سے مطالب کو نہایت آسان کر دیتے تھے اس لئے میں ان کتابوں کو بہت اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، اسی زمانے میں تفسیر کبیر بھی پوری پڑھ ڈالی اور چونکہ امام رازی بھی پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان عبارت میں لکھتے ہیں اس لئے اس کو بھی میں بآسانی سمجھ جاتا تھا، ان کتابوں کے مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر اور یہ احسان ہوا کہ مجھکو عقلیات سے دلچسپی ہو گئی، اور صرف وہی کتابیں پسند آنے لگیں جو عقلی اصول کے مطابق لکھی گئی ہوں یعنی دعوی، دلیل، اور علل و اسباب سب پر بحث ہو، میرا یہ ذوق اب تک قائم ہے، اور تاریخی، ادبی، مذہبی ہر کتاب میں ان چیزوں کی جستجو کرتا ہوں،

دو برس میں طاعون کا خوف کم ہوا اور اپنی تضیع اوقات پر افسوس ہونے لگا تو ندوہ میں چونکہ زیادہ تر اپنے ہم وطن لوگ رہتے تھے، بالخصوص اعلیٰ عہدہ دار مثلاً مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم اور مولانا شبلی نعمانی معتمد دارالعلوم اپنے وطن اور برادری کے لوگ تھے اس لئے دارالعلوم ندوہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، مولانا حفیظ اللہ صاحب کو خط لکھا اور انھوں نے نہایت مہربانی کے ساتھ بلا لیا، وہاں پہونچ کر پانچویں درجہ میں داخل ہوا، اگرچہ مولانا شبلی کے آنے کے بعد نصاب تعلیم بدل گیا تھا تاہم پانچویں درجہ سے لیکر آٹھویں درجہ تک جو کتابیں داخل درس تھیں وہ میرے عقلی اور ادبی ذوق کے بالکل مطابق تھیں، شرح حکمۃ العین، شرح حکمت الاشراق توضیح تلویح، ہدایہ، حماسہ، سبعہ معلقہ، متنبی، نقد الشعر، دلائل الاعجاز وغیرہ میرے عقلی اور ادبی معیار پر پوری اترتیں، اس لئے میں نے ان کو بشوق پڑھا، کبھی کبھی مولانا حفیظ اللہ صاحب کی قدیم تعلیمی عصبیت میں ہیجان پیدا ہو جاتا تھا تو حمد اللہ، قاضی مبارک

اور صدرا کے اسباق بھی ہو جاتے تھے ان کتابوں کے اثر سے عقلی اور ادبی ذوق میں اور ترقی ہوئی اور کتب خانے سے شرح مقاصد، شرح مواقف اور شرح تجرید وغیرہ مستعار لیکر بالاستیعاب مطالعہ کرنے لگا، اردو کتابوں میں اس زمانے میں مولانا شبلی کی علم الکلام اور الکلام شائع ہو چکی تھیں، چونکہ یہ دونوں کتابیں عقلی اصول پر لکھی گئی تھیں اس لئے میں نے نہایت شوق سے ان کو پڑھا، مجھے غلط یا صحیح طور پر طرز تحریر میں مولانا شبلی کا مقلد کامل خیال کیا جاتا ہے غالبًا انکی تصنیفات کے ابتدائی مطالعہ کا یہ احسان ہوگا، بہرحال میں انکی تصنیفات کو اپنا محسن اور اپنا رہبر سمجھتا ہوں، مولانا شبلی کے علاوہ اور مصنفین کی کتابیں مجھے بالکل پسند نہ آئیں، مولانا نذیر احمد اور مولانا عبد الحلیم شرر کی تصنیفات کو تو میں نے بالکل ناپسند کیا، سرسید کی تصنیفات کا معیار بھی میرے نزدیک بلند نہیں، اردو طرز تحریر پر انکا یہ احسان ضرور ہے کہ انھوں نے قدیم مقفی اور مولویانہ طرز تحریر کو چھوڑ کر ایک سادہ سلیس اور رواں طرز تحریر پیدا کیا لیکن میرے نزدیک انکی انشا پردازی میں رنگینی اور بانکپن نہیں، مضامین بھی زیادہ تر مناظرانہ اور ملایانہ ہیں، بعض مقامات پر ابتذال اور بھدا پن بھی ہے، بہرحال مجھ پر انکی تصنیفات کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا، مولانا حالی میں بھی وہ نوک جھونک رنگینی اور بلندی نہیں، البتہ وہ نقاد بہت بڑے ہیں اور انکی تصنیفات میں مقدمۂ شعر و شاعری، حیات سعدی، اور یادگار غالب کا مجھ پر اس حیثیت سے خاص طور پر احسان ہے اور میں تنقیدی حیثیت سے انکی ان کتابوں کو اپنا محسن اور رہنما سمجھتا ہوں، میں نے ناول بہت کم پڑھے ہیں البتہ ہردوئی کے حکیم محمد علی کے چند ناول پڑھے تو انکی رنگین بیانی کا مجھ پر خاص اثر ہوا، مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کو اگرچہ میں پسند کرتا ہوں لیکن انکی تصنیفات کو بہت زیادہ بلند پایہ متین اور سنجیدہ نہیں سمجھتا، مولانا عبد الماجد دریابادی کی تصنیفات میں مجھکو فلسفۂ اجتماع، فلسفہ جذبات، تاریخ اخلاق یورپ باعتبار مضامین اور باعتبار طرز تحریر کے بہت زیادہ پسند ہیں، یہ کتابیں وہ اور صورۃً دونوں کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تصنیفات کا مکمل عکس ہیں اس لئے ہم اور وہ دونوں ایک ہی چراغ کے پروانے ہیں روحانی اور ادبی حیثیت سے مجھ پر صحیح بخاری کا نہایت عمدہ اثر ہوا لیکن اسی نسبت سے میں فقہی کتابوں کو بالکل بے اثر اور بے کیف پاتا ہوں،

اعجاز القرآن

(سلسلۂ مضامین قرآن)

از ابو الحسن علی ندوی

قرآن مجید نے اپنے معجزہ ہونے کا خود دعویٰ کیا ہے اور ان انسانوں کو جن کو اس کے کتاب الٰہی ہونے میں شک ہے مقابلہ کی دعوت دی ہے سب سے پہلے ان آیتوں کو جمع کر کے پڑھئے۔

وَإِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (البقرہ ع ۳)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (یونس ع ۴)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ (ہود ع ۲)

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ○ (بنی اسرائیل ع ۱۰)

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ

فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○ (قصص ع ۵)

اعجاز قرآن کا دائرہ مندرجہ بالا آیتوں میں متکلمین و مشرکین کو قرآن کا مطلق مثل لانے کی دعوت دی گئی ہے اور کوئی کلام اور کتاب قرآن کی اسوقت تک مثل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے اعجاز کے تمام شعبوں میں اور اس کی تمام خصوصیات

میں حائل نہ ہو اور قرآن صرف اپنے الفاظ و ترکیب اور فصاحت و بلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنی معنی و مضامین میں بھی اپنے اعلیٰ علوم و معارف میں معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی اپنے پیش کئے ہوئے مذہبی و اخلاقی و معاشرتی اور مدنی نظام میں بھی اپنے اثرات و انقلاب میں بھی اپنی ہی پیشینگوئیاں اور اخبار میں بھی مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہو سکتی ہے۔

سورہ ہود (ع ۲) کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا اتیا خصوصی اور اس کے اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور حقیقت میں وہ اس کے علم خاص کا ایک مظہر ہے اس لئے اس میں انسان اپنے ظنی و مشتبہ ناقص محدود اور خود خدا کے بخشے ہوئے علم کے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جس طرح خدا کی اور صفات میں انسان مماثلت نہیں کر سکتا اسی طرح وہ خدا کے علم میں بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

کا نکتہ بتاتا ہے کہ اللہ جس طرح تمام صفات و الوہیت میں یکتا ہے اسی طرح اپنے علم میں بھی اور جب اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے تو کتاب الٰہی کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف ع ۶)

علم اللہ کا تعلق صرف الفاظ و ترکیب سے نہیں بلکہ معانی و حقائق سے بھی ہے۔

لفظی فصاحت کے لئے قرآن نے جابجا اپنے کو قرآن عربی کتاب مبین اور لسان عربی مبین کہا ہے جس میں اس کے لفظی محاسن اور لسانی تفوق کی طرف اشارہ ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ، اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف ع ۱)

لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۔

سورہ قصص (ع ۹) کی آیت میں قرآن کے کسی ایسے جواب کا مطالبہ کیا گیا ہے جو ہدایت و اصلاح میں

اس سے فائق ہو فَاقَ الْکِتَابِ هُوَ اَهْدٰی مِنْهُمَا اَتَّبِعْهُ پس قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کا لفظی اعجاز درحقیقت قرآن کے اعجاز کا ایک گوشہ ہے اور قرآن کا اعجاز اس میں منحصر نہیں متقدمین نے جب قرآن کے اعجاز پر غور کیا یا اس موضوع پر قلم اٹھایا تو زمانے کے رجحان عام اور عربوں کے ادبی ذوق اور زبان کی اہمیت کی وجہ سے ان کی نظر کے سامنے قرآن کے اعجاز کا یہی گوشہ رہا اور کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے اس دائرے کے اندر کمال نکتہ دانی اور نکتہ آفرینی کا ثبوت دیا۔ اور بڑی دماغ سوزی سے کام لیکر اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کردیا۔ اس علمی ذخیرہ میں اضافہ مشکل ہے اس لئے اس باب میں انہیں تالیفات کی طرف رجوع کرنا چاہئے[1]۔

قرآن مجید کا سب سے پہلا اور بڑا معجزہ اسلام ہے

قرآن مجید نے دنیا میں مذہب و عقائد کا ایک آخری نظام پیش کیا جس سے زیادہ محکم اور مفصل مذہبی نظام دنیا میں آج تک پیش نہیں ہوا اس سے پہلے کے مذاہب بھی (چونکہ وہ اپنے اپنے وقت کے لئے تھے) اس لئے اس کے مقابلے میں ناقص ہیں اور چونکہ آسمان کا آخری صحیفہ زمین پر آچکا ہے اس لئے یہ آخری نظام ہے اس سے زیادہ انسان کو اپنے خالق سے مربوط کرنے والا، اس کی زندگی میں للّٰہیت و روحانیت پیدا کرنے والا ان تمام گمراہیوں اور بے اعتدالیوں سے دور رکھنے والا جس میں مذہبی قومیں مبتلا ہوئیں و مبتلا ہیں کوئی مذہبی نظام انسانی تصور کی گرفت میں نہیں آسکتا اسی طرح اس نے انسان کی اس زندگی کے لئے ایک آسمانی اخلاقی و مدنی دستور عطا کیا جو دنیا میں بہترین اخلاقی و اجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے اور اس نے پیدا کرکے دکھلائے جو کسی اور طریقے پر آج تک ظہور میں نہیں آئے وہ اجتماع انسانی کے ان تمام مسائل و مشکلات کو جو آج تک پیش آئے یا قیامت تک پیش آسکتے ہیں اپنے معجزانہ طریق پر ذرا ذرا سے اشارات سے حل کردیتا ہے وہ ایسے اصول و کلیات عطا کرتا ہے جن کی بنیاد پر ہر زمانے میں دنیا کا بہترین معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے اور ہر جگہ حیات انسانی کی نئی تنظیم ہوسکتی ہے۔ وہ چونکہ آلٰہی ہے اسلئے

---

[1] تفصیلی طور پر باقلانی اور ابن عربی کی اعجاز القرآن اور مختصراً رمانی کا رسالہ النکت فی اعجاز القرآن اور بلاغت و بیان کی مجتہدانہ کتابوں میں قدیم کتابوں میں سے جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ اور متاخرین میں سے امیر المومنین یحییٰ یمنی کی کتاب الطراز نیز تفاسیر میں سے زمخشری کی کشاف اور نحو و معانی اور بیان میں ابن قیم کی الفوائد المشوقۃ الی القرآن اس باب میں اچھے ماخذ ہیں۔

تمام انسانی غلطیوں قانون سازی کے نقائص اور قیاسات سے پاک ہے وہ چونکہ آخری ہے اس لئے ہر قسم کی تکمیل و اضافے سے مستغنی ہے وہ چونکہ عالمگیر ہے اس لئے قومی و مقامی خصوصیات سے منزہ ہے وہ چونکہ دائمی ہے اس لئے ہر قسم کے تغیر و تنسیخ سے آزاد ہے، وہ چونکہ کامل ہے اس لئے اس کے ساتھ کسی ضمیمہ کے الحاق کی ضرورت نہیں۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ ۱)

اس کے نفاذ کی حالت میں وہ مسائل و مباحث پیش ہی نہیں آتے جنھوں نے ہزاروں برس سے نوعِ انسانی کے مفکرین اور علم الاجتماع کے ماہرین کے دماغوں کو مشغول رکھا ہے اور جن کا آخری حل کبھی بھی پیش نہیں ہوا۔ اور کتنے معاشی و سیاسی مسائل ہیں جو اس اصول میں پیدا نہیں ہوتے ہزاروں برس کی غلطیوں اور تجربہ کے بعد دنیا کے مفکر جس نتیجے پر پہونچے ہیں قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ایک امی کی زبان سے پہلے ہی بیان کر دیا۔ یہ نظام اور یہ دستور جس کا نام اسلام ہے خدا کی کاریگری اور حکمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ

اور چونکہ اس اسلام کے اصول و کلیات قرآن سے ماخوذ ہیں اور قرآن ہی نے ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس لئے وہ اسی کا پیش کیا ہوا ایک معجزہ ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (جمعہ ۱)

قرآن کے اس معجزے کی تشریح اور اس کے وجوہ اعجاز کو نمایاں کرنا درحقیقت اسلام کی پوری تشریح ہے جس کیلئے کتب خانے بھی کافی نہیں۔ ان میں بعض چیزیں اپنے اپنے محل پر بھی آئیں گی عقائد کے باب میں اس کے عقائد کے معجزانہ ساخت اور ان کی معجزانہ تکمیل اخلاق و معاشرت کے ضمن میں قرآن کی معجزانہ جامعیت و حکمت کی طرف انشاء اللہ کچھ اشارات آئینگے لیکن ان نکات و اسرار کا استقصاء اور ان کے محاسن کا احاطہ کسی انسان سے کسی زمانہ میں بھی ممکن نہیں۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ

اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (لقمان)

قُلْ لَوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِکَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا

بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (کہف ۱۲)

قرآن کا دوسرا معجزہ اسکے علوم و معارف ہیں

قرآن کا دوسرا معجزہ اس کے وہ بے پایاں علوم و معارف اور حقائق و اسرار ہیں جو اس کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر ایک ایک مستقل معجزہ ہے انسان کا علم جتنا ترقی کرے گا اور اس کی آنکھوں سے جتنے پردے اٹھتے جائیں گے قرآن کا جمال اس کو بے نقاب نظر آئے گا۔

درحقیقت انسانی فہم کا ظرف، تنگ ہے قرآن کی وسعتوں کا متحمل نہیں اس لئے جو کچھ حصہ میں آئے غنیمت ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌ بِقَدَرِهَا (رعد ۳۶)

ان معجزات میں اعجاز کے کئی پہلو ہیں ایک پہلو قرآنی حقائق کی ابدیت اور قطعیت ہے یہ ابدیت اور قطعیت حقیقت میں علم الٰہی اور کتب الہیہ کا خاصہ ہے تغیر اور اشتباہ انسانی علم اور انسانی معلومات کے لوازم میں سے ہیں چونکہ قرآن مجید پورے طور پر محفوظ ہے اس لئے اس کے حقائق کی ابدیت اور قطعیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مذہب اور مذہبی کتابوں میں جب انسانی دستبرد اور مداخلت شروع ہو جاتی ہے تو اس میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہو جاتی ہیں جن کی صحت کی ضمانت خدا کی طرف سے نہیں ہوگی۔ اس وقت اس میں انسانی علوم اور نظریات داخل ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی علم غیر معصوم غیر قطعی اور محدود ہے اس لئے، ان صحیفوں کی قطعیت اور ان کے حقائق کی ابدیت قائم نہیں رہتی۔

قرآن مجید اول سے لیکر آخر تک ابدی اور قطعی ہے اس میں انسانوں کے تغیر پذیر نظریات اور ان کے تحقیقات و تجارب شامل نہیں، دنیا کے علوم و فنون جس قدر ترقی کریں طبعیات اور فلکیات میں انسانوں کے نظریات جو شکل بھی اختیار کریں، زمین مرکز کائنات ثابت ہو یا آفتاب، زمین مسطح ثابت ہو یا کروی شکل، سیارو ں

آبادی اور عوالم کا تعدد ثابت ہو یا نہ ہو، قرآن کے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ بطلیموسی نظام نہیں ہے جو نظام کوپرنیکی سے باطل ہو جائے۔

لیکن اس کے برعکس بائبل انسانی تحریف و اجتہاد سے نہ بچ سکی اس میں عوام کے مشہور اور مقبول عقائد اور نظریات شامل ہو گئے اس کی رو سے دنیا کی عمر چھ ہزار سال ہے۔ زمین ایک چپٹی سطح ہے سورج چاند اور ستارے متحرک ہیں، زمین مرکز کائنات ہے اور باقی تمام اجسام فلکی اور غیر فلکی اس کے تابع ہیں زمین کی دوسری طرف آبادی کا ہونا محال ہے اس لئے کہ بقول سینٹ اگسٹائن "حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی اس قسم کی بیان نہیں کی گئی۔ زمین کی کروی الشکل ہونے کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس طرف کے باشندوں کو حشر کے دن خداوند خدا کا ہوا سے زمین پر اترنا کس طرح نظر آئے گا۔

یہ "الہامی" تاریخ و سائنس ممکن ہے مؤلفین و شارحین کتب مقدسہ کے زمانے کے مشہورات یا مسلمات کے مطابق ہو لیکن اس کا حقیقت کے مطابق ہونا ضروری نہ تھا۔ یہ انسانی علم کی ایک خاص منزل ہوگی مگر انسان کا علم مسافر ہے مقیم نہیں، وہ جتنا آگے بڑھتا گیا اس منزل کو پیچھے چھوڑتا گیا یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مذہب و عقل کا ساتھ چلنا محال ہو گیا۔ یہ مذہب و سائنس کے تصادم، اور یورپ میں مذہب کے زوال کا پہلا دن تھا لیکن اسلام کی تاریخ میں واجبی طور پر یہ دن کبھی پیش نہیں آسکتا انسانوں کے علوم آپس میں ٹکرائیں گے اور ٹکرا سکتے ہیں ان میں سے ایک غلط ہوگا اور ایک صحیح اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں لیکن خدا کی محفوظ کتاب کے حقائق اور بیانات اور صحیح علم میں کوئی تصادم ممکن نہیں، جو علم اس سے ٹکرائے گا وہ صحیح علم نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن مجید پر انسانوں کے وقتی، معاشی، اجتماعی، اور سیاسی، رجحانات کا کوئی اثر نہیں اس کا نظام ان مسائل میں بھی ابدی اور دائمی ہے،

قرآن مجید کا تیسرا معجزہ غیبی واقعات ہیں

قرآن مجید میں انبیاء سابقین اور گذشتہ قوموں کے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہے جس میں اعجاز کا پہلو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان اطلاعات کا سرچشمہ اور ان روایات کا ماخذ علم الٰہی کے فیض اور غیب کی اطلاع (وحی) کے سوا کچھ نہیں، آنحضرتؐ

امی تھے یہ واقعات وقصص زیادہ تر بلکہ تمام تر مکی سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور وہاں باتفاق مورخین کوئی یہودی اور عیسائی نہ تھا ورقہ بن نوفل جو انجیل کا علم رکھتے تھے صحیح روایات کے مطابق نبوت کے پہلے ہی سال پہلی وحی کے بعد ہی انتقال کر گئے تھے۔ [1]

ہجرت سے پہلے دو عیسائیوں سے آپ کا ملنا بیان کیا جاتا ہے ایک بحیرہ راہب [1] دوسرا عداس اول الذکر سے شام کے شہر بصریٰ میں اور آخر الذکر سے حجاز کے شہر طائف میں ملنا مذکور ہے لیکن پہلی ملاقات چند گھنٹوں اور دوسری ملاقات چند منٹوں سے زیادہ نہیں۔ پہلی ملاقات کے وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی اس عمر میں اور اتنی چھوٹی عمر میں اور اتنی مختصر ملاقات میں کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ آپ نے وہ تمام علوم حاصل کر لئے جو نبوت کے تیئس [۲۳] سال میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ اس صحت واتفاق کے ساتھ جس سے خود یہودی اور مسیحی صحیفے قاصر ہیں بیان فرمایا عداس کوئی عالم نہ تھا وہ خود آپ کا معتقد ہوا اس لئے اتنی کمزور روایتی اور قیاسی بنیاد پر کسی طرح اس قیاس کی عمارت نہیں اٹھتی کہ آپ کے علوم غیبیہ جن کا ایک ایک حرف اور نقطہ تمام تحقیقات اور انکشافات کے بعد صحیح ثابت ہوا۔ ان لوگوں کے علوم سے ماخوذ ہیں جن کی شخصیت ہر طرح سے مشتبہ ہے اور جن کا اضافہ ان کی اصل سے زیادہ ہے جس چراغ میں خود نور نہ ہو اس سے دوسری مشعل کس طرح جل سکتی ہے ان غریب عیسائیوں کے پاس جن سے آپ کے تلمذ اور استفادہ کی نسبت کی جاتی ہے خود کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو علم صحیح کہا جا سکے۔

پس اس سے ثابت ہوگیا کہ ان واقعات کا کم سے کم آپ کے لئے کوئی ذریعہ اطلاع موجود نہ تھا تو یہ تمام تر واقعات محض وحی الٰہی کا کرشمہ ہو اور اعجاز کا یہی پہلو ہے جس کی طرف قرآن نے بار بار توجہ دلائی ہے حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور حضرت مریمؑ کے واقعات کی بعض جزئیات بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

ذَالِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (آل عمران ۵۴)

---

[1] صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت نوحؑ کے طوفان کا واقعہ بیان کرکے فرماتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۔ (ہود ع ۴)

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرکے فرماتا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغٰفِلِينَ ۔ (یوسف ع ۱)

پھر ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۔ (یوسف ع ۱۱)

اسی سورت میں فرماتا ہے کہ یہ واقعات موضوع نہیں ہیں بلکہ ان سے کتب سابقہ کی تصدیق اور تفصیل ہوتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (یوسف ع ۱۲)

ایک جگہ کفار کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہ یہ واقعات آپ کی پرانی یاد داشت سے ماخوذ ہیں ان کا صحیح ماخذ بیان کیا ہے۔

وَقَالُوا اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَاَصِيلًا ۝

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (فرقان ع ۱)

دوسری جگہ اس سورت میں کفار کے اس بیان کی پرزور تردید کی ہے کہ آپ ان قرآنی واقعات کو کچھ لوگوں کی امداد سے اور سازش سے بیان کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا اِنْ هٰذَا اِلَّا اِفْكٌ افْتَرَاهُ وَاَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ

فَقَدْ جَاءُوْا ظُلْمًا وَّ زُوْرًا (فرقان ۴۴)

سورۂ قصص میں ان واقعات کے ظہور کے موقع پر آنحضرتؐ کی غیر موجودگی اور ان سے آپ کی لاعلمی بتائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان اطلاعات کا سرچشمہ محض وحی الٰہی ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝
وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ
لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (قصص ۵۶)

سورۂ عنکبوت میں آپ کی ان چیزوں سے بیگانگی اور آپ کی امیت کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ اس ماحول سے قطعی ناآشنا اور علم کے سامان و لوازم سے بھی بے بہرہ تھے اب مشککین کے لئے اس علم کے ماخذ کے متعلق شبہ کی کیا گنجائش ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت ۵۶)

عصر نبوت میں یا اس کے بعد جن لوگوں کا خیال تھا کہ قرآن مجید کے علوم و واقعات تورات و انجیل سے ماخوذ ہیں، وہ تورات و انجیل سے سرے سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں، قرآن مجید اور تورات و انجیل آج بھی دنیا میں موجود ہیں وہ یہودیوں و عیسائیوں کے عام عقیدہ کے مطابق ان کے صحیفے محفوظ بھی ہیں، آج بھی نہایت آسانی کے ساتھ قرآن اور ان صحیفوں کا تقابل کیا جاسکتا ہے، اور اس دعوے کی علمی تنقید کی جاسکتی ہے۔ انبیاء علیہ السلام کے جو واقعات قرآن اور عہد عتیق کے صحیفوں میں مشترک ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں بلاشبہ واقعات کے بعض اجزاء ان صحیفوں میں اس طرح مشترک و متحد ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا اصلی سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ وحی ہے لیکن واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک چیز محفوظ رہی، اور دوسری چیز انسانی دستبرد اور

داخلت سے محفوظ نہ رہ سکی۔ان صحیفوں کے اسلوب بیان مضامین کی اہمیت کے درجات اور مرکز میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے دونوں کا انداز بالکل جدا ہے ایک میں وحی کی تاثیر کتاب آلہی کی اہمیت کی شان اور وحی کے انوار نظر آتے ہیں اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ ان واقعات کا موضوع تاریخ نہیں ہو بلکہ ہدایت اور عبرت و موعظت ہے، اس میں سنین نہیں ہیں اس میں اعداد نہیں۔اشخاص کی تعداد اور ہر قسم کی وہ تفصیلات جن کا تعلق تاریخ اور انساب سے ہو اس میں نہایت مناسبت اور حسن کے ساتھ محذوف ہیں۔واقعات کے سلسلہ کی وہی کڑیاں منتخب کی گئی ہیں جو ہر زمانے میں انسانوں کے لئے ہدایت اور عبرت کا سبق بن سکیں۔

سورۂ یوسفؑ کے آخر میں خدا فرماتا ہی۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (یوسف ۱۲)

انبیاء کے اور امم سابقہ کے واقعات میں دعوت وتبلیغ کی یہی روح اور کلام آلہی کی یہی شان ملے گی کلام آلہی کی یہی خصوصیت اور اسی کے اعجاز کی ایک دلیل ہو پیغمبر خود اس خصوصیت کا حامل ہوتا ہو۔وہ تمام غیر متعلق مباحث اور دور دراز کا تاریخی تفصیلات سے دامن بچاتا ہو اور انہیں چیزوں کا ذکر کرتا ہو جو انسانوں کی نجات اور ہدایت کے لئے مفید ہیں فرعون نے حضرت موسیٰ کو ایک تاریخی بحث میں الجھانا چاہا لیکن انھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس بحث کا دروازہ بند کر دیا اور اپنی دعوت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، فرعون نے کہا تھا فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ حضرت موسیٰ نے فرمایا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى اس کے مقابل میں تورات میں سلاطین تواریخ اور کتاب پیدائش کا مطالعہ کیجئے، ان پر تاریخیت کا رنگ غالب ہو کثرت سے سنین ہیں، اشخاص و قبائل کی گنتیاں ہیں اور عمارتوں کی مفصل تشریح، اس میں بھی کہیں کہیں وحی کی روشنی نظر آتی ہو اور انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ خدا کے کلام کا ترجمہ ہو سکتا ہو۔

ہم تورات و قرآن کا فرق سمجھانے کے لئے مثال کے طور پر حضرت یوسف کا قصہ انتخاب کرتے ہیں جو قرآن اور تورات

میں کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔

توراۃ میں واقعہ کے بہت سے اجزا قرآن سے زائد ہیں لیکن عموماً یہ وہ اجزا ہیں جن میں ناموں کی تعیین ہو اور تاریخی تفصیلات ہیں (دیکھو باب ۳۹) میں بیہودہ کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ جس کو پڑھکر تہذیب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، وہ حضرت یعقوبؑ کے گھرانے کے کسی طرح شایان شان نہیں بعض ایسی چیزیں مذکور ہیں جو حضرت یوسفؑ کی شان نبوت کے منافی ہیں (۳۹)

قرآن مجید میں اس واقعات کے بعض ایسے اہم اجزا مذکور ہیں جو توراۃ میں بالکل محذوف ہیں۔

(۱) تعبیر خواب کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ کا دل پذیر اور دل نشیں توحید کا وعظ جو حکیمانہ تبلیغ و دعوت اور پیغمبرانہ حکمت و موعظت کا بہترین نمونہ ہو اور جس میں حضرت یوسف کا اجمال پوری طرح عیاں ہو توراۃ میں مطلقاً مذکور نہیں ہے (سورۂ یوسف ع۴)

قرآن کہتا ہو کہ شاہ مصر نے جب خواب دیکھا اور حضرت یوسفؑ کی بتلائی ہوئی تعبیر سنی تو اس کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا، اور اس نے آپ کو لانے کے لئے قاصد بھیجا آپ نے اس موقع پر جیل خانے سے نکلنے میں عجلت نہیں کی بلکہ یہ ضروری سمجھا کہ آپ کے رہا ہونے سے پہلے اس واقعہ کی تحقیق کر لی جائے جس کے غلط الزام میں آپ کو جیلخانہ میں رہنا پڑا تھا تاکہ جس طرح اس الزام کی شہرت ہوئی ہے اس بے گناہی اور پاکدامنی کی بھی شہرت ہو جائے اور آپ کی رہائی محض بادشاہ کا کرم نہ سمجھا جائے بلکہ آپ کی برأت اور صفائی کا نتیجہ، یہ واقعہ حضرت یوسفؑ کی شان نبوت آپ کی خاندانی غیرت وخودداری اور آپ کے فہم و فراست کے عین مناسب ہو لیکن یہ پورا واقعہ توراۃ میں مذکور نہیں، توراۃ میں یہ عبارت ہو،

یہ بات فرعون کی نگاہ میں اور اس کے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا یہ مرد ہو کہ جس میں خدا کی روح ہو پا سکتے ہیں؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں بینائی دی ہو سو کوئی تجھ سا عاقل اور دانشمند نہیں ہو۔ تو میرے گھر کا مختار رہو اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگ

تر رہوں گا (کتاب پیدائش ۳۰ تا ۴۰)

(۲) قرآن کہتا ہے

فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ
إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ (یوسف)

اور جب خود مدعیہ نے جس کے الزام پر آپ جیلخانے گئے تھے، اپنی زبان سے آپ کی برأت کا اعلان کیا تو آپ نے اس تاخیر کا اور اس تحقیق کے مطالبہ کا سبب بتلایا۔

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ

پھر خودی کے شبہ کو دور کرنے کے لئے آپ نے پیغمبرانہ انابت کے ساتھ فرمایا۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (یوسف)

یہ صاف نبوت کا کلام ہوتا ہے اور اس میں حضرت یوسف کی سیرت اور کردار کا جلوہ صاف نظر آتا ہے تورات سے یہ اہم اور موثر حصہ بالکل حذف ہے۔

(۳) حضرت یعقوبؑ کی گفتگو میں جو تورات میں منقول ہے نبوت کی جھلک اور للہیت کا وہ نور نہیں ہے جو قرآن میں نظر آتا ہے تورات کتاب پیدائش اور قرآن سورہ یوسف کا مقابلہ کر کے دیکھئے قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ متوکل علی اللہ بزرگ ہیں ہر واقعہ میں ان کو خدا کی قدرت کا ہاتھ نظر آتا ہے بات بات پر وہ اللہ کا نام لیتے ہیں اور اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں لیکن تورات میں وہ ایک دردمند صاحب اولاد اور ایک سن رسیدہ تجربہ کار کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور بنیامین کے رہ جانے کے بعد بھائیوں کا حضرت یعقوبؑ کے پاس واپس جانا اور حضرت یعقوبؑ کی دردمندانہ اور پرسوز گفتگو جس میں متوکلانہ شان بھی جھلکتی ہے تورات سے بالکل حذف ہے (دیکھو کتاب پیدائش ب ۴۲، ۴۵)

(۴) قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے چھوٹے ہوئے باپ اور بچھڑے ہوئے بھائیوں سے مصر میں ملے

تو ان کا دل شکریہ اور خدا کی حمد سے لبریز ہو گیا شہنشاہی کی آرائشوں میں ان کی خاندانی دینداری و نبوت کی روشنی چمکی اور بادشاہت کی سرفرازی میں بندگی کا عجز نمایاں ہوا اور انھوں نے خدا کا شکر اس طرح ادا کیا اور اس سے اس طرح دعا کی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف)

یہ تو تر منظر اور مکالمہ بھی توراۃ سے محذوف ہے (دیکھو کتاب پیدائش باب ۴۲ و ۴۴)

قرآن مجید اور توراۃ کے درمیان ایک بڑا عظیم الشان فرق یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی سیرت بالکل بے داغ اور ایسی پاکیزہ پیش کی ہے جو ان کے منصب و مقام کے بالکل مطابق ہے، بلکہ اس نے ان تمام الزامات اور تہمتوں کی تردید کی ہے جو ان کے دشمنوں یا نادان دوستوں میں مشہور تھیں، لیکن عہد عتیق کے صحیفوں میں ان انبیا کے متعلق ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کو پڑھ کر تہذیب کی آنکھیں جھک جاتی ہیں، اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ان پر کہیں کفر کے الزامات لگائے گئے اور کہیں فسق کے، کتاب پیدائش کے باب ۹ میں حضرت نوحؑ کے متعلق کتاب پیدائش کے (باب ۱۹) میں حضرت لوطؑ کے متعلق کتاب خروج کے (باب ۳۲) میں حضرت ہارونؑ کے متعلق اور حضرت سلیمانؑ کے متعلق کتاب سلاطین کے (باب ۱۱) میں صاف صاف کفر و شرک اور فسق و فجور کی شہادتیں موجود ہیں۔

لیکن قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کو رسول امین کہا گیا ہے (سورۂ شعرا)، اور ان پر سلامتی اور برکات بھیجے گئے (ہود ۴)، حضرت لوطؑ کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

وَلُوْطًا اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْقَرْیَۃِ الَّتِیْ کَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ

وَاَدْخَلْنَا فِیْ رَحْمَتِنَا اَخَاہُ ھَارُوْنَ نَبِیًّا (مریم ۴۶)

توراۃ میں حضرت ہارون پر گوسالہ پرستی کا جو صاف صاف الزام لگایا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"بنی اسرائیل کے کہنے سے موسیٰ کی غیبت میں ہارون نے زیور کا ایک بت بنایا اور تمام بنی اسرائیل سے اس کو پجوایا اور

اس کے لئے قربانیاں گذارنے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے جو تمھیں مصر کی زمین سے نکال لایا ہے"

قرآن اس کی صاف تردید کرتا ہے اور اس کے بالکل برعکس ان کی دعوت توحید کا ذکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ

وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰہٰ ۵۶)

حضرت سلیمان کے متعلق توراۃ کے الفاظ یہ ہیں۔

کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا،

اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا تھا سو سلیمان صیدانیوں کی

بیوی اساراۃ اور بنی عمون کے نفرتی ملکوم کی پیروی کی اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے

خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی الخ

آگے چل کر کہا گیا ہے

سو از بس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دوبارہ دکھائی دیا برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر

غضب ناک ہوا کہ اس نے اس کو حکم دیا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد

نہ کیا الخ

سورہ ص میں ان کے اخلاص و عبدیت کاملہ اور ان کے قرب اور وجاہت کو بیان کیا گیا،

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝

آگے چل کر فرماتا ہے

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ (ص ۴۰)

اسی طرح حضرت مسیح اور ان کی والدہ پر یہودیوں نے جو کچھ الزامات لگائے تھے اور ان کی طرف جن باتوں کی

نسبت کرتے تھے قرآن مجید نے ان کی صاف صاف تردید کی ہے اور حضرت مسیح کو خدا کے ایک مکرم اور وجیہ اور مبارک پیغمبر کی

حیثیت سے پیش کیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران سورۂ مائدہ سورۂ مریم اور زخرف)

ان مضامین میں جو قرآن اور صحف سابقہ کے درمیان مشترک ہیں قرآن مجید اور ان صحیفوں کے درمیان جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور جن کے متعلق ان کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ محفوظ ہیں یہ اصولی فرق ہے! تو وہ مضامین اور تعلیمات جن میں قرآن منفرد ہے اس کے علاوہ ہیں اس کے بعد یہ کہنا کہ قرآن مجید ان قدیم معلومات میں صحف سابقہ کا خوشہ چیں ہے قرآن مجید نیز اپنی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے قرآن مجید کے مضامین براہ راست علم الٰہی سے ماخوذ ہیں اور ان کی اطلاع کا سرچشمہ وحی آسمانی ہے اس لئے وہ حقیقت کے بالکل مطابق بے داغ اور بے عیب ہر قسم کے شک و اشتباہ سے پاک ہے وہ صحف سابقہ کی انسانی تحریفات اور یہودیوں کی انبیاء مقدسین کے متعلق ہر قسم کی غلط بیانیوں اور بہتان تراشیوں کی تردید کرنے والا اور ان کتابوں کا مصدق و مہیمن ہے۔

قرآن مجید کے اعجاز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے اخلاقی عقائد اور خیالات کو جن سے عام آدمی واقف نہیں ہیں بڑی صحت اور پختگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کے مختلف مذہبی خیالات و اختلافات کے سلسلے میں بڑی نازک باریک باتوں کا خیال رکھا ہے قرآن نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ان کے جو عقائد و اختلافات بیان کئے ہیں ان کے مذہبی لٹریچر کے وسیع اور گہرے مطالعہ سے اس کے لفظ لفظ کی تصدیق ہوتی ہے جس قدر ان مذاہب کی گہری واقفیت اور ان کی کتابوں کا (جواب کثرت سے شائع ہوتی جا رہی ہیں) گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے قرآن کے بیانات کی تصدیق ہوتی جاتی ہے اور عجیب عجیب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا ان کے بارے میں کوئی لفظ ضائع و بیکار نہیں اور اس کے الفاظ و تعبیر کا کوئی فرق بے محل نہیں۔

اسی طرح اشخاص و واقعات کے سلسلے میں قرآن نے جن چیزوں پر زور دیا یا جن چیزوں کی نفی کی ہے وہ اس وجہ سے کہ یہودی و عیسائی ان چیزوں کو نہیں مانتے تھے اور ان کے بعض الزامات و روایات کی تردید مقصود ہے۔

یہ تمام دقیق باتیں اور یہ معجزانہ پہلو کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی، جس کو یہودیوں اور عیسائیوں کے اندرونی اور گہرے واقعات و خیالات کا پورا علم نہیں تھا۔ یہ عالم الغیب کا صحیفہ ہے جس میں کوئی شک و اشتباہ اور اس کے علم میں

کوئی نقصان نہیں۔

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ
حَكِيمٍ حَمِيدٍ (حم السجدہ ۴۲)

گذارش

جن حضرات کا چندہ خریداری ختم ہو چکا ہے، ان سے استدعا ہے کہ وہ نئے سال کے لئے چندہ بذریعہ منی آڈر روانہ فرما کر مشکور فرمائیں۔ وی پی بھیجنے پر اُن کا ۸ر کا نقصان ہوگا۔

"مینیجر"

روسو کا نظریۂ تعلیم

ماسٹر محمد سمیع صاحب ایم اے بی ٹی صدر شعبۂ انگریزی دارالعلوم ندوۃ العلماء

اٹھارھویں صدی عیسوی یورپ کے لئے وہ زمانہ ہے جبکہ ہر شعبہ زندگی میں انقلاب عظیم برپا ہوا، پایۂ سلطنت میں زوال آیا، شخصی حکومت کا خاتمہ انقلاب فرانس کی شکل میں ظاہر ہوا، صنعتی زندگی کو عروج اور جمہوریت کے اصول عام ہوئے، ول گئیں۔ اور ہیوم نے انگلستان میں اور والٹیر نے فرانس میں عقلیات پر مقالے اور کتابیں لکھیں۔ دماغی قوی کی آبیاری ضرور ہوئی، فکر میں آزادی اور کائنات کا مطالعہ آزادانہ ہونے لگا۔ مگر نظام تعلیم پرانی وضع پر قائم تھا، روسو نے اسکی طرف توجہ کی اور جمہوریت کے نقارہ پر یورپ کے جگانے کے لئے پہلی چوٹ لگائی۔ تعلیم کو فطرت انسانی کے ہمدوش چلنے پر ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ آج کی صحبت میں روسو کے نظریے پیش کئے جاتے ہیں۔

روسو ۱۷۱۲ء سے ۱۷۷۸ء (ROUSSEAU) جنیوا میں پیدا ہوا جو سوئٹزرلینڈ میں ایک جھیل کے کنارہ واقع ہے اور مشہور سیرگاہ ہے۔ یہ ایک گھڑی ساز کا بیٹا تھا، ماں ایک کلیسا کے پادری کی بیٹی تھی، ماں پیدائش کے وقت ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ خالہ نے پرورش اور تربیت کی۔ روسو ایک آزاد منش انسان تھا جذبات اور تخیل کی دنیا میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے پلوٹارک (PLUTARCH) کی سوانح حیات اور دیگر تاریخوں کا مطالعہ کیا جو اسکے کیرکٹر کی تشکیل میں معین ہوئیں۔ اور اس میں بطولیت کا احساس پیدا کیا جس کو وہ خود یوں تعبیر کرتا ہے: "وہ جمہوری جذبہ اور آزادی کی وہ پرغرور اور ناقابل شکست طبیعت جس نے مجھے ہر رکاوٹ اور مانع کے ڈھانے کے لئے اکسایا" اسکی افتاد طبیعت نے جس پر اسے خود قابو نہ تھا، اسے انقلابی قالب میں ڈھالا اور سوسائٹی کے نظام کے خلاف جو رائج تھا جہاد پر آمادہ کیا۔

وہ ایسے ماحول میں پلا تھا کہ اسے فطرت سے محبت تھی وہ خیال کرتا تھا کہ بندش اور سخت گیری سے انسانی احساسات اور جذبات کے ساتھ جو کام لیا گیا ہے حقیقتاً یہ فطرت سے بعد اور بنی نوع انسان کے اندر فساد کا باعث ہوا ہے۔

بچپن میں وہ مدرسہ میں داخل کیا گیا چند سے تعلیم حاصل کی طبیعت کی آزادی نے قیود کو توڑ ڈالا اس نے آوارہ گردی اختیار کی صحبت بھی اچھے لوگوں کی نہ ملی۔ ذلیل کاموں میں مبتلا ہوا، پھر جینوا واپس ہوا اور بیکاری کیساتھ جذباتی عالم میں بسر کرتا رہا۔ انیس سال کی عمر میں سوائے (SAVOY) کے مقام پر میڈیم ڈی ویرنس کیساتھ اقامت اختیار کی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھتا تھا لیکن فطرت کے ساتھ عشق رکھتا تھا اس آوارہ گردی نے اثر یہ ڈالا کہ اسے مظلوموں کے طبقوں سے ہمدردی پیدا ہوگئی جس کا احساس اس وقت عام طریقہ پر پیدا ہو چلا تھا لیکن کسی اقدام کا محتاج تھا۔

استبدادی شہنشاہیت کا دور دورہ تھا لیکن نظام حکومت برائے نام بادشاہ کے زیر نگیں ہوتا تھا بلکہ خود غرض درباریوں کی دوادوش اور سازشوں کا نتیجہ ہوتا تھا۔ کسان ٹیکسوں سے تباہ حال اور جائز حقوق سے محروم تھے۔ عیش پرست طبقہ کی نازبرداری اور ان کے لئے سامان تعیش کی بہم رسانی ان کا کام تھا۔ قدرت نے روسو کو منتخب کیا کہ سوئے ہوئے جذبہ کو جگائے، انقلاب کا نعرہ بلند کرے۔ اور عوام کی دبی چنگاری کو شعلہ کی طرح بھڑکا دے اسکے لئے اس نے اپنی تصنیفات سے کام لیا۔ اس کے مقالات سوشل کنٹریکٹ (SOCIAL CONTRACT) اور ایمیل (EMILE) منظر عام پر آئے۔ (THE PROGRESS SEIENCES AND ARTS)

لکھکر ۱۷۵۰ء میں اس نے ایک مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تین سال بعد (INEQUSLITY) لکھی جس میں دکھایا کہ غیر مساویانہ حالت تمدن کے آنے سے پیدا ہوئی۔ اور طبقات انسانی نے انسانیت سوز رنگ اختیار کیا، ذاتی انفرادی میراث کا قانون جاری ہوا۔ عمرانی زندگی کے ابتدائی مدارج میں شکل سے وراثت کی مثال ملتی ہے۔ وہ اُس اول شخص کے متعلق جس نے ایک قطعہ آراضی پر قبضہ کیا اور کہا کہ "یہ میرا ہے" کہتا ہے

"اس غاصب سے ہوشیار ہو اس کی آواز پر کان نہ دو اگر تم نے یہ بھلا دیا کہ زمین کسی کی ملک نہیں۔ اور اس کے پھل عام استعمال کے لئے ہیں تو تباہی کے سوا کچھ نہیں"

۱۷۶۲ء تک اس کے اور تصانیف شائع ہوئیں، ایمیل (THE EMILE) اس زمانے کے

غیر فطری طرز تعلیم کے خلاف اعتراض ہے۔ وہ فطری طریقہ تعلیم پر زور دیتا ہے۔ ساتھ ہی واضح کرتا ہے کہ صحیح تعلیم تمدن کی خرابیوں کو دور کر سکتی ہے اور انسان کو فطرت کے قریب تر لا سکتی ہے۔ رسمی اور تقلیدی تعلیم کو برا سمجھتا ہے، ذہنی تربیت بھی روایت و تدبر پر مبنی تھی اس کے بجائے اس نے فطری اصول کو اہمیت دی۔ ایمیل کی تعلیم اور تربیت نمونتاً پیش کرتا ہے،

بچپن کے متعلق کہتا ہے۔ فطرت کے کارفرما کی طرف سے ہر چیز مناسب اور اچھی ملتی ہے۔ انسان کے ہاتھ میں پڑ کر کم مایہ اور خراب ہوجاتی ہے۔ تین قسم کے استاد ہوتے ہیں (۱) فطرت (۲) انسان (۳) اشیا۔ تعلیم فطرت پر مبنی ہونی چاہئے شہری حقوق اور وراثت کے لئے نہیں بلکہ ایسی نوجوانی کی نشو و نما ہو جو حیات انسانی کے فرائض کو انجام دے سکے اس کا قول ہے" اگر عادات بچے میں پیدا کرانے ہیں تو کوشش یہ ہو کہ کوئی عادت نہ اختیار کرے " ایمیل کی تعلیم کیلئے وہ بچپن میں محض جسمانی تعلیم پر انحصار رکھتا ہے۔ اس کے فطری ابعاد کو برائی کی آلودگی سے پاک رکھتا ہے اور ذہن کو غلطیوں سے دور رکھ

لڑکپن۔ پانچ سے بارہ سال کی عمر تک وہ کوئی اخلاقی تعلیم نہیں دیتا بلکہ افعال کے نتائج سے علم میں اضافہ کرنا پسند کرتا ہے اس عمر میں دماغی تعلیم پر جسمانی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے مثلاً سردی اور گرمی کی برداشت، بارہ سے پندرہ سال کی عمر کے لئے مفید مطالعہ کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ بھی کتاب کے ذریعہ نہیں۔ اگر کوئی کتاب تجویز کرتا ہے تو وہ رابن سن کروسو (ROBINSON CRUSOE) ہے۔ وہ تمام نصابی کتب کو ترک کرتا ہے صرف نیچرل سائنس کو تعلیم کیلئے ضروری سمجھتا ہے۔ کتابی علم نہیں بلکہ اس کو دریافت کرنے پر زور دیتا ہے۔

نوجوانی۔ پندرہ کے بعد جبکہ لڑکے کو اخلاقی اور مذہبی پیکر بنتا ہے اسے تعلیم عملی دیجائے یعنی مفلسوں کی تباہ حالی کا مطالعہ قصص کا استعمال اور کائنات کے پس منظر سے ایک خدا کا یقین پیدا کرنا چاہئے اب تک تعلیم کا مقصد نفس کی ترقی اور اس کا فائدہ تھا۔ اب معاشرتی تعلقات کی بھی تربیت ہونی چاہئے۔ اور ایک دوسرے سے محبت، اخلاق اور مذہب کے اصول پر چلانا چاہئے۔

اپنے ہیرو ایمیل کو اب نوجوان پاتا ہے۔ اس کے لئے رفیقۂ حیات جو اعلیٰ تربیت یافتہ ہو تلاش کرتا ہے تعلیم نسواں کے بارہ میں انفرادی تعلیم کے اصول سے انحراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عورت کی تعلیم صرف مرد کی خاطر ہونی چاہئے

جسمانی تربیت ہو تاکہ حسن ظاہری اور تناسب اعضا پیدا ہو اور نسل انسانی میں اچھے قویٰ کے بچے پیدا ہوں۔ اس کے سوا نہ کوئی تعلیم ضروری نہیں۔

روسو کی یہ تصنیف سیاسی اور کلیسائی پیشواؤں کے نزدیک ایک جرم قرار دی گئی اور اس نے موت تک جلاوطنی کی زندگی بسر کی۔ لیکن اس نے تعلیمی نظریات اور عملیات میں انقلاب عظیم پیدا کیا۔ تعلیمی نظام، طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کو بدلنا پڑا۔ اور تمام تقلیدی رسمی اور غیر فطری نظام جو مدارس میں جاری تھے ختم ہو گئے اور انسان کی فطرت پر سادہ نظام بنا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ تعلیم یورپ تعمیر انسانی سے وابستہ ہوئی۔ آج جو نظریہ تعلیم کا قائم ہے کہ دستی، عمرانی اور صنعتی تعلیم دی جائے اس کے لئے تصنیف ایمیل خشت اول بنی۔ طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کا بنیادی اصول بچے کو آزاد کرنا ٹھہرایا۔ اور جو بھی عمل اور تعلیم بہم پہنچائی جائے بچہ کی ترقی کے مدارج کا لحاظ رکھا جائے۔ اسے آزادی اس کے نفسیاتی ترقی کے مدارج کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ بچہ کو بچہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس میں اور نوجوان کی تعلیم فرق اگر تھا بھی تو زیادتی اور کمی کا۔ ان کے فکری احساساتی اور عملی زندگی کے لئے کوئی معیار نہ تھا۔ ایمیل کی تعلیم ہی نے پیش کیا کہ فطرت اور ماحول فطرت ہی انسانی غلط روی کو صحیح بنا سکتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں نے طبیعیات کا نصاب میں داخل کیا۔ نباتاتی اور حیوانی زندگی کے لئے ڈپارٹمنٹ کھولے گئے اور مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ انگلینڈ میں کوئی خاص اثر نہیں پڑا البتہ امریکہ میں پبلک ہائی اسکول کی بنیاد پڑی۔ اس اصول پر عملی تعلیم جرمنی میں شروع ہوا کا نظریہ تجربی تھا۔ چودھویں صدی عیسوی سے نشاۃ ثانیہ۔ اصلاحی۔ مذہبی اور ذہنی تغیرات یکے بعد دیگرے ان پر رونما ہوتے چلے آئے تھے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں۔ روسو کے نظریہ نے ان پر ضرب کاری لگائی۔ ارتقائی انقلابی شکل اختیار کر لی اور ایک نیا راستہ تعمیر نو کے لئے اختیار کیا گیا۔ روسو کے افکار کے بہترین نتائج پسٹالوزی اور [redacted] کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہونچے۔ روسو نے اٹھارہویں صدی کے استبدادی شخصی حکومت کی عمارت کے اختیارات خصوصی پر ضرب کاری لگائی اور منافقت اور فریب کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی لیکن اس کی عمارت کا اٹھانا پسٹالوزی کے ہاتھ پورا ہوا۔ (باقی)

حالات ندوہ

از عبد الحلیم گورکھپوری متعلم دار العلوم

اس مہینے میں متعدد بزرگوں اور دوستوں نے پذیرائی کا شرف بخشا، ان میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا عبد السلام صاحب ندوی، خواجہ عبد الوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان، مولانا رئیس احمد صاحب جعفری مدیر ہندوستان بمبئی، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ خواجہ عبد الوحید صاحب نے ایک مقالہ فرد و ملت کے تعلقات کا قرآنی تصور کے عنوان سے انجمن الاصلاح میں پڑھا، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اس اجتماع کی صدارت فرمائی۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے "اسلام کی تبلیغ واشاعت کی ضرورت پر" اپنے خیالات پیش کئے۔

اس موقع پر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے طلبائے دار العلوم کو مخاطب کرکے ایک پُراثر و دلنشین دلولہ آفریں اور وجد انگیز تقریر فرمائی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

"آپ اسلئے نہیں تعلیم حاصل کر رہے ہیں کہ اس تعلیم کے بعد کوئی بڑی ملازمت یا کوئی اہم منصب حاصل کرسکیں گے، درحقیقت جو مسلمان اس پُرآشوب زمانہ میں اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لئے بھیجتے ہیں، وہ دین کی خدمت کے لئے ایک نذر پیش کرتے ہیں، بس ان کے بچوں کا فرض ہو کر وہ اپنے والدین کی نذر اسی طرح پوری کریں جیسے حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے والد حضرت ابراہیمؑ کی نذر پوری کی تھی۔

آپنے فرمایا کہ اس تعلیم کے ذریعہ آپ دُنیاوی حکومت میں تو کوئی بڑا منصب نہ حاصل کرسکیں گے لیکن دلوں پر حکومت کرنے کیلئے آپ راہیں کھلی پائیں گے اور حقیقی بادشاہ وہی ہو جو دلوں پر حکومت کرے، اس سلسلہ میں آپنے حضرت عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پُراثر واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک بار کسی شہر سے گزر رہے تھے اتفاقاً

ہارون الرشید بھی وہاں موجود تھا، لوگ عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف پروانوں کی طرح ٹوٹ رہے تھے، یہ منظر دیکھکر ہارون الرشید کی لونڈی نے کہا کہ اصلی بادشاہت یہ ہے۔

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کئی برس کے بعد دارالعلوم تشریف لائے تھے، آپنے انجمن الاصلاح میں ایک بڑا ازمعلومات مقالہ جس کا عنوان ہے "انشاپردازی کے اصول" پڑھا، آپنے الاصلاح اور دیگر طلباء سے متعلق شعبوں کا معائنہ فرمایا۔

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور محتاج تعارف نہیں، اسلامی علوم و فنون کی تحقیق اس ادارہ کا مقصد ہے ابھی دارالمصنفین اور ندوہ کے طلبائے قدیم کی دعوت پر اسکا اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا ہے، ابتدائی مشورہ کی غرض سے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی دعوت پر شہر کے سرآوردہ ذی اثر و علم دوست اصحاب ۱۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم میں مجتمع ہوئے، غور و بحث کے بعد مجلس استقبالیہ کی تشکیل ہوئی، مجلس کے سکریٹری جناب حکیم شمس الدین صاحب اور ورکنگ سکریٹری مولانا محمد عمران خاں صاحب مہتمم دارالعلوم منتخب ہوئے، صدارت کا مسئلہ ابھی زیر غور ہے عنقریب مجلس استقبالیہ کا دوسرا اجتماع پھر ہوگا۔ اسوقت صدارت کا مسئلہ آخری طور پر طے پا جائیگا۔ ادارہ کا اصل اجلاس ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۲ء کو دارالعلوم کی عمارت میں منعقد ہوگا، جلسۂ عام کی صدارت کے لئے لاہور کے مرکزی دفتر اور مجلس استقبالیہ کے مشورہ کے بعد کوئی نام منتخب کیا جائے گا۔

طلبائے دارالعلوم کی انجمن الاصلاح کا ذکر ان صفحات میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے، ابھی حال میں نئے سال کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا، ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) صدر۔ مرزا صدرالدین (۲) ناظم۔ ابوالعرفان (نائب ناظم) بدرالحق (۳) مددگار ناظم ضیاء اللہ محاسب۔ عبدالحفیظ قدوائی۔ معتمد مالیات۔ عبداللہ پھلواروی معتمد صحافت۔ وحید الرحمٰن معتمد خطابت مجیب اللہ معتمد بزم ادب۔ سراج الحسن معتمد دارالکتب کلاں۔ احمد خالد معتمد دارالکتب خورد۔ اسمٰعیل راندیری معتمد دارالاخبار محمد یوسف